مفکر اسلام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

تالیف:

مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب

شیخ الحدیث وقائم مقام مہتمم

جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

وخلیفہ مجاز: عارف باللہ حضرت مولانا

شاہ حکیم محمد اختر صاحب مدظلھم

Mob`ile: **09412866177**

○ اشاعت کی عام اجازت ہے۔

تفصیلات

نام کتاب : مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

تالیف : مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

طبع اول : جولائی ۲۰۴۰ء

کمپوزنگ : محمد اسجد قاسمی مظفرنگری

صفحات :

قیمت :

ملنے کے پتے:

- جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد یوپی
- مکتبہ فدائے ملت مفتی ٹولہ مرادآباد
- کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
- مکتبہ الفرقان لکھنؤ
- اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی
- مرکز دعوت وارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی یوپی
- مولانا عبدالسلام خان قاسمی 179 کتاب مارکیٹ، وزیر بلڈنگ، بھنڈی بازار ممبئی

○

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآنِ مجید، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دینی ودیگر علمی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح واصلاح کے لئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے، اور طباعت سے قبل کوشش کی جاتی ہے کہ نشان دہی کی جانے والی جملہ غلطیوں کی بروقت تصحیح کردی جائے، اس کے باوجود غلطیوں کا امکان باقی رہتا ہے۔

لہٰذا قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ علمی غلطیوں کی نشان دہی کریں؛ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہوسکے، نیکی کے اس کام میں تعاون کرنا صدقۂ جاریہ کے مترادف ہے۔

(ادارہ)

هَيْهَاتَ لَا يَأْتِيْ الزَّمَانُ بِمِثْلِهٖ
إِنَّ الزَّمَانَ بِمِثْلِهٖ لَبَخِيْلٌ

●

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

●

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

○❖○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○
ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○
فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ○
وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○

(الفجر)

ترجمہ:

اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار (کے جوارِ رحمت) کی طرف چل
اس طرح سے کہ تو اُس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش
پھر (ادھر چل کر) تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا
اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

انتساب

اپنے والد ماجد مخدوم گرامی حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب دامت برکاتہم — بانی وصدر دارالعلوم الاسلامیہ بستی - ومہتمم جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد — کے نام کہ اس کتاب کی تکمیل ان کی تشجیع وتحریک کا ثمرہ ہے۔

محمد اسجد قاسمی ندوی

پیش لفظ

از: حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی زید مجدہم

مدیر ''البعث الاسلامی''، ومہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد للّٰہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد :

پیش نظر کتاب، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی باکمال شخصیت کے چند پہلوؤں پر مشتمل ہے، اس کتاب کو بڑی خوبی کے ساتھ عزیز گرامی مولانا محمد اسجد بستوی ندوی استاذ دارالعلوم الاسلامیہ بستی نے مرتب کیا ہے اور حضرت مولاناؒ کی پہلو دار اور جامع کمالات زندگی کے نمایاں اوصاف کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

اس زمانے میں جب کہ ہمارے نوجوانوں میں اپنی شخصیت بنانے اور مستقبل کی تعمیر کے سلسلہ میں کوئی حوصلہ افزا پیش رفت نہیں ہورہی ہے، حضرت مولاناؒ کی زندگی کو ایک بہترین نمونے کی حیثیت سے پیش کرنا اور ان عوامل ومحرکات کو مہمیز دینا جو حضرت کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخ میں ان کا ایک خاص مقام ہوتا ہے، ایک اہم ترین ذمہ داری ہے۔

حضرت مولاناؒ کی تربیت وتوجہ سے بے شمار نوجوانوں کو صحیح سمت ملی اور ان کو بامقصد زندگی گذارنے کا فن معلوم ہوا، اور نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا اور انہوں نے صراطِ مستقیم کو پہچانا، حضرت مولاناؒ نے تعلیم وتربیت اور دعوت وفکر اسلامی کے میدان میں ایسی نمایاں اور عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں جو نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ ساری دنیا کے لئے

مشعل راہ ہیں، ان کی تصنیفات، ان کی حکمت ودعوت، ان کی فکر اور ان کے سوچنے کا طریقہ، ان کا انداز کلام اور ان کا طرز بیان ایک عظیم داعی، مفکر اور عالم وادیب کے شایانِ شان ہے۔

حضرت مولانا کی یہی وہ امتیازی خصوصیات ہیں، جن میں ان کی مقبولیت کا راز پوشیدہ ہے، اور اس پر مستزاد اخلاص وورع اور تقویٰ ویقین، اللہ تعالیٰ سے انتہائی گہرا ربط وتعلق، عقیدۂ توحید پر استقامت، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے گہری عقیدت اور محبت وتعلق، شریعت اسلامی کا دل وجان سے احترام اور تمسک بالکتاب والسنۃ کا شدت سے التزام اور اسلامی زندگی کا زندہ نمونہ، یہ وہ نمایاں اوصاف ہیں جو آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔

اسی کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی وسعت معلومات، ان کا وسیع تر مطالعہ، عربی زبان وادب پر مکمل عبور کے ساتھ اردو فارسی اور انگریزی زبان وادب سے بھرپور واقفیت، سارے عالم میں جاری رہنے والی سیاسی، اجتماعی، علمی اور تمدنی سرگرمیوں پر گہری نظر اور تاریخ سے پوری طرح آگاہی، اور ادیان وملل کا تقابلی مطالعہ، اور ان سے صحیح نتائج کا استنباط، یہ وہ اوصاف ہیں جن میں حضرت مولاناؒ منفرد تھے اور ہم کو ان کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

مقامِ مسرت ہے کہ ہمارے عزیز مولانا محمد اسجد ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں حضرت مرحوم کی شخصیت کا ایک مرقع پیش کر دیا ہے، اور وہ اس کے لئے لائق صد مبارک باد ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول عام اور مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین۔

راقم الحروف

(حضرت مولانا) سعید الرحمٰن الاعظمی (صاحب مدظلہ)

مدیر ''البعث الاسلامی'' ندوۃ العلماء لکھنؤ

۳۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ

۳۱/ اگست ۲۰۰۰ء

قدر افزائی

حضرت مولانا انظر شاہ صاحب مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم وقف دیوبند

کس قدر فخر سے سینہ معمور ہوگا اس خوش نصیب باپ کا، جس کی اولاد اس کی زندگی میں اس کی باقیات صالحات کی اپنے دین ودانش، اپنی رزانت وفطانت اپنے علم وآگہی سے سنبھالنے، تھامنے کی صلاحیت تام پیدا کر چکی، اس معلم کی پیروزہ بختی کا کون اندازہ کرسکتا ہے جس کے قطار اندر قطار شاگردوں میں کوئی جوہر قابل استاذ کے فیضانِ علم کو تموج پذیر بنانے کی قابلیت سے سرشار ہے، کس قدر ارجمند ہے وہ مرشد جس کے مسترشدین کی صفوں میں ایسی شخصیت منظر عام پر آگئی، جو اپنے باصفا شیخ کے رشد وہدایت کے آثار کو جاوید بنانے کی مستعدی سے دولت بداماں ہے۔ سنا ہے حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے والد معظم ومؤقر مولانا معظم شاہ صاحب اپنے نامور بیٹے کے نامی گرامی شاگردوں سے خلوتوں میں ان کے جلیل استاذ کے وفور علم کی داستانیں کرید کرید کر دریافت فرماتے اور سب کچھ سن سنا کر نشۂ فخر ومسرت میں جھوم جھوم کر کہتے: ''اس باپ کی خوشی کا کیا عالم ہوگا جس کا بیٹا انور شاہ جیسا ہے''۔

پھر کیا قیل وقال کی گنجائش ہے، محترم ومکرم مولانا باقر حسین صاحب القاسمی البستوی المؤسس دار العلوم الاسلامیہ بستی کے بارے میں جن کی صالح ذریت میں چھوٹے میاں (اشارہ خاکسار مؤلف کی جانب ہے) ٹھیک اس کے مصداق ہیں، بڑے میاں بڑے میاں

(مراد برادر عزیز مولانا محمد اسعد قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم الاسلامیہ بستی ہیں) چھوٹے میاں سبحان اللہ! فرزند اکبر نے باپ کی سعادتوں میں اضافہ کیا، تو دوسرے لخت جگر باپ کی عبادتوں کی روشن علامت، کہنے دیجئے کہ مولانا باقر صاحب کی شبہائے درازا گر سجدہائے شکر سے لبریز ہوں اور دن کے ہنگامے رب منعم وذوالجلال والاکرام کی ایک ایک نعمت پر ادائیگی شکر کی توفیق سے معمور، تو بھی واقعی شکر کا حق ادا نہ ہوگا۔

ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے، حضرت مولانا علی میاں الندوی المرحوم کی تابندہ وپائندہ حیات کے ولولے تاریخ کی امانت، ان کی نگارش، ملی کارناموں کا شاندار مرقع، ان کی تصنیف دل ودماغ کے لئے پیغام، ان کی تقریر قافلوں کے لئے صدائے رحیل، اب یہ سمندر ہمیشہ کے لئے آغوشِ ساحل میں محوخواب، اب قلم کی جولانیاں امانت قرطاس، آندھی رک چکی، علم وفن کی صرصر بظاہر ہمیشہ کے لئے خاموش؛ لیکن کہاں؟ ابھی رکئے اور ٹھہریئے! سنئے اور محفوظ رکھئے! دنیا کروٹیں لے گی، گردوپیش بدلے گا بطن گیتی سے نئی زمین اور نیا آسمان رونما ہوگا، مگر ہمہ گیر الٹ پھیر کے باوجود علی میاںؒ زندہ رہیں گے، جیتی جاگتی دنیا انہیں بھلا نہ سکے گی، سانحۂ وفات پر ایک سال بھی نہیں گزرا کہ ان پر بہت لکھا جاچکا، مگر ابھی بہت سے رخ نقاب کشائی کے منتظر، عزیز محترم مولانا محمد اسجد القاسمی الندوی نے بھی ایک بھرپور مقالہ میں مرحوم کی تاب دار وآب دار زندگی کے بیشتر ابواب روشن اور منور کئے، عزیز مؤلف کا علم علوم قاسمیہ کا امین ان کا قلم ندوۃ العلماء کے امتیاز کا حامل، تحریر شگفتہ، نگارش سلیس، جو خامیاں تھیں انہیں جلیل اساتذہ نے دور کیا، جو باقی رہ گئیں انہیں عمر کی پختگی ہمیشہ کے لئے ختم کردے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

(حضرت مولانا) نظر شاہ کشمیری (صاحبؒ)
۱۴۲۱/۵/۱۱ھ

تقریظ

حضرت مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں صاحب مدظلہ العالی

استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

مفکر اسلام، داعی الی اللہ، عالم ربانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات حسرت آیات پر کئی مہینے گزر گئے، مگر اہل تعلق اور ان کے مرتبہ شناس لوگوں کے دلوں میں ان کی جدائی کا درد وغم اب بھی تازہ ہے، اور عرصۂ دراز تک تازہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو جو بے مثال محبوبیت ومقبولیت عطا کی تھی، وہ ان کے بعد بھی قائم ہے، جس کا اندازہ حضرت مولاناؒ پر مسلسل مضامین اور کتابوں کی اشاعت سے کیا جاسکتا ہے۔ **وذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔**

حضرت مولاناؒ کی شخصیت جامع کمالات، جامع الجہات اور ہشت پہل نگینے کی طرح تھی، جس کا ہر پہلو دل کش ودل آویز، روح پرور اور جانفزا ہے، ان کی عظیم شخصیت کے نمایاں پہلوؤں میں ان کا علم وفضل، عربی تقریر وتحریر، بے مثال صلاح وتقویٰ، اعتدال وتوازن، حلم وتواضع، مروت وشرافت، دینی غیرت وحمیت، ایمانی فراست وبصیرت، اور قائدانہ ومصلحانہ کردار وصلاحیت بطور خاص قابل ذکر وتحسین ہیں، جن میں سے ہر پہلو پر اہل قلم روشنی ڈال رہے ہیں، جس سے حضرت مولاناؒ کی متنوع اور کثیر الجہات شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اور ان کے افکار وخیالات، بنیادی رجحانات اور امتیازی خصوصیات سامنے آسکیں گے اور ان کے فکر وعلم کی بنیادی خطوط نمایاں ہوسکیں گے۔

اس طرح کی اچھی، تحریری وعلمی کوششوں میں عزیز گرامی مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی سلمہ اللہ کا یہ سلسلہ مضامین بھی ہے، جوانہوں نے حضرت مولاناؒ کی یاد میں اوران سے محبت وعقیدت میں ڈوب کرلکھا ہے، مگرخوشی واطمینان کی بات یہ ہے کہ عقیدت ومحبت کے جذبات کے ساتھ اس میں ان کا تحقیقی مطالعہ ومشاہدہ، حقیقت پسندی اور واقعیت دوستی بھی کارفرما ہے، اورانہوں نے حضرت مولاناؒ کے افکار وخیالات اورشخصیت وکردار کے اہم پہلوؤں اور بنیادی عناصر کوعلمی وتحقیقی انداز میں اجاگر کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔

ان مضامین میں ''حضرت مولانا کی ادبی خدمات، دعوتِ اسلامی کے میدان میں حضرت مولانا کی سرگرمیاں، مسلمانانِ ہند کے مسائل اور حضرت مولاناؒ کی سرگرمیاں، حضرت مولانا کی نظر میں عالم عربی کے مسائل، مغربی تہذیب کے سلسلہ میں حضرت مولانا کا معتدل موقف، اسلامی بیداری میں حضرت مولانا کی خدمات وخیالات'' بہت اہمیت کے حامل ہیں، اور بہت بصیرت افزا ہیں۔ مجھے امید ہے کہ فاضل مصنف کے اس مجموعۂ مضامین سے حضرت مولاناؒ کی جامع اور مفصل سوانح حیات کی تیاری میں بہت مدد ملے گی اورخود ان سے حضرت مولاناؒ کی جامع شخصیت کے بنیادی ورمرکزی عناصر نمایاں ہوجائیں گے۔

نوجوان مصنف اپنی اصابت فکر، سلامتی فہم اور موزوں ومتوازن طرز بیاں کے لئے ہرطرح لائق تحسین اور قابل مبارک باد ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں خدمت دین وعلم کی توفیق مزید بخشے۔

مخلص

(حضرت مولانا ڈاکٹر) شمس تبریز خاں (صاحب)

۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ

۷/ اگست ۲۰۰۰ء

❐❖❐

یہ کتاب

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلی اٰلہ وصحبہ اجمعین، وبعد!

زیر نظر کتاب استاذ مخدوم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی عظمت کے چند گوشوں کو اجاگر کرنے کے مقصد سے ترتیب دی گئی ہے، اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تردد نہیں کہ مولانا کی شخصیت اپنی جامعیت وہمہ جہتی کے لحاظ سے بیسویں صدی کی ممتاز ترین شخصیت ہے، میں نے اس گلستان فضل وکمال کے کچھ پھول چننے کی کوشش کی ہے، جس کی دل آویز خوشبوؤں سے ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ عالم اسلام بھی مہکتا رہا ہے۔

یہ کتاب اصلاً ایک مضمون سے شروع ہوتی ہے، میں نے مجلّہ ''فکر اسلامی'' (جو مولانا محمد اسعد قاسمی کی زیر ادارت دارالعلوم الاسلامیہ بستی سے شائع ہوتا ہے) کے ''مفکر اسلام نمبر'' کے لئے ایک مضمون ''حضرت مولانا علی میاں اور دارالعلوم دیوبند'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا، میرے بعض عزیز رفقاء خصوصاً مولانا عبدالجلیل صاحب قاسمی ندوی (ناظر مکتبہ دارالعلوم الاسلامیہ بستی) نے تحریک کی کہ مولانا کی شخصیت کے بعض اہم گوشوں پر کام کرکے اسے ایک مستقل کتاب کی شکل دے دی جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔

میرے دل نے یہ تجویز منظور کی، چناں چہ ۴؍جولائی ۲۰۰۰ء سے یہ کام شروع ہوا، اور آج ۲۶؍جولائی ۲۰۰۰ء کو تقریباً تین ہفتوں کی شب وروز کی محنت کے بعد میں اس کی تسوید وتبییض سے فارغ ہورہا ہوں، کتاب بڑے مختصر وقت میں مرتب کی گئی ہے، جس میں غلطیوں کا صدور متوقع ہوتا ہے، قارئین سے گذارش ہے کہ اگر غلطیاں محسوس کریں تو ان کی طرف اس ناچیز کو توجہ دلائیں۔

اس کتاب کی تکمیل میں مجھے اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب زید

مجد ہم بانی ومہتمم دارالعلوم الاسلامیہ بستی کی تشجیع سے بڑا حوصلہ اور ولولہ ملا۔

میری سعادت ہے کہ اس کتاب کی تصحیح واصلاح کے سلسلہ میں مجھے محترمی جناب مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں صاحب مدظلہ ریڈر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کا بے پایاں تعاون حاصل رہا ہے، میں ان حضرات کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں، ان حضرات کے علاوہ میں برادرم مولانا محمد سالم صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم الاسلامیہ بستی نیز عزیزم محمد احمد قاسمی سلمہ شریک شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند کے تعاون کا بھی شکر گزار ہوں۔

کتاب کے سلسلہ میں ایک عرض یہ بھی ہے کہ اس میں سوانح نگاری مقصود نہیں ہے؛ بلکہ صاحب سوانح کے تذکرہ کو ان کی حیات وسیرت وکردار کے بعض تاباں اور جاوداں پہلوؤں کی عکاسی اور تصویر کشی تک محدود رکھا گیا ہے، جو ان کے رتبہ بلند اور مقام عظیم کو اُجاگر کرتے ہیں، اور جن سے اہل ایمان بھی استفادہ کرکے جوش وجذبہ اور احقاقِ حق وابطالِ باطل نیز ملک وملت کی اصلاح کے ذوق وشوق سے بہرہ یاب ہوسکتے ہیں۔

دوسری عرض یہ ہے کہ عربی عبارتوں کے ترجمے عموماً خاکسار مصنف کے قلم سے ہیں، اور جو ترجمے دوسروں سے اخذ کردہ ہیں، ان کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

میں نے حسبِ مقدور یہ رعایت رکھی ہے کہ سارے اہم پہلو اس کتاب میں آجائیں، ویسے بھی حضرت مولانا کے سلسلہ میں کوئی حرفِ آخر کہنے کا دعویٰ کیا بھی نہیں جاسکتا۔

شوق گر زندۂ جاوید نباشد عجب است
کہ حدیثِ تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

محمد اسجد قاسمی ندوی
دارالعلوم الاسلامیہ بستی
۲۶/جولائی ۲۰۰۰ء

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ نے بیسویں صدی کے آغاز میں ۱۹۱۴ء ۶ محرم الحرام ۱۳۳۳ء میں تکیہ کلاں رائے بریلی کے ایک علمی واصیل خاندان میں آنکھیں کھولیں، مولانا کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالحئ سابق ناظم ندوۃ العلماء ہندوستان کے چوٹی کے اصحابِ فضل وکمال اور علماء عظام میں سے تھے، ان کی تصانیف میں ''نزہۃ الخواطر'' (الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام' آٹھ جلدوں میں بڑا قیمتی موسوعہ ہے، دیگر تصانیف میں ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند'' گل رعنا، یادِایام، تہذیب الاخلاق وغیرہ معروف ہیں، ان کا انتقال فروری ۱۹۲۳ء میں ہوا، مولانا علی میاںؒ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

مولانا علی میاںؒ کے برادر محترم جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء، دیوبند وندوہ کے فیض یافتہ پھر انگریزی وعصری تعلیم میں ماہر اور کامیاب ڈاکٹر اور نہایت بزرگ وباصلاحیت تھے، انہوں نے دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ اور وعلامہ کشمیریؒ سے استفادہ کیا تھا، مولانا علی میاںؒ کی تربیت انہوں نے ہی کی ہے، مشائخ عصر سے تعلق، دعوتی سرگرمیوں اور ادبی اشتغال میں مولانا نے انہیں کی ہدایات پر عمل کیا، انگریزی وعربی میں اُن سے باضابطہ استفادہ کیا، اپنی کتاب ''حیاتِ عبدالحئ'' میں اپنے والد ماجد کے تفصیلی تذکرہ کے بعد مولانا نے ایک باب ڈاکٹر صاحب کے تذکرہ کا بھی رکھا ہے، ڈاکٹر صاحب کا مئی ۱۹۶۱ء میں انتقال ہوا۔

مولانا کی والدہ سیدہ خیر النساء صاحبہ نہایت صالح اور مشفق خاتون تھیں، قدرت کی طرف سے انہیں اعلیٰ شعری ذوق ملا تھا، تخلص ''بہتر'' تھا، ان کی کتابیں ''ذائقہ'' اور ''حسن معاشرت'' بہت معروف ہیں، مولانا کی تربیت میں ان کا بڑا اہم رول رہا ہے، مولانا کی

نمازوں کی پابندی، تلاوتِ قرآن کے شغف، دینی علوم سے تعلق خاطر اور انگریزی میں حد سے زیادہ انہماک سے بچاؤ، تواضع وحلم، کبر ونخوت سے اجتناب اور دوسروں کی تذلیل وایذاء سے بعد میں ان ہی کی تربیت کا اثر کارفرما رہا ہے، والدہ کا انتقال اگست ۱۹۶۸ء میں ہوا۔

مولانا کی دو ہمشیرہ تھیں، ایک سیدہ امت العزیز صاحبہ (والدہ مولانا محمد ثانی حسنی ومولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ومولانا واضح رشید ندوی)

دوسری سیدہ امت اللہ تسنیم مصنفہ: ''ہمارے حضور، قصص الانبیاء، زادِ سفر'' تھیں، ان کا انتقال جنوری ۱۹۷۶ء میں ہوا۔

مولانا کی شادی ۱۹۳۴ء میں ان کی ماموں زاد بہن سیدہ طیب النساء سے ہوئی، کوئی صلبی اولاد نہیں ہوئی، ان کا انتقال دسمبر ۱۹۸۹ء میں ہوا، مولانا کے بڑے بھانجے مولانا محمد ثانی حسنی کا انتقال فروری ۱۹۸۲ء میں ہوا۔

اس سے قبل مولانا کے برادر زادۂ عزیز مولانا محمد الحسنی کا انتقال جون ۱۹۷۹ء میں ہو چکا تھا۔

مولانا کا پورا خاندان علم وفضل، ورع وتقویٰ اور زہد واستغناء کے لحاظ سے ممتاز ہے۔

مولانا علی میاںؒ کے اساتذہ وتلامذہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو علوم حاصل فرمائے وہ ماہر فن کامل اساتذۂ کرام سے حاصل فرمائے، یہی وجہ ہے کہ مولانا یکتائے روزگار ثابت ہوئے، اخلاص واختصاص دونوں اوصاف ان کی شخصیت میں یکجا جمع ہوگئے تھے، اور انہیں دونوں اوصاف کو عام کرنے اور پھیلانے اور اختیار کرنے کی دعوت مولانا نے تازندگی دی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہی دو اوصاف جنہیں کیف علم اور سوز عشق سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، انسان کو کامل بنانے کے لئے کافی ہیں، خدائے ذوالجلال نے یہ دونوں جوہر مولانا کو عطا فرما کر ان کی شخصیت کو جامعیت، کمال اور دل آویزی عطا فرمادی تھی۔

مولانا نے عربی کی اصل تعلیم مولانا خلیل عرب سے حاصل کی ہے، ان کی شخصیت کی تعمیر میں عرب صاحب کا بہت دخل ہے، عرب صاحب کی خصوصیات اور ان سے استفادہ کی تفصیلات آگے کے ابواب میں آئیں گی۔

اپنے ایک قریبی رشتہ دار مولانا عزیز الرحمٰن حسنی سے ابتدائی کتابیں نحو میر، میزان ومنشعب، صرف میر اور پنج گنج وغیرہ پڑھیں، اپنے عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب (جو اچھے فارسی داں تھے) سے فارسی کی کتابیں خصوصاً شیخ سعدی کی بوستاں پڑھی، ابتداء میں مولوی محمود علی لکھنوی سے ابتدائی کتابیں (جن میں مولانا کے والد ماجد کی تعلیم الاسلام اور نورالایمان بھی تھیں) پڑھیں اور خوش خطی سیکھی، حساب اور اردو وغیرہ کی مشق ماسٹر محمد زماں خاں صاحب سے کی، اپنے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سے انگریزی وعربی میں کافی استفادہ کیا، انگریزی تعلیم مولانا نے جناب خلیل الدین ہنسوی، اپنے ماموں جناب سید

احمد سعید صاحب، ندوۃ العلماء کے انگریزی استاذ ماسٹر محمد سمیع صدیقی (ایم اے ایل ٹی) جناب محمد فاروقی صاحب استاذ شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی وغیرہ سے حاصل کی، اور بڑی مہارت پیدا کی۔ علامہ سید سلیمان ندوی سے بھی مولانا نے ندوہ میں تدریس کے دوران فلسفۂ قدیم سے متعلق کوئی کتاب پڑھی، اور یونانی فلسفہ سے واقف ہوئے، علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی سے بھی مولانا نے بہت استفادہ دورانِ تدریس کیا، دیوانِ نابغہ پڑھا اور ادب عربی کی تدریس کے زریں اصول اخذ کئے، خواجہ عبدالحئ فاروقی (جو مشہور مفسر مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے شاگرد رشید اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کے بعد مولانا سندھی کے علمی جانشین تھے) سے مولانا نے ۱۹۲۷ء میں قرآنِ مجید کے اخیر پارے کی کچھ سورتیں پڑھیں، خواجہ صاحب مولانا کے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے دیوبند میں ہم سبق وہم مذاق رہ چکے تھے، خواجہ صاحب ہی سے مولانا نے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کا نام پہلی بار سنا تھا، مولانا کے اساتذہ میں مولانا عبدالحلیم صدیقی کا نام بھی آتا ہے، جن سے مولانا نے دیوانِ سقط الزید پڑھا۔ دارالعلوم دیوبند میں مولانا نے حضرت مدنیؒ سے حدیث، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ سے فقہ اور جناب قاری اصغر علی صاحب مرحوم سے تجوید کا درس لیا، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ حسنی سے بھی مولانا نے بہت استفادہ کیا، مولانا کی صرف ونحو کی عملی صلاحیتیں زیادہ تر انہیں کی رہین منت ہیں، مولانا نے ان سے ادب وزبان کی کتابیں بھی پڑھیں، اور انہیں کی تربیت سے سیبویہ کی ''الکتاب''، زمخشری کی ''المفصل''، ابن حاجب کی ''شافیہ'' اور اس کی شرح رضی اور سیوطی کی ''المزاہر'' کا مطالعہ بھی کیا، حضرت مولانا نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''مجھے ان کی کتابی تعلیم سے زیادہ ان کی علمی صحبتوں سے نفع پہنچا، اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میرے ذہن کی تربیت وتشکیل اور میرے ذوق ومعلومات میں جس کو ایک مفرد لفظ

''ثقافت'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، ان کا بہت بڑا حصہ ہے، ان کا ایک بڑا تعلیمی فیض یہ تھا کہ اپنی تحریر کو بار بار شک وتنقید کی نگاہ سے دیکھنے، عربی الفاظ وصلات کے صحیح استعمال کا اطمینان کرنے اور ومعاجم (کتب لغت) کی طرف بار بار مراجعت کرنے کی عادت پڑ گئی، عربی کے ایک مضمون نگار کی حیثیت سے جس کی تحریروں کے اصل مخاطب اہل عرب تھے، مجھے ان کے تشکک اور احتیاط سے بڑا فائدہ پہنچا، ان کی مجلسوں میں سلف کی عظمت، متقدمین کے مراتب سے واقفیت اور ائمہ اہل سنت ومحدثین کی محبت وعقیدت ضرور پیدا ہوجاتی تھی، اس بارے میں ذاتی طور پر مجھ پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے صحابہ وسلف کی عظمت اور ائمہ محدثین اور سنت کے علم برداروں کی محبت وعقیدت ایسی دل میں جاگزیں کردی کہ کسی دور میں بھی کوئی مطالعہ وتحقیق اور کوئی صحبت اس پر اثر انداز نہیں ہوئی''۔ (پرانے چراغ ۱/۲۳۶-۲۴۷-۲۴۸ مختصراً)

حضرت مولانا نے ان کے ساتھ متعدد اسفار کئے، لاہور میں تو ان کا قیام ہی تھا، وہاں کی مشہور شخصیات (مثلاً شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ اور علامہ اقبالؒ وغیرہ) سے مولانا کی ملاقات انہیں کے توسط سے ہوئی، مولانا اپنی تصنیفات ان کو بھیجتے، تو وہ ان کا مطالعہ کر کے اپنے تأثرات روانہ کرتے، جس میں بعض اصلاحات بھی ہوتیں، ''نزہۃ الخواطر'' کا آٹھواں حصہ مولانا کے تکملہ کے ساتھ منظر عام پر آیا، تو انہوں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے مکتوب میں اعتراف فرمایا کہ کتاب کی تکمیل کرنے والا اپنی پیوند کاری میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے، انہوں نے بارہا مولانا کو مبارک باد دی اور کہا: ''تم نے عربی زبان اور دینی علوم ہی کو مضبوطی سے پکڑا اور یک در گیر محکم گیر پر عمل کیا''۔ مولانا کا ان سے تعلق بڑا قدیم تھا جو ان کی وفات ستمبر ۱۹۷۰ء تک باقی رہا۔ ندوۃ العلماء میں طالب علمی کے دوران مولانا نے وہاں کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی سے بھی استفادہ کیا، ان سے مولانا کا ربط ۱۹۲۹ء میں شروع ہوا، جب مولانا نے ندوۃ العلماء میں باضابطہ داخلہ لیا اور صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی حرفاً حرفاً ان سے پڑھی، اس کے ساتھ ہی بیضاوی اور منطق کے اسباق بھی پڑھے، ایک عرصہ تک مولانا اپنے اس محبوب استاذ کے ساتھ ان کے کمرہ میں مقیم رہے اور

بہت قریب سے انہیں دیکھا اور استفادہ کیا۔

مولانا حیدر حسن خاں صاحب پکے حنفی عالم تھے، امام ابوحنیفہؒ سے ان کی محبت وعشق وعقیدت اور مذہب حنفی سے عقیدہ کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، امام صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے بسا اوقات ان پر رقت طاری ہوجاتی تھی؛ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ شدت سے حدیث کی ضرورت اور حجیت کے نہ صرف قائل؛ بلکہ داعی اور اتباع سنت پر عامل تھے، وہ مذہب حنفی کو اقرب الی الحدیث سمجھتے اور ثابت کرتے تھے، یہ ان کا اعتدال تھا، جو مولانا علی میاںؒ میں شدت سے منتقل ہوا، چناں چہ مولانا پکے حنفی ہونے کے ساتھ ہمیشہ وسیع الذہن رہے؛ لیکن یہ وسعت عمل بالحدیث کی ان شکلوں تک کبھی نہیں پہنچ سکی جو آج مے مدعیان عمل بالحدیث (غیر مقلدین) نے ایجاد کر رکھی ہیں۔

ندوۃ العلماء ہی میں مولانا نے مشہور فقیہ مولانا شبلی جیراج پوری سے بھی فقہ میں کچھ استفادہ کیا، شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ سے مولانا نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ مولانا نے خود تحریر فرمایا ہے:

> ''اگر مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات نہ ہوتی، تو میری زندگی اچھی بابری بہر حال موجود زندگی سے بہت مختلف ہوجاتی، اور شاید اس میں ادب وتاریخ اور تصنیف وتالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا، خداشناس اور خدارسی، راہ یابی اور راست روی تو بڑی چیزیں ہیں، مولانا کی صحبت میں کم سے کم خداطلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت اور مردانِ خدا کی محبت، اپنی کمی اور اصلاح وتکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا''۔ (پرانے چراغ ۱/۱۳۴)

مولانا احمد علی لاہوری مولانا عبیداللہ سندھی کے مایہ ناز شاگرد اور ان کے طرز تعلیم ومسلک تفسیر کے حامل وجانشین تھے، حضرت مولانا علی میاںؒ کی شیخ لاہوریؒ سے پہلی ملاقات مئی ۱۹۲۹ء میں مولانا سید محمد طلحہ حسنی کے واسطہ سے ہوئی، تعارف ہوا تو شیخ لاہوریؒ نے بڑی شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا۔ دوسرے سال ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا نے لاہور جاکر مولانا لاہوریؒ سے مستقل وقت لیا جو انہوں نے از راہِ شفقت عنایت فرمایا اور سورۃ البقرہ کا شروع کا حصہ

پڑھایا۔ ۱۹۳۱ء کے سفر میں مولانا شیخ کے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے درس میں شریک ہوئے اور خوب استفادہ کیا، اس دوران مولانا کے دل میں شیخ لاہوری سے اصلاح وتربیت کے مستقل تعلق کا جذبہ پیدا ہوا، درخواست پیش کی تو فرمایا کہ میرے شیخ ومرشد حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب حیات ہیں، میں ان کو خط لکھتا ہوں، آپ دین پور جائیں اور ان سے بیعت ہو جائیں۔ (پرانے چراغ ۱/۱۴۶)

مولانا تشریف لے گئے، بیعت ہوئے اور بہت گہرا اثر لے کر واپس ہوئے، ۱۹۳۲ء میں مولانا نے شیخ لاہوریؒ کے مدرسہ قاسم العلوم میں باقاعدہ داخل ہو کر تفسیر قرآنِ کریم کا پورا کورس مکمل کیا، رات دن محنت کی اور امتحان میں سب سے فائق رہے۔ شیخ لاہوریؒ کے درس میں عقیدۂ توحید کی وضاحت، اہل اللہ کے مؤثر ودلآویز واقعات اور جذبہ جہاد مرکزی مضامین ہوتے تھے، مولانا ان سے بے حد مستفید ومتأثر ہوئے؛ البتہ جو طرز شیخ لاہوری کا تھا مولانا کو اس سے زیادہ مناسبت نہ تھی، اس لئے مولانا نے بعد میں اپنے دروس قرآن کے سلسلہ میں اس طرز کی پیروی تو نہیں کی؛ لیکن اس کے بہت سے فوائد مولانا کو تا آخر محسوس ہوتے رہے، شیخ لاہوریؒ سے مولانا کا تعلق بڑھتا گیا، مولانا بار بار لاہور جا کر ان سے ملاقات واستفادہ کرتے رہے، خود مولانا لاہوریؒ کی شفقت ومحبت میں اضافہ ہوتا گیا، خلافت بھی عطا فرمائی، اپنے ایک مکتوب میں ۱۹۴۸ء میں تحریر فرمایا:

> ''چوں کہ آپ میرے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو، وہ میرے لئے باعث صد فخر ہے، مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہ (فرزند اکبر شیخ لاہوریؒ) کی ترقی سے فرحت ہو سکتی ہے، اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے''۔ (پرانے چراغ ۱/۱۶۱)

۱۹۵۶ء کے ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرمایا کہ:

> ''آپ کی ہر کامیابی سے جتنا دل میں سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے، غالباً دنیا میں کوئی اور نہیں، جسے اس درجہ کی راحت حاصل ہو، میرا دل آپ کی ترقی دارین کے لئے بارگاہِ الٰہی میں ملتجی ہے''۔ (پرانے چراغ ۱/۱۶۲)

علامہ سید سلیمان ندویؒ سے بھی مولانا نے استفادہ کیا ہے، سید صاحب سے مولانا کے خاندان کا تعلق وربط بہت قدیم ہے، وہ مولانا کے والد ماجد کے شاگرد اور مولانا کے برادر بزرگ کے دوست تھے، سید صاحب سے مولانا نے ندوہ میں دورانِ تدریس کافی استفادہ کیا تھا؛ لیکن ان کی خصوصی توجہ اور شفقت مولانا پر اس وقت ظاہر ہوئی جب مولانا نے سیرتِ سید احمد شہیدؒ کا کام مکمل کیا۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں سید صاحب کے سامنے یہ کتاب پیش کی اور مقدمہ لکھنے کی درخواست کی، سید صاحب نے بے حد مؤثر مقدمہ لکھا، یہ مقدمہ ان کی قیمتی تحریروں میں نمایاں مقام رکھتا ہے، جس میں دماغ کے ساتھ دل اور علم وزور انشاء کے ساتھ عشق ووجدان بھی شامل ہے۔ مقدمہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

''مصنف نے یہ کتاب بڑی دقت سے لکھی ہے اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں رشد وہدایت اور عزم وہمت کا ایک صحیفہ دے دیا ہے، کیا عجب ہے کہ مسلمان اس تاریخی موقعہ پر اس کتاب سے اصلاح وہمت کا فائدہ اٹھائیں اور اپنے ماضی کے آئینہ میں اپنے مستقبل کی شکل وصورت دیکھیں''۔ (سیرت سید احمد شہید ۱/۴۲، طبع ہفتم)

اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب نے اس کتاب پر داد دی اور لکھا:

''کتاب ملی، جابجا سے پڑھی، بعض حصے تو بہت مؤثر ہیں، جن کو پڑھ کر آنکھیں پر آب ہوگئیں، آپ کا انداز بیاں اور انشاء بھی دل پذیر ہے، اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ''۔ (پرانے چراغ ۱/۲۷)

اس کے بعد کرنال و پانی پت کے ایک سفر میں سید صاحب نے اپنی معیت کے لئے مولانا کا انتخاب کیا، دورانِ سفر بھی مولانا نے کافی استفادہ کیا، ۱۹۳۵ء میں سید صاحب سخت بیمار ہوئے، علالت سے افاقہ کے بعد لکھنؤ تشریف لائے، تو ندوۃ العلماء میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد ہوا، اس میں مولانا نے ایک سپاس نامہ ندوہ کے اساتذہ کی طرف سے پیش کیا، جس میں سید صاحب کی تمام اہم تصانیف کے نام تلمیح واشارہ کے پیرایہ میں آگئے تھے، یہ سپاس نامہ توجہ سے سنا گیا، سید صاحب کو حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد رئیس التبلیغ مولانا

محمد الیاس کاندھلویؒ سے گہرا تعلق ہوگیا تھا، اسی لئے جب مولانا کی کتاب ''مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت'' مرتب ہوئی، تو سید صاحب نے بطور مقدمہ ایک عالمانہ مضمون تحریر فرمایا، جس کے ہر لفظ سے عقیدت وتأثر کا احساس ہوتا ہے۔ سید صاحب ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے، اور وہ ندوۃ العلماء کو قلب دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند تینوں کا معیاری نمونہ اور مجموعہ بنانا چاہتے تھے، ندوۃ العلماء میں دینی فضا عام کرنے میں سید صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۴۶ء میں سید صاحب بھوپال منتقل ہوئے؛ لیکن بدستور ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم باقی رہے، البتہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ بھوپال میں رہ کر وہ ندوہ کی تعلیمی نگرانی پوری طرح نہیں کرسکیں گے، تو مولانا کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ:

''ندوہ کے متعلق میرے جذبات وہی ہیں جو آپ کے ہیں، میری تو ہمیشہ سے یہی رائے ہے کہ اب آپ اس بارگراں کو اپنے سر اٹھالیں - جوان ہو تم لبِ بام آچکا آفتاب اپنا- میں بہرحال آپ کی مدد کروں گا''۔ (پرانے چراغ ۴۴-۴۵ مختصراً)

پھر ۱۹۴۹ء میں سید صاحب ہنے خود تجویز رکھی کہ مولانا کو نائب معتمد بنایا جائے جو منظور ہوئی، مولانا نے سید صاحب کی رہنمائی میں کام شروع کیا اور سید صاحب کا اعتماد ہمیشہ باقی رہا، ۱۹۴۹ء میں ہی سید صاحب کی رہنمائی میں کام شروع کیا اور سید صاحب کا اعتماد ہمیشہ باقی رہا، ۱۹۴۹ء میں ہی سید صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے، حجاز میں جماعت تبلیغ نے سید صاحب کے قیام سے فائدہ اٹھایا، اس سے قبل ۱۹۴۷ء میں مولانا نے تبلیغی خدمات حجاز میں بڑے مؤثر انداز میں انجام دی تھیں، سید صاحب نے اس کے اثرات محسوس کئے اور واپسی پر اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

''بے شک جو چیز آپ کے لئے آثارِ سعادت میں سے ہے وہ یہ ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ دوسال گذرنے کے بعد آپ کے نام اور کام کو میں نے زندہ پایا؛ بلکہ آپ کی نسبت سے مجھے بزرگی ملتی رہی''۔ (پرانے چراغ ۴۸-۴۹ مختصراً)

سید صاحب نے بارہا مولانا کے بارے میں اس طرح کے بلند الفاظ فرمائے۔

مولانا سید صاحب کی جامعیت، علوم ومضامین کے تنوع اور طبیعت کی شرافت ومروت جیسے نمایاں اوصاف سے بے حد متأثر تھے، اور انہیں کا نقش خود مولانا کے یہاں بھی خوب خوب ملتا ہے، ایک استاذ وشاگرد کے باہمی ارتباط وتعلق کی اس سے بڑھ کر اور کونسی مثال ہوسکتی ہے؟ یہ ان جید الاستعداد، فاضل، تقویٰ شعار اور بلند پایہ اساتذۂ کرام کا ذکر تھا جن کے سامنے مولانا نے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے اور علم وفن کے لالہ وگل چنے ہیں۔

تلامذہ

تعلم وتربیت ہی کا کام مولانا زندگی بھر کرتے رہے اور پوری ایک ٹیم تیار کردی، ان کے تلامذہ ومنتسبین کی فہرست بہت طویل ہے، جس کا احاطہ بہت مشکل ہے، چند اہم نام یہ ہیں:

(۱) مولانا محمد معین اللہ ندوی: (متوفی ۱۹۹۹ء) سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء اور تمام تبلیغی واصلاحی سرگرمیوں اور ندوۃ العلماء کے انتظامی امور میں مولانا کے دست راست اور معتمد علیہ۔

(۲) مولانا مجیب اللہ ندوی: ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ ومدیر ماہنامہ ''الرشاد''۔

(۳) ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی: مصنف تاریخ ادب عربی وسابق استاذ ادارہ لسانیات انگریزی وعالمی حیدرآباد وسابق صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

(۴) ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی: معتمد تعلیم ندوۃ العلماء وسابق استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ اور متعدد کتابوں کے مؤلف۔

(۵) مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی: استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء وجانشین وناظم ندوۃ العلماء صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، نائب صدر وجنرل سکریٹری عالمی رابطہ ادب اسلامی جنوب مشرق ایشیاء، صدر دینی تعلیمی کونسل، جریدہ الرائد کے رئیس عام، حضرت مولاناؒ کے خواہرزادۂ عزیز اور رفیق سفر وحضر ومجاز بیعت نیز متعدد کتابوں کے مؤلف۔

(۶) ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی: (متوفی ۱۹۹۸ء) جنوبی افریقہ ڈربن یونیورسٹی میں صدر شعبہ عربی واردو وفارسی اور ماہر انگریزی داں ومصنف۔

(۷) پروفیسر مشیر الحق ندوی: (متوفی ۱۹۹۰ء) سابق صدر اسلامک عرب ارانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی وسابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی۔

(۸) مولانا سید محمود الحسن ندوی: سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(۹) ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی: سابق استاذ بنغازی یونیورسٹی لیبیا وجامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض۔

(۱۰) مولانا محمد راشد ندوی: سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

(۱۱) مولانا سید واضح رشید ندوی: عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ واستاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، ایڈیٹر الرائد، جنرل سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، حضرت مولانا کے خواہر زادہ اور تصنیفی کاموں میں معاون۔

(۱۲) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی: مولانا کے عزیز ترین شاگرد، سابق عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وحال مہتمم واستاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وایڈیٹر ''البعث الاسلامی'' اور متعدد وقیع کتابوں کے مصنف۔

(۱۳) ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی: سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء وجامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض، جواہر لال یونیورسٹی دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، سابق صدر شعبۂ عربی کشمیر یونیورسٹی والہ آباد یونیورسٹی، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے رکن اور و اس کی ہندوستانی شاخ کے صدر اور متعدد کتابوں کے مصنف۔

(۱۴) مولانا محمد الحسنی (متوفی ۱۹۷۹ء) مولانا کے برادر زادہ عزیز، ''البعث الاسلامی'' کے بانی ومدیر اور ''الاسلام الممتحن'' جیسی بلند پایہ کتاب کے مصنف۔

(۱۵) پروفیسر ضیاء الحسن ندوی: سابق صدر شعبہ عربی وحال استاذ جامعہ ملیہ

اسلامیہ دہلی۔

(۱۶) ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی: سابق استاذ جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، حال صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی اور متعدد کتابوں کے مؤلف۔

(۱۷) مولانا اسحاق جلیس ندوی: (متوفی ۱۹۷۹ء) تحریک پیام انسانیت میں مولانا کے دست راست، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے ذمہ دار اور تعمیر حیات کے فاضل مدیر۔

(۱۸) مولانا نور عظیم ندوی: (متوفی ۱۹۹۳ء) مولانا کی کتابوں کے کامیاب مترجم اور سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(۱۹) مولانا نذر الحفیظ ندوی: استاذ و مدیر "**المعهد العالي للدعوة والفكر الاسلامی**" دارالعلوم ندوۃ العلماء، ومصنف کتاب "**الاستاذ ابو الحسن علی الحسنی الندوی کاتباً ومفکراً**"۔

(۲۰) یوسف قراچہ ندوی: ترکی نژاد، حضرت مولانا کی کتابوں کے ترکی مترجم۔

(۲۱) ڈاکٹر عبدالوہاب حلبی: شامی نژاد، مبعوث دارالافتاء کوریا۔

(۲۲) ڈاکٹر مصطفیٰ سلیمان ندوی: مصری نژاد، صدر مجمع الایمان ومرکز الدراسات الاسلامیہ منصورہ، مصر۔

(۲۳) ڈاکٹر شفیق احمد ندوی: صدر شعبۂ عربی واستاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

(۲۴) ڈاکٹر محمد یونس نگرامی: استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، مستشار رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، جنرل سکریٹری مسلم انٹلک چول فورم وسابق چیئرمین اردو اکیڈمی اتر پردیش۔

(۲۵) مولانا سید سلمان حسنی ندوی: استاذ حدیث ووکیل کلیۃ الشریعۃ واصول الدین دارالعلوم ندوۃ العلماء، بانی وصدر جمعیۃ شباب الاسلام وناظم جامعہ سید احمد شہید کٹولی ملیح آباد، اور مولانا کی بعض کتب کے مترجم۔

حضرت مولانا علی میاںؒ اور دارالعلوم دیوبند

''اس درس گاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید وسنت پر اپنی توجہ مرکوز کی (اور یہ وہ وراثت اور امانت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے وسیلہ سے اس کو ملی، اور ابھی تک اس کو عزیز ہے) دوسری خصوصیت اتباعِ سنت کا جذبہ اور فکر، تیسری خصوصیت تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر وحضوری اور ایمان واحتساب کا جذبہ، چوتھا عنصر ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش، یہ چار عناصر مل جائیں تو دیوبندی بنتا ہے، اگر ان میں سے کوئی عنصر کم ہوجائے تو دیوبدیت ناقص، فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہ شعار رہا ہے کہ وہ ان چار چیزوں کے جامع رہے ہیں''۔ (زندہ رہنا ہے تو میرِ کارواں بن کر رہو، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۳)

یہ اس عالمانہ اور دردمندانہ تقریر کے الفاظ ہیں جو ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے دارالعلوم کے تاریخ ساز اجلاس صد سالہ منعقدہ ۱۹۸۰ء میں لاکھوں انسانوں کے مجمع عام میں فرمائی اور جو بجا طور پر یادگار افادیت کی حامل اور مولانا کے علم وبصیرت کا شاہکار تھی۔

حضرت مولانا کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے کس قدر گہرا اور اٹوٹ تھا، اسے خود مولانا کی زبان میں پڑھئے، مولانا نے ۱۲/اگست ۱۹۷۲ء کی شب کو دارالعلوم کی دارالحدیث کے وسیع ہال میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں اس سعادت وتوفیق پر بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی زندگی میں طالب علمانہ اور نیازمندانہ حاضری اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی، میں اس کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں اور اس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی امیدیں رکھتا

ہوں، میں اس بات پر جتنا فخر کروں کم ہے؛ لیکن میری نیاز مندی کی تاریخ اس سے زیادہ وسیع اور طویل ہے، کئی پشتوں سے میرا تعلق اس درس گاہ عالی مقام سے رہا ہے، یہاں کی زمین اُن لوگوں کے آنسوؤں سے نم اور یہاں کی فضا اُن کی دعاؤں اور آہوں سے اب بھی معطر ہوگی جو قافلہ بنا کر اس سرزمین سے گذرے (اشارہ حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئیؒ برہانویؒ وغیرہم کی طرف ہے"۔ (پا جا سراغِ زندگی ۱۲۵-۱۲۶)

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا دارالعلوم دیوبند سے تعلق محض شاگردانہ ہی نہیں؛ بلکہ عقیدت مندانہ تھا، دارالعلوم کے اکابر و اساتذہ سے انہوں نے کسب فیض فرمایا تھا، اور ان سے گہری محبت فرماتے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ سے تو گویا انہیں عشق تھا، خود حضرت مدنیؒ کو مولانا سے بڑا لگاؤ تھا اور بڑی شفقت فرماتے تھے، مولانا مدنیؒ سے تعلق کی ابتدا تو اسی وقت سے ہوگئی تھی جب ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ میں مولانا کا گھر حضرت مدنیؒ کی مستقل قیام گاہ بن گیا اور ہر سفر میں حضرت مدنی نے وہیں قیام فرمانا شروع کردیا، وہاں کی گفتگو، مجلسیں، حضرت مدنی کی عادات و معمولات، مزاجی خصوصیات، رہن سہن اور تقویٰ نے مولانا علی میاںؒ کو گرویدہ بنالیا، پھر جب مولانا نے ۱۹۳۲ء میں حضرت مدنیؒ سے استفادہ کے لئے دیوبند جا کر چار ماہ قیام فرمایا تو تقریباً مہینہ بھر حضرت مدنی ہی کے دولت کدہ پر قیام رہا، بعد میں مولانا خود اصرار کر کے دوسرے کمرہ میں منتقل ہوئے، حضرت مدنی نے بڑی مشکل سے یہ اجازت مرحمت فرمائی، پھر بھی صبح کی چائے میں حاضری ضروری قرار دے دی۔ مولانا حضرت مدنیؒ کے درسِ بخاری و ترمذی میں پابندی سے شریک ہوتے رہے، اور حضرت مدنی کے علمی استحضار، قوتِ تدریس، شانِ محدثیت اور مبسوط و مضبوط استدلالی خطاب سے بے حد متأثر رہے۔

مولانا علی میاںؒ کے بقول انہیں تفسیر قرآن کے مطالعہ سے بڑا شغف تھا، اور قرآن میں ان کا بڑا جی لگتا تھا، یہ خود ان کی پاکیزگی قلب و نظر اور سلامت دل و نگاہ کی روشن دلیل ہے، اس تفسیری مطالعہ میں جو اشکالات درپیش ہوتے، اسے حل کرنے کے لئے مولانا نے

دیوبند کے دورانِ قیام حضرت مدنی سے خاص وقت مانگا، حضرت مدنی نے جمعہ کی نماز کے بعد کا وقت متعین فرمایا، چناں چہ مولانا نے کچھ ہفتوں تک استفادہ کیا، اگر چہ حضرت مدنیؒ کی بے پناہ مصروفیات ومشغولیات کی وجہ سے یہ سلسلہ مستقل نہ رہ سکا، پھر بھی جتنا استفادہ ہوا اس سے حضرت مدنیؒ کے تدبر قرآن کا جوہر سامنے آیا۔

مولانا نے متعدد جگہوں پر لکھا اور بار بار مجلسوں میں یہ فرمایا کہ ان کے دیوبند کے قیام کی یہ برکت تھی کہ انگریزوں سے بے انتہاء نفرت پیدا ہوگئی، جس میں مرور ایام سے شدت پیدا ہوتی گئی، اور اس نفرت میں دیوبند کے ماحول اور حضرت مدنیؒ کی صحبت اور مطالعہ پھر آخر میں بچشم خود یوروپ وامریکہ کے اسفار میں مشاہدہ کو دخل تھا۔

مولانا حضرت مدنیؒ سے اپنے والہانہ تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیوبند کے قیام میں میرے لئے دل بستگی کا واحد ذریعہ مولانا (حضرت مدنیؒ) کی ذاتِ گرامی تھی، میری دینی وتعلیمی پرداخت اس انداز سے ہوئی تھی کہ میرے لئے وہاں کے درسی ومدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا؛ لیکن مولانا کی ایک نگاہِ التفات، ایک تبسم، کسی وقت شفقت سے کچھ پوچھ لینا سارا بوجھ ہلکا کر دیتا اور دل دیر تک اس کا مزہ لیتا رہتا''۔ (پرانے چراغ ۱/۱۰۲)

دارالعلوم سے آنے کے بعد مولانا کا تعلق دن بدن حضرت مدنیؒ سے مستحکم ہوتا گیا، مولانا مدنی بارہا لکھنؤ تشریف لائے، خود مولانا علی میاںؒ نے وقتاً فوقتاً دیوبند حاضری دی، حضرت مدنیؒ کے انتقال سے ایک ہفتہ قبل بھی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، مولانا نے انہیں بڑے قریب سے اور سفر وحضر، رضاء وغضب، مشغولیت وفراغت، جلوت وخلوت کے مختلف حالات میں دیکھا اور ان کے اخلاص واخلاق اور ان کی سیرت کی مرکزی صفت اور کمالات کے مرکزی نقطہ عزیمت وحمیت کے ہمیشہ قائل رہے، حمیت وعزیمت کی دو بے مثال خصوصیات مولانا کے نزدیک حضرت مدنیؒ کا امتیاز تھیں، مولانا ہر وقت اس کے گرویدہ رہے اور اس میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی تردد پیدا نہ ہوا، مولانا نے حضرت مدنیؒ کے سیاسی

نظریات وخیالات سے اختلاف کی گنجائش کے امکان کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

''جو چیز ہر شک وشبہ اور ہر بحث ونزاع اور ہر اختلاف سے بالاتر ہے، وہ ان کی بلند سیرت پاکیزہ شخصیت، بے غرض جدوجہد، بے داغ زندگی اور مکارم اخلاق ہیں، جنہوں نے ان کی ذات کو کھرا سونا اور سچا موتی بنادیا تھا، جب بھی مولانا کو دیکھا انسانیت وآدمیت، شرافت وسیادت اور اخلاق وکردار کی بڑی بلندی پر پایا اور اسی چیز نے مولانا کی بلندی کا نقش دل ودماغ پر ایسا قائم کیا کہ جب کبھی ذہن وذوق نے ان کے کسی سیاسی خیال یا کسی علمی تحقیق ورجحان کا پورا پورا ساتھ دینے سے معذرت کی اور دماغ اس کو قبول نہ کرسکا، ان کی انسانی واخلاقی بلندی اور ان کی شخصیت کی دل آویزی آڑے آئی اور دیکھا تو عقیدت ومحبت میں کوئی کمی نہ تھی''۔ (پرانے چراغ ۱/۱۰۹-۱۱۰)

مولانا کے خیال میں حضرت مدنیؒ صفِ اول کے قائدین میں تنہا وہ ایک شخص تھے جنہوں نے اپنی پچھلی سیاسی زندگی اور قربانیوں کی کوئی ادنی سے ادنی قیمت وصول نہ کی، حتیٰ کہ انہیں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے جب پدم بھوشن کا سب سے بڑا اعزازی خطاب دیا گیا، تو انہوں نے صاف معذرت کردی، مولانا مدنیؒ کا یہ استغناء اور اخلاص ایک قابل فخر وتقلید واقعہ ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے بھی اپنے محبوب استاذ حضرت مدنیؒ کی پوری تقلید فرمائی اور جب ۱۹۹۲ء کے آغاز میں اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہاراؤ کی طرف سے اسی اعزازی خطاب کو قبول کرنے کی گذارش کی گئی تو مولانا نے صاف معذرت کردی، اس سے قبل چندر شیکھر نے بھی اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں یہ پیش کش کی تھی جس سے مولانا نے معذرت فرمالی تھی۔ (کاروانِ زندگی ۵/۶۶)

مولانا نے مکاتیب شیخ الاسلام جلد دوم کے مقدمہ میں اور اپنے متعدد مضامین میں حضرت مدنی کا ذکر بڑی عقیدت واحترام سے فرمایا ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ حضرت مدنیؒ کا ذکر طویل ہوگیا، اپنے ناقص مطالعہ کی روشنی

میں میں یہ بلاتکلف کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا علی میاںؒ کا بذاتہ اصلی اور مضبوط ترین تعلق دارالعلوم دیوبند سے حضرت مدنیؒ کے توسط سے شروع ہوا اور روز بروز یہ تعلق بڑھتا اور پھیلتا گیا۔

حضرت مدنیؒ کے علاوہ مولانا نے شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے فقہ میں خصوصی استفادہ کیا اور ملا علی قاریؒ کی مشہور کتاب شرح نقایہ کے درس میں شریک ہوئے اور اس درس سے مولانا کو بڑا فائدہ پہنچا۔ مولانا کے بقول شیخ الادب اسی وقت سے بڑی شفقت فرماتے تھے جو تا آخر قائم رہی، مولانا کی بلند پایہ تصنیف ''مختارات'' طبع ہوکر آئی، تو شیخ الادب نے اس کا مطالعہ فرمایا اور حاضرین مجلس سے بڑے بلند الفاظ میں کتاب کا تعارف وتعریف فرمائی، اسی طرح جب ''القراءۃ الراشدہ'' کے حصے شیخ الادب کے پاس پہنچے تو انہوں نے مولانا کے برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کے پاس ایک مکتوب تحریر فرمایا، جس میں مصنف کی بے حد تعریف وستائش اور دعائیں بھی تھیں۔

دارالعلوم ہی میں رہتے ہوئے وہاں کے استاذ تجوید وقرأت قاری اصغر علی صاحب مرحوم سے مولانا نے روایت حفص کے مطابق تجوید کا درس لیا، زمانہ قیام دیوبند میں حضرت الامام علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ ڈابھیل سے دیوبند تشریف لائے، تو مولانا ان کی مجلس میں حاضر ہوئے، دو تین مرتبہ یہ حاضری ہوئی اور شاہ صاحب کی علمی وتحقیقی مجلس سے مستفید بھی ہوئے اور متأثر بھی۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں حضرت مولانا کو دارالعلوم کی جمعیۃ الطلبہ کے سالانہ اجلاس میں مدعو کیا گیا، دعوت نامہ کے ساتھ حضرت مدنی اور حضرت شیخ الادب کا تائیدی وسفارشی خط بھی آیا، جو مولانا سے ان حضراتِ اکابر کے بے پایاں تعلق کو واضح کرتا ہے، مولانا تشریف لے گئے اور نہایت وقیع اور مؤثر مقالہ پیش کیا جو ''طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں'' کے نام سے مستقل طبع ہوا، پھر دوبارہ ۱۹۷۲ء میں منتظمین دارالعلوم کی خواہش اور

فرمائش پر مولانا نے طلبہ دارالعلوم سے خطاب فرمایا جو ''عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب'' کے نام سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا ۱۹۶۲ء سے تاحیات دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم ممبر رہے، اور ان کی بلند پایہ آراء وافکار سے استفادہ کیا جاتا رہا، اس سے قبل مولانا علامہ سید سلیمان ندویؒ کے انتقال کے بعد اصلاحِ نصاب کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے تھے، پھر اپنے برادرِ بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ (جو خود ممبر شوریٰ تھے) کے وصال کے بعد آپ کو شوریٰ کا ممبر نامزد کیا گیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے بھی حضرت مولانا کا گہرا تعلق تھا، جس کا اظہار مولانا نے خود متعدد بار فرمایا۔

۱۹۸۰ء میں منعقد ہونے والے اجلاس صد سالہ میں عالم عرب کے ممتاز ومقتدر علماء واعیان کو دعوت دینے اور آمادۂ شرکت کرنے کی ذمہ داری مولانا پر ڈالی گئی، اور اجلاس کے سلسلہ میں شوریٰ کی میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ مولانا سعودی عرب کے سربراہ شاہ خالد کو خط لکھیں اور یہ استدعا کریں کہ وہ اپنا کوئی نمائندہ اس اجلاس میں بھیجیں، مولانا نے یہ خدمت انجام دی اور اپنے مکتوب میں دارالعلوم کا تعارف، اس کی اصلاحی مساعی، علوم دینیہ وعقائد صحیحہ کی نشر واشاعت اور رد شرک وبدعات کے سلسلہ میں پرزور اقدامات کا نہایت مؤثر الفاظ میں ذکر کیا اور نمائندہ کے طور پر کسی عالی مرتبہ عالم اور وزیر سلطنت کو بھیجنے کی استدعا کی، شاہ خالد نے مکتوب موصول ہونے کے بعد ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی (سعودیہ عرب کی مشہور شخصیت) کا انتخاب بطور نمائندہ بھیجنے کے لئے کیا، جنہیں مولانا کے اشارہ پر پہلے اجلاس کا صدر بنایا گیا، مولانا نے مجلس شوریٰ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چوں کہ کوئی ایسی واحد مقتدر اور بین الاقوامی شخصیت سامنے نہیں ہے، جس کو اول سے آخر تک اجلاس کی صدارت کا اعزاز

بخشا جائے اور کوئی اس پر اعتراض نہ کر سکے، اس لئے مناسب ہے کہ ہر اجلاس کا علیحدہ صدر ہو، یہ تجویز منظور ہوئی اور اس کے مطابق عمل بھی ہوا۔

اجلاس صد سالہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ انسانوں کا ایک جنگل تھا اور میدانِ عرفات کا ایک ہلکا سا نقشہ، جو اصلاً دار العلوم اور اکابر دار العلوم کی خدمت، خلوص اور مقبولیت کا ثمرہ تھا، مولانا کو عربی میں تقریر کرنے کے لئے کہا گیا تھا؛ لیکن عربی سے نابلد اس لاکھوں افراد کے مجمع میں عربی میں خطاب مولانا کو ایک مصنوعی اور نمائشی عمل نظر آیا، جس کے لئے ان کا ضمیر آمادہ نہ ہو سکا، چناں چہ مولانا نے اردو میں خطاب کیا، یہ خطاب جوشِ بیان اور علمیت کے لحاظ سے بے مثال تھا، اور اسے اجلاس کا حاصل وخلاصہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا ایک اہم اقتباس اس مقالہ کے آغاز میں گذر چکا ہے، تقریر کے دوران اور اس کے بعد سامعین پر بڑا گہرا اثر نظر آیا؛ اس لئے کہ یہ ان کے دل کی بات تھی تا وراس سے ان کی روح کی تشنگی ختم ہوئی، مولانا نے دیوبند کے مسلک اور وہاں کے فضلاء ومنتسبین کی ہیئت ترکیبی اور مسلک وشعار کی جو ترجمانی فرمائی وہ بے کم وکاست درست اور مبنی بر حقیقت تھی، اور مولانا کی تقریر کے معاً بعد مولانا مفتی محمود مرحوم (سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد پاکستان) نے اپنے مختصر خطاب میں مولانا کی تقریر سے پورا اتفاق ظاہر کیا اور تائید کی۔

مولانا کے اس خطاب کا یہ اقتباس کتنا دل کش، روح پرور اور مؤثر ہے:

> حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور مولانا مدنیؒ اپنے اپنے خاص طرز اور اسلوب سے اسی کے لئے ہمیشہ سوزاں اور لرزاں رہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی خصوصیات اور ملی تشخصات کے ساتھ اس ملک میں باقی رہیں، قرآن وسنت کو سینے سے لگائے رکھیں، اختلافی مسائل چھیڑنے کے بجائے توحید وسنت پر زور دیں، دیوبند کا یہی پیغام ہے اور اس کی یہی خصوصیات رہی ہے کہ انہوں نے سرمایۂ ملت کو بچانے کی کوشش کی اور اختلافی مسائل کو عوام کے سامنے نہیں لائے، یہ دیوبند وارث ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کا، اور اگر کوئی نہیں سمجھتا تو اسے سمجھنا چاہئے، یہ میرا مقام نہیں ہے؛ لیکن میں کہتا ہوں، اور حضرت مجدد الف ثانی کے

وارث ہیں حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مقتدر بزرگوں مآں سے کسی کو بھی اس میں کلام نہیں کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ کا گلستاں اور ان کا مکتب فکر ہے جو دیوبند کی شکل میں اس وقت سامنے ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں صحیح العقیدہ درس گاہیں ہیں وہ شاہ ولی اللہ کی شمع فروزاں اور اسی کی تجلیات ہیں''۔ (زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو ۲۱)

اجلاسِ صد سالہ کے بعد جو ہنگامے دارالعلوم میں کھڑے ہوئے اور دارالعلوم کا وقار اور تقدس جس قدر مجروح ہوا، وہ تاریخ دارالعلوم کا ایک تاریک باب ہے، جس کے اظہار وبیان سے الفاظ قاصر ہیں، بعض سلیم الطبع فاضل اصحابِ شوریٰ کے ساتھ حضرت مولانا نے اپنے طور پر اختلاف کو رفع کرنے، متحارب گروپوں میں اتحاد پیدا کرنے اور تقسیم وہنگامہ وشر سے حفاظت کے لئے انفراداً واجتماعاً قابل قدر کوششیں فرمائیں، ایسی تجاویز بھی رکھیں جو امکانی حد تک دونوں فریقوں کے لئے قابل قبول ہوں، اس میں یہ کوشش اور خواہش بھی تھی جو خالص اخلاقی اور بے غرضانہ تھی کہ حضرت قاری صاحبؒ (جو بانی دارالعلوم کے پوتے اور وارث ہونے کے ساتھ اس وقت کے طلبہ علماء میں بے نظیر وبے بدل وقار وامتیاز کے مالک تھے اور نصف صدی سے زائد مدت تک انہوں نے دارالعلوم کی بے لوث خدمت کی، اور اس حقیقت کا اظہار نہ کرنا مداہنت ہے کہ ان کے دور میں دارالعلوم اپنے بامِ عروج اور ترقی وشہرت کے مدارج عالیہ کو پہنچا) اس دنیا سے اس حالت میں نہ جائیں کہ ان کو دارالعلوم (جس کی انہوں نے ایک عرصہ تک اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی ہے) سے جدائی کا داغ لگا ہو؛ لیکن افسوس ہے کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی، اور مولانا کے بقول: ''اس سلسلہ میں اسی گروہ نے تعاون نہیں کیا جس کو قاری صاحبؒ کا وقار، اُن کا سکونِ خاطر اور دارالعلوم سے ان کا ارتباط سب سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے تھا اور اس کو اپنے ہر مفاد وتأثر پر ترجیح دینی چاہئے تھی، بالآخر جس چیز کا خطرہ تھا وہ پیش آکر رہی''۔ (کاروانِ زندگی ۲/۳۱۳-۳۱۴)

اس سلسلہ کی روایات اتنی متضاد ہیں کہ اب شاید وحق وناحق کا فیصلہ آخرت ہی میں

ہو سکے گا، بہر حال جو نوشتۂ تقدیر تھا وہ ہو کر رہا، ﴿وکان امر اللّٰہ قدراً مقدوراً﴾ حضرت قاری صاحبؒ کے ساتھ اساتذہ وطلبہ کا جو طبقہ دارالعلوم سے باہر آیا، اس نے وقف دارالعلوم کے نام سے الگ ادارہ قائم کرلیا، بحمداللہ دونوں ادارے ہنوز مصروفِ عمل ہیں۔۔

حضرت مولانا کا دونوں اداروں سے ربط وتعلق تھا؛ البتہ دیوبند کی حاضری خود مولانا کی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے کم ہوتی جارہی تھی، اکتوبر ۱۹۸۶ء میں دارالعلوم میں ختم نبوت کے موضوع پر ایک عظیم کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس میں عالم عرب کے بعض علماء شریک ہوئے، حضرت مولانا بھی تشریف لے گئے اور افتتاحی اجلاس میں ختم نبوت اور قادیانیت کے تعلق سے بڑا پرمغز خطاب فرمایا، نیز ردّ قادیانیت وفرقِ باطلہ کے سلسلہ میں دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کی گراں قدر خدمات کو سراہا اور واضح کیا۔

اپنے اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ دیوبند کے دیگر اکابر سے مولانا کا بڑا گہرا ربط تھا، خصوصاً حکیم الامت حضرت تھانویؒ (جو بلاشبہ حلقہ دیوبند کے بے حد ممتاز؛ بلکہ قابل صد افتخار عالم ومصلح ہیں) سے مولانا کو بے حد عقیدت تھی، خود حضرت تھانویؒ مولانا سے بڑی محبت وشفقت اور قدر ونوازش کا معاملہ فرماتے تھے، اس کا اظہار اس مکتوبِ گرامی سے ہوتا ہے جو مولانا کے نام حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا اور اس میں مولانا کو ''مجمع الکمالات'' کے الفاظ سے مخاطب فرمایا، حضرت تھانویؒ کے بارے میں یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ وہ کتنی محتاط ومعتدل شخصیت کے مالک تھے، پھر بھی انہوں نے مولانا کو جو اس وقت کل ۱۹/سال کے تھے، اس طرح کے بلند پایہ الفاظ سے مخاطب فرمایا جو خود حضرت تھانویؒ کی فراست وبصیرت اور مولانا علی میاںؒ کے کمال وفضل کی دلیل ہے، اس مکتوب پر مولانا نے جو تبصرہ کیا وہ ان کے تواضع کی دلیل ہے:

''اس شفقت نامہ پر اس کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا کہ..... کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید''۔ (پرانے چراغ ۱/۱۲۳-۱۲۴)

مولانا کی شہرۂ آفاق تصنیف ''سیرت سید احمد شہیدؒ جب حضرت تھانویؒ کے پاس پہنچی تو حضرت تھانویؒ نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور بار بار اس کا مطالعہ فرماتے رہے۔

دیگر اکابر دیوبند میں شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ، اور اپنے بزرگ ومعاصر علماء سے مولانا کے گہرے روابط اور ان کے مولانا سے تعلقات، محبت اور اعتماد کی تفصیلات بڑی طویل ہیں جن کا کچھ ذکر آگے آئے گا۔

بعض کوتاہ قامت اور کینہ پرور افراد مولانا کے بارے میں اس طرح کے تأثرات ظاہر کررہے ہیں کہ مولانا کا تعلق دارالعلوم سے برائے نام تھا اور اس میں کسی قلبی عقیدت ومحبت کو نہیں ظاہری مروت ورواداری اور حالات کے تقاضوں کو دخل تھا، دراصل یہ مولانا کی شخصیت اور وقار کو مجروح کرنے اور ان کی زندگی کے ایک اہم اور روشن باب کو چھپانے کی ناپاک کوشش ہے، مولانا کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے اور ان کی مجلسوں میں شریک رہنے والے افراد بخوبی واقف ہیں کہ انہیں دارالعلوم سے کتنا جذباتی تعلق تھا، حضرت مدنیؒ کے ذکر میں انہیں کتنی لذت ملتی تھی اور کتنا لطف آتا تھا اور دارالعلوم کی ترقی کی انہیں کتنی فکر رہا کرتی تھی۔

مولانا نے جب بھی ہندوستان کے مدارس اور دینی خدمات کا تذکرہ کیا، ہر موقع پر سب سے پہلے دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کا ذکر کیا، پھر مظاہر علوم اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ذکر کیا، یہ ان کے دل کی صدا تھی جو وہ دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کو ہر جگہ نمایاں کرکے پیش فرماتے تھے، وہ حقیقت پسند تھے اور دارالعلوم کو اپنا مادر علمی سمجھتے اور ظاہر کرتے تھے، دارالعلوم کا تعارف انہوں نے اپنی کتابوں خصوصاً القراءۃ الراشدۃ حصہ سوم، الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ، المسلمون فی الھند وغیرہ میں بڑے بلند لفظوں میں فرمایا، اجلاس صد سالہ کے موقع پر ''مرکز العلم والثقافۃ الاسلامیۃ فی

الھند دارالعلوم دیوبند'' کے عنوان سے ایک مختصر کتابچہ بھی مولانا کا طبع ہوا اور تقسیم کیا گیا تھا، اس کے علاوہ مولانا نے متعدد عربی اور اردو مضامین میں دارالعلوم کا ذکر کیا ہے، ہندو پاک کے بعض گمراہ طبقوں نے جب جماعتی مفادات، شخصی مصالح اور ایک خاص مشرب وطریقۂ کار کو فائدہ پہنچانے کے لئے مدارس واکابر دینی تحریکات ومراکز اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کا کام بڑے شدومد سے شروع کر دیا، تو مولانا نے اس کی تردید کے لئے ایک مقالہ ''اضـــواء'' کے نام سے عربی میں تحریر فرمایا، جس کا اردو ترجمہ ''بصائر'' کے نام سے طبع ہوا، اس میں ہندوستان کے مدارس تحریکات اور اکابر کا ایک مختصر سا خاکہ بڑے بلیغ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، اس میں دیوبند اور اکابر دیوبند کا تذکرہ بڑے اچھے انداز میں آیا ہے، ان کی ناقابل فراموش دینی وعلمی خدمات کا ذکر آیا ہے اور غلط فہمیاں دور کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

دارالعلوم کے پیغام اور اس کے افکار کی تبلیغ وترویج میں دارالعلوم کے اس فرزند وعقیدت منداور حضرت مدنی کے اس شاگرد ارجمند کا حصہ بھی کسی سے کم نہیں ہے، دارالعلوم کے ابناء اور ان کی طویل ترین اور وسیع ترین زریں خدمات اور دارالعلوم کے مشن کو عام کرنے اور اسے مادی ومعنی ترقیات سے مالا مال کرنے کے تئیں ان کی مساعی اور بے لوث کوششوں کی جب بھی تاریخ مرتب کی جائے گی، حضرت مولانا علی میاںؒ کا نام ان میں سرفہرست ہوگا۔

ہم اس مضمون کا خاتمہ مولانا ہی کے اس جملہ پر کرتے ہیں جو مولانا نے طلبہ دارالعلوم کو خطاب کرتے ہوئے ۱۹۷۲ء میں فرمایا تھا اور اس سے بڑھ کر کسی اور جملہ سے اس بے پایاں تعلق کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا نے فرمایا تھا:

''میں آپ سے انہیں الفاظ میں جو کبھی زبانِ نبوت سے حضراتِ انصار واہل مدینہ کے لئے نکلے تھے کہہ سکتا ہوں کہ: ''المحیا محیاکم والممات مماتکم'' (جینا بھی

تمہارے ساتھ ہے اور مرنا بھی تمہارے ساتھ ہے) خدا میری یہ دعا اور آرزو پوری کرے''۔

(پاجا سراغِ زندگی ۱۲۶)

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں پرانے چراغ، کاروانِ زندگی اور مولانا کے دیگر رسائل کو سامنے رکھا گیا ہے۔

❐❖❐

حضرت مولانا علی میاںؒ

اور
دارالعلوم ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء نے جدت وقدامت، رسوخِ عقیدہ اور عصری تقاضوں دین ودنیا اور قدیم صالح وجدید نافع کے درمیان جیسا توازن واعتدال اور خوش گوار امتزاج قائم رکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، اس نے اپنے ان اساسی مقاصد کی جس ہوش مندی اور بیدار مغزی، ثبات واستقامت اور حسن وخوبی کے ساتھ خدمت کی، وہ عالم اسلام کی تاریخ کا ایک یادگار اور شان دار باب ہے، جسے اسلامی تعلیم وثقافت کی تاریخ میں کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے دینی علوم کے پہلو بہ پہلو عصری علوم سے استفادہ، تصنیف وصحافت، عصری درس گاہوں کی مناسب رفاقت، عالم اسلام وعالم عرب سے اٹوٹ اور پائیدار علمی وثقافتی روابط اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو بے مثال نقوش قائم کئے ہیں، وہ ہمارا سرمایۂ افتخار واعزاز اور عالم اسلام کے لئے قابل تقلید وتائید ہیں، رفع نزاع باہمی اور اتحاد بین المسلمین کے میدان میں یہ تحریک ہمیشہ تیز گام اور سبک رفتار رہی ہے، تحریک ندوہ کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی وثقافتی میدان میں رونما ہوا، وہ یہ کہ اس نے اپنی روشن دماغی، عالی فکری، حالات کی نباضی اور مزاج شناسی کے جوہر گراں مایہ سے نصاب ونظام تعلیم ودرس میں مناسب تبدیلیوں کا سلسلہ مسلسل اور مستقل جاری رکھا اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں لگی رہی۔ (تاریخ ندوہ جلد۲، ماخوذ از: دیباچہ)

یہی وہ عظیم اور بے مثال تحریک ہے جس کے منتسبین، تلامذہ اور قابل صد افتخار فرزندوں میں ہمارے ممدوح حضرت مولانا علی میاںؒ کا نام نامی بے حد نمایاں اور آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

ندوۃ العلماء ہی مولانا کی اصل تربیت گاہ و درس گاہ اور سرگرمیوں کا حقیقی مرکز ہے، جہاں مولانا کا علمی، ادبی اور دعوتی سفر شروع ہوا، اور پھر وہیں ختم بھی ہوا، یہیں سے مولانا کو پرواز کا شعور و سلیقہ ملا اور پھر نصف صدی سے زائد عرصہ تک مولانا نے اپنی علمی و دعوتی تابانیوں سے ہزاروں کو منور کیا، اور نہ جانے کتنوں کی علمی تشنگی بجھائی، اور انہیں جینے کے سلیقوں اور طریقوں سے روشناس کرایا۔ ندوۃ العلماء سے مولانا کا تعلق بڑا قدیم رہا ہے، مولانا کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنیؒ اور برادر بزرگ جناب مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے ندوۃ العلماء کی جو خدمات انجام دیں وہ واضح اور عیاں ہیں، حضرت مولانا علی میاںؒ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور ندوہ کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ کے درس حدیث میں باضابطہ شریک ہوئے، اور صحیحین کے ساتھ ساتھ سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی بھی پڑھی، پورے دو سال ان کی صحبت میں گذارے اور حدیث میں خصوصی استفادہ کیا، ان کے درسِ بیضاوی میں بھی شریک ہوئے، مشہور فقیہ مولانا شبلی جیراجپوری سے فقہ کی بعض کتابیں پڑھیں، یہ آپ کا طالب علمی کا دور ہے، پھر دوسرا دور ۱۹۳۴ء میں شروع ہوتا ہے، جب مولانا ندوۃ العلماء میں استاذ منتخب ہوئے اور تفسیر و حدیث اور ادب عربی کے اسباق کے ساتھ کبھی کبھار تاریخ و منطق کے کچھ اسباق مولانا سے متعلق رہے، یہ ندوہ سے باضابطہ تعلق کا دور ہے، اس زمانہ میں مولانا کو اچھے اور ادب و علم کا ذوق رکھنے والے معاصر رفقاء کی معیت اور مصاحبت ملی، اس کے ساتھ ادبی سرگرمیاں بڑے زور و شور سے جاری رہیں، مولانا نے ندوہ کی اس وقت کی فضا اور ماحول کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

> ''افسوس ہے کہ اس وقت دارالعلوم میں کوئی دینی و دعوتی فضا موجود نہ تھی، اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ خود ہم اساتذہ کا ذوق و ذہن جن کا طلبہ پر اثر تھا، دعوتی نہیں بنا تھا، ہم میں

سے جولوگ دینی ذوق رکھتے بھی تھے اور خوش اوقات اور پابند معمولات تھے، ان میں بھی تعدیہ کی صلاحیت اور طلبہ میں دینی واصلاحی جذبہ پیدا کرنے کی طاقت نہ تھی، ساری فضا پر علمی وادبی، تحریری وتقریری ذوق سایہ فگن تھا، مولانا نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس وقت طلبہ میں شرافت وذہانت، سنجیدگی وشائستگی وخودرائی، بڑوں کا پاس ولحاظ اور اساتذہ کا ادب، گھٹیا اور مبتذل باتوں سے احتراز، چھوٹے بڑے کا لحاظ جیسی خوبیوں کے ساتھ ہی کسی قدر آزاد روی، دینی تساہلی اور اسکول وکالج کے طلبہ کی نقل کا جذبہ تھا، مرور ایام سے یہ ماحول ختم ہوتا گیا اور دینی رنگ چڑھتا گیا''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۱۵۲-۱۵۵ مختصراً)

تدریس کے اس دور میں دوہ کے بعض اساتذہ کے ہمراہ مولانا کو علامہ سید سلیمان ندویؒ معتمد تعلیم ندوۃ العلماء سے فلسفہ قدیم سے متعلق استفادہ کا موقع ملا، اور سید صاحب کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہوئے۔ (پرانے چراغ ۱/۲۵)

مولانا کا مسلسل اور مستقل تدریس کا سلسلہ تو غالباً ایک دہائی سے زیادہ نہ رہ سکا؛ البتہ آگے چل کر کسی نہ کسی انداز میں یہ تعلق باقی رہا، صحیح بخاری کا درس بھی کچھ دنوں دیا اور پھر ایک طویل عرصہ تک فضیلت کے اخیر سال کے طلبہ کو متعدد موضوعات وکتب کا درس ایک عشرہ سے زائد وقت تک دینے کا معمول تھا، یہ کام عموماً رائے بریلی میں مولانا کی قیام گاہ پر انتہائی پرسکون اور نیک ماحول میں انجام پاتا تھا، طلبہ مولانا کی ضیافت وشفقت کے سایہ تلے اپنا وہ مختصر سا وقت گذارتے اور جب واپس آتے تو یہ احساس رہتا کہ تشنگی ابھی بجھی نہیں ہے اور ابھی سیرابی نہیں ہوسکی ہے، ایک عرصہ تک اس مختصر سے قیام کی برکتیں اور لذتیں محسوس ہوتیں اور اس کی یادیں دیر تک دل میں چٹکی لیتی رہتیں۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء کے بیچ میں مولانا نے عربی ادب کا ایک جدید اور اسلامی نصاب تعلیم تیار فرمایا، اور اس سلسلہ میں مختارات، قصص النبیین، القراءۃ الراشدۃ وغیرہ کتابیں تحریر فرمائیں جو بے حد مقبول اور داخل درس ہوئیں۔

۱۹۴۸ء میں مولانا کو ندوہ کی مجلس انتظامی کا رکن متعین کیا گیا، پھر ۱۹۴۹ء میں علامہ

سید سلیمان ندویؒ کی تحریک وتجویز پر مولانا نائب معتمد تعلیم منتخب ہوئے اور پھر ۱۹۵۴ء میں سید صاحب کے انتقال کے بعد مولانا ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے۔

ندوۃ العلماء سے تعلق کا تیسرا سب سے مضبوط اور اہم دور ۱۹۶۱ء سے شروع ہوتا ہے، جب مولانا کے برادر بزرگ اور مربی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کی وفات کے بعد مولانا کو ندوۃ العلماء کا ناظم متعین کیا گیا، جس پر مولانا تاحیات قائم رہے، اپنی آنکھوں کی مستقل بیماری کی وجہ سے مولانا نے بارہا یہ سمجھ کر کہ ندوہ کی خدمت کا حق ان سے مکمل ادا نہیں ہو پا رہا ہے، استعفاء دینا چاہا؛ لیکن یہ استعفاء منظور نہ کیا گیا۔

مئی ۱۹۷۰ء میں ندوۃ العلماء میں اسٹرائک کا واقعہ پیش آیا، جو مولانا کے دور نظامت میں اس نوعیت کا پہلا اور آخری واقعہ تھا، اسٹرائک نے سنگین شکل اختیار کر لی، معاملہ اور آگے بڑھ سکتا تھا، پولیس کی آمد اور رفقاء کی مدد سے مسئلہ قابو میں آ گیا، یہ اسٹرائک گرمی کی چھٹی پر اور امتحان کے التواء کے بنیادی مطالبہ پر ہوئی تھی جب کہ امتحان قریب تھا، اور اس کے بعد تعطیل ہونی تھی اور گرمی کی چھٹی بھی یونیورسٹیوں میں اس وقت شروع نہ ہوئی تھی، اس لئے یہ مطالبہ سراسر بے بنیاد تھا، مولانا کے بقول اس واقعہ نے ان کے دل ودماغ اور اعصاب کو جھنجھوڑا، مولانا کے رفقاء میں مولانا شاہ معین احمد ندوی سابق ناظم دارالمصنفین اور مولانا عمران خاں صاحب ندوی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بڑی اخلاقی مدد کی اور تسکین وتسلی کا سامان کیا، مولانا محمد رابع صاحب ندوی حال ناظم ندوۃ العلماء نے بھی بڑی مستعدی وبیدار مغزی سے معاملہ کو سلجھانے میں انتظامیہ کا تعاون کیا۔ (کاروانِ زندگی ۲/۵۱-۵۲)

اس کے بعد پھر کبھی اس نوعیت کا واقعہ پیش نہیں آیا۔

مولانا کا دورِ نظامت ندوۃ العلماء کا عہد زریں اور دور عروج وکمال ہے، جس میں ندوہ بین الاقوامی شہرت کا ادارہ بن گیا، اور اس کا وقار بڑھتا چلا گیا، عالم عرب سے پہلی بار اتنا گہرا رابطہ پیدا ہوا۔

خود مولانا کی پاکیزگیٔ نفس وقلب، اور عفتِ ضمیر ونگاہ، اندر کے تقویٰ اور خداداد مقبولیت، مرکزیت، مرجعیت، گراں مایہ تصانیف، اور دعوتی سرگرمیوں کی وجہ سے عرب وعجم کا یکساں تعلق واکرام، اور محبت ومودت سے ندوہ کو جتنے معنوی وروحانی اور مادی فائدے پہنچے، ان کی تفصیلات یہاں بیان نہیں کی جاسکتیں۔

اس حقیقت کے اظہار میں کسی تردید کی گنجائش نہیں کہ مولانا کی سربراہی نے ندوۃ العلماء کو حیاتِ نوادر اور نشأۃ ثانیہ بخشی ہے، بانی ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ نے ندوہ کی تاسیس علوم دینیہ وعصریہ کے ایسے جامع افراد تیار کرنے کے لئے فرمائی تھی جو دعوتِ اسلامی کا کام بڑے وسیع پیمانے پر کرسکیں، یہ بڑا ہی عظیم مقصد تھا، مگر حالات کی ستم ظریفی کہ ندوہ کا دینی رنگ دھیرے دھیرے مدھم ہونے لگا، اور ادب ولٹریچر اور تاریخ سے شغف روز افزوں ہوتا گیا، اس افسوس ناک صورتِ حال کے ازالہ میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی پرخلوص کوششیں بے انتہا نمایاں ہیں، مولانا نے ندوہ کو اس کی تاسیس کی مستحکم اساسوں پر دوبارہ بحال ہی نہیں کیا؛ بلکہ ندوہ کے ماحول کو دینی اور اصلاحی قالب میں بھی ڈھالا، دین کی اصل واساس اور ادب وتاریخ کو تابع ووسیلہ کا درجہ دیا، اور علماء کی ایسی ٹیم تیار کی جو دینی وعلمی لحاظ سے بلند پایہ ثابت ہوئی اور مولانا کے افکار واسلوب کی وارث وامین ثابت ہوئی، اور تاہنوز انہیں خطوط ونقوش پر خدمتِ دین میں مصروفِ عمل ہے، اصلاحی اور دینی ماحول کے لحاظ سے اگر ندوہ کے ماضی سے اس کے حال اور مستقبل کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں زمین وآسمان کا فرق نظر آتا ہے اور یہ فرق ہر اس شخص کو بہت نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے جو ندوہ کے ماضی سے واقف ہے۔

مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے جب ۱۹۸۰ء میں اجلاس صدسالہ کے موقع پر ہندوستان کی حاضری میں ندوہ کی زیارت کی تو اپنا تأثر یوں قلم بند فرمایا:

''ندوہ کی علمی ودینی فضا دیکھ کر بڑی امیدیں قائم ہوئیں اور حوصلہ بڑھا، ندوہ بقول اکبر مرحوم مسلمانوں کی زبانِ ہوش مند تو ہمیشہ سے تھا؛ لیکن دلِ دردمند کی جو کسر بیان کی جاتی

تھی، وہ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب مدظلہم نے پوری فرمادی ہے، خاص طور پر حضرت مولانا علی میاں مدظلہم العالی کی فکر وبصیرت، جہد وعمل، اور سوز وگداز کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مدظلہم نے اس ادارہ کو حیاتِ نو بخش دی ہے''۔ (جہانِ دیدہ ۵۳۴)

ندوۃ العلماء کی تاریخ میں مولانا کا دور ایک روشن باب ہے، مولانا ہی کی قیادت میں ندوہ کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی منعقدہ ۱۹۷۵ء نے دھوم مچادی، عرب علماء کے متعدد وفود اور عالی مرتبت علماء اتنی بڑی مقدار میں شاید ہندوستان میں پہلی بار جمع ہوئے جس کا شرف ندوۃ العلماء کو حاصل ہوا، اس کا سہرا اصلاً حضرت مولانا ہی کے سر بندھتا ہے، اس کے علاوہ خود ہندوستان کے مختلف الخیال والفکر علماء اور دانشوروں کے جس عظیم مجمع نے اس جشن میں شرکت کی، اس سے اس اجلاس کی اہمیت اور دوررس اثرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اجلاس کا نقشہ مولانا محمد الحسنیؒ نے اپنے ادیبانہ وساحرانہ اسلوب میں یوں کھینچا ہے:

''اس تحتی برّ اعظم کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا، جل علم وفضل اور جمال وکمال کی یہ کہکشاں یہاں دیکھی گئی، تنہا جامعاتِ اسلامیہ کے نمائندے، ان کے سربراہ اور ذمہ دار آج جس طرح شانہ بشانہ اور قطار اندر قطار یہاں نظر آرہے تھے، اور دل فریب منظر پیش کررہے تھے وہ تاریخ کی ایک ایسی امانت ہے جس کو کوئی مؤرخ اور وقائع نگار نظر انداز نہیں کرسکتا، ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ ڈائس نہیں، عالم اسلام کا حسین وجمیل گلدستہ ہے، جس میں اس کے وسیع قلم رو سے ہر رنگ کے پھول اکٹھا کرکے بہت خوبصورتی اور خوش ذوقی کے ساتھ سجادئے گئے ہیں''۔ (روداد چمن ۷۹-۸۰)

عرب وفود کی اتنے بڑے پیمانہ پر شرکت کی وجہ سے یہ فضا بھی بعض افراد کی طرف سے بنائی جارہی تھی کہ اس سے ندوہ کے مالی استحکام کا فائدہ اٹھایا جائے گا، جس کے لئے اس سے بہتر موقع ہاتھ آنا مشکل ہے؛ لیکن ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں نے پہلے ہی یہ طے کرلیا تھا کہ اس میں کہیں چندہ کا نام نہ آئے گا اور مادی فائدہ اٹھانے کے خیال کو قریب نہیں آنے

دیا جائے گا، چناں چہ اس خیال کی تردید کے لئے مولانا نے ایک مؤثر تقریر کی، جس میں صاف صاف کہا کہ:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

یہ سونے کی سب چڑیاں اڑ جائیں گی، ہم اور آپ یہاں رہیں گے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو چھٹی مل گئی، ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں، ہمارے مدرسے آپ ہی کے چار چار آٹھ آٹھ آنے پر چل رہے ہیں، آپ کے چار آنے اور آٹھ آنے ہم کو زیادہ عزیز ہیں؛ اس لئے کہ آپ ایثار کر کے دیتے ہیں، آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ہم نے ان لوگوں کو اس لئے بلایا ہے کہ ہم اپنا دامن بھر لیں۔ (کاروانِ زندگی ۲/۱۹۲-۱۹۳)

مولانا کی یہ روشن تا زندگی باقی رہی، متعدد بار بہت سے عرب امراء اور حکام نے ندوہ کے سالانہ مصارف تنہا برداشت کرنے کی اجازت چاہی، جن میں حاکم شارجہ سلطان محمد القاسمی سرفہرست ہیں، مگر مولانا کو ان کی یہ خواہش کبھی قبول اور منظور نہ ہو سکی۔

ندوہ کے جشن تعلیمی کی اتنی زبردست کامیابی میں سب سے اہم اور مرکزی رول حضرت مولانا ہی کا ہے، صدر اجلاس شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور دیگر علماء واعیان عرب نے مولانا اور ندوہ کے سلسلہ میں جن تأثرات کا اظہار کیا ہے وہ بے کم وکاست درست ہیں، اور ان سے مولانا کی محبوبیت، اخلاص اور جوشِ عمل کے ساتھ ساتھ فکر ندوۃ العلماء کے اعتدال، ہمہ گیری، جامعیت اور مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جشن کے موقع پر حضرت مولانا کے سلسلہ میں استاذِ گرامی قدر حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ العالی ایڈیٹر ''البعث الاسلامی'' و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے

اپنے عربی کے ایک مضمون میں جن تأثرات کا اظہار کیا تھا وہ بلاشبہ مطابق واقعہ تھے، ہم اس کے چند اجزاء یہاں نقل کرتے ہیں: (ماخوذ: علماء ومفکرون عرفتهم ۱۴۲/۱)

''اس جشن تعلیمی میں سب سے بنیادی اور حقیقی چیز جو کارفرما ہے، وہ ہمارے استاذ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے پہلو میں حرکت کرتا ہوا دردمند دل ہے، اگر ان کی عبقریت، امتیازی شخصیت، وسیع وعمیق مطالعہ، عقل سلیم، فہم راسخ، عالی اسلامی افکار اور اس سے آگے بڑھ کر ان کا طاقت ور اور مثالی ایمان، اسلام اور مسلمانوں کے مسائل ومشاکل کے حل سے دل چسپی، اخلاص، بے پایاں محبت خداوندی، رسول اللہ سے عشق وشیفتگی اور فنائیت جیسے بلند وبیش قیمت اوصاف نہ ہوتے، تو اس جشن کی کوئی قدر وقیمت اور اہمیت نہ ہوتی، اور نہ ہی تعلیم وتربیت کی تاریخ میں اس کا کوئی دوررس اثر اس ملک میں خصوصاص اور عالم اسلام میں عموماً سامنے آسکتا تھا۔

اتنی عظیم، مخلص، بلند مرتبت اور کامل شخصیت کا وجود صرف ندوۃ العلماء اور ہندوستان ہی کی خوش بختی اور سعادت نہیں ہے؛ بلکہ حضرت مولانا کا وجود علم وتہذیب اور تعلیم وتربیت کی پوری تاریخ کے لئے باعثِ سعادت ہے، اور علماء وداعیان کی تاریخ میں ایک روشن اور ذریں باب کا اضافہ ہے، موجودہ دنیا کو ایسے اصحابِ فضل وکمال کی آج سخت ضرورت ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

اس کے بعد نومبر ۱۹۹۷ء میں ندوۃ العلماء کے احاطہ ہی میں مولانا کی سربراہی میں قادیانیت کے خلاف ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں بھی عالم عرب کے علماء واعیان کا ایک بڑا طبقہ شریک ہوا، مختلف ممالک کے وفود آئے، اس کانفرنس میں بھی مرکزی کردار حضرت مولانا ہی کا تھا، اس موقع پر امام حرم مکی شیخ محمد بن عبداللہ السبیل نے اپنے خطاب میں مولانا کے کارناموں کا ذکر فرمایا، اور ندوۃ العلماء کی علمی ودینی طویل ووسیع خدمات کو سراہا، جن سے مولانا کے فضل وکمال اور ندوہ کی عالمی مقبولیت کا ہلکا سا خاکہ سامنے آتا ہے۔

۱۹۹۴ء میں جب حکومت ہند کے اشارے پر دہلی کے انٹلی جنس بیورو، مقامی پولیس اور پی اے سی نے رات کے سناٹے میں ندوہ پر چھاپہ مارا اور بے گناہ طلبہ کو گرفتار کیا، فائرنگ کی، تو اس کے ردعمل میں ملک و بیرونِ ملک ایک کہرام مچ گیا، اور ہر طرف سے صدائے مذمت واحتجاج بلند ہوئی، اور اس طرح کی باتیں کہی جانے لگیں کہ اگر مولانا علی میاں کے ندوہ کو ''آئی ایس آئی'' کا اڈہ قرار دیا جاسکتا ہے، تو پھر اب ہندوستان کا کوئی مدرسہ اور مسلم ادارہ محفوظ نہیں، بہرحال حکومت کو بڑی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ دراصل ہندوپاک اور عالم عرب کے افراد کے مولانا سے قلبی تعلق اور لگاؤ نیز دارالعلوم ندوۃ العلماء سے گہرے ربط کی واضح دلیل تھی۔

عالم اسلام میں خصوصاً مشرق اسلامی میں یوروپ کی مغربی تہذیب کے راستہ سے جس فکری، نظریاتی، اعتقادی اور تہذیبی ارتداد نے پورے زور شور سے اپنے قدم جمائے اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقوں کو اپنی گرفت میں لینا شروع کردیا تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حضرت مولانا کے دل میں ایک مستقل مجلس قائم کرنے کا احساس پیدا ہوا، مئی ۱۹۵۹ء میں ندوہ کی احاطہ میں مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام (Acadmy of Islamic Risearch and Pub lications) کا قیام عمل میں آیا، جس کے زیر اہتمام اردو، انگریزی، عربی اور ہندی میں اب تک تین سو سے زائد مطبوعات شائع ہوچکی ہیں، اس تحتی براعظم میں انگریزی کی اتنی اچھی اسلامی کتابیں اور لٹریچر کسی اور ادارہ نے شائع نہیں کئے۔

اس کے علاوہ مولانا نے ندوۃ العلماء میں ''المعہد الاسلام للدعوۃ والفکر الاسلامی'' کے قیام کا فیصلہ فرمایا، یہ معہد چار شعبوں میں تقسیم کیا گیا:

(۱) ممالکِ عربیہ (شرق اوسط) میں علمی وفکری طور پر دینی وایمانی دعوت

(۲) مذاہب کا تقابلی مطالعہ

(۳) حکمتِ ولی اللہی

(۴) اسلامی وتجدید تحریکات اور اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں۔ اس شعبہ کو مولانا نے بڑی اہمیت دی اور وقیع جامع، اور علمی نصاب تجویز کیا، یہ شعبہ اب تک سرگرم عمل ہے، مولانا نے اس میں جو قیمتی محاضرات (لکچرس) دئے تھے وہ **روائع من ادب الدعوۃ** (تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب) کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔

دنیا کے کونہ کونہ تک ندوہ کا تعارف، ایک کثیر اور بھاری تعداد کی ہر سال فراغت دینی ودعوتی ماحول کا میاب تعمیری ترقیات، مختلف شعبوں کا قیام، اور ان کو فعال بنانے کی پوری کوشش، غیر ملکی طلبہ کی کثرت اور ان کے لئے الگ کورس کا نظام، اخلاص اور علمی مہارت واختصاص پیدا کرنے کی کوشش، ذہنی، اعتقادی، فکری واخلاقی ارتداد وانتشار کے مقابلہ کے لئے مجلس تحقیقات ونشریات کی تاسیس، متعدد موضوعات پر کانفرنسوں اور سیمیناروں کا انعقاد، مکتبہ میں کتابوں اور مراجع کا بے انتہا اضافہ، طلبہ واساتذہ کے لئے تمام تر سہولیات، (جو اس ناچیز کے علم میں ہندوستان کے کسی اور دینی ادارہ میں بڑی مشکل سے مل سکتی ہیں) مولانا کے دورِ نظامت کی کچھ خاص جھلکیاں ہیں۔

حضرت مولانا تحریک ندوہ کے سب سے بڑے ترجمان ثابت ہوئے، عرب وعجم جہاں جہاں گئے اپنا یہی پیام پہنچایا، جو بڑا موثر ثابت ہوا۔

اس کے لئے مولانا نے مستقل رسالے تحریر فرمائے، مضامین ومقالات تحریر کئے، اور پوری وضاحت سے ندوہ کا تعارف کرایا، اور اس کے مقاصد واضح کئے۔

اس ناچیز کو خود ندوہ میں دو سال کا عرصہ گذارنے اور مولانا سے تلمذ کا شرف نصیب ہوا ہے، اس عرصہ میں مولانا کو بسا اوقات بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور ہر بار یہی محسوس ہوا کہ ندوہ کا پیغام وفکر مولانا کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہے، ان کے دل میں ندوہ کا عشق بسا ہوا ہے، اور ان کا ہر عمل اور ہر ادا اسی جامعیت واعتدال اور توازن کے جوہر سے

مالا مال ہے، جو اصلاً ندوہ کی تاسیس کے مقاصد ہیں، اور جنہیں عام کرنے اور پھیلانے میں مولانا نے اپنی پوری زندگی لگادی، اور ساری توانائیاں صرف کردیں، اور خونِ جگر سے اس گلستاں کی آب یاری کرتے رہے۔

علم وعمل، دین ودنیا، صلاح وتقویٰ، عصری تقاضوں، قدیم وجدید کی پوری جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا کے خطوط اور نقوش کے مطابق ویسے ہی افراد ورجال تیار کرنے کی ضرورت موجودہ دور میں شدت سے بڑھتی جارہی ہے، مولانا کے تلامذہ اور معتمدین یہ خدمت ندوۃ العلماء اور اس کے ملحق اداروں کے ذریعہ پوری قوت وجوش اور عزم واخلاص کے ساتھ انجام دے جارہے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ یہ فکر عام کی جائے، اور جہاں اس نہج پر کام شروع نہیں ہوا ہے، بلا تاخیر شروع کیا جائے، اور اس میں کسی مصلحت وانتظار کو روا نہ رکھا جائے۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں کاروانِ زندگی کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔

❐❖❐

حضرت مولانا علی میاںؒ کی

ادبی خدمات اور تصانیف

اس حقیقت کے اظہار میں کسی قسم کے تردد اور اور مبالغہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت مولانا علی میاںؒ بیسوی صدی میں عربی کے سب سے زیادہ نامور اور کامیاب غیر عرب ادیب تھے، ان کے یہاں جو قوت، جوش، حرارت، تاثیر و وجدان، معانی و الفاظ کا سیل رواں اور ڈھلی ڈھلائی عبارت پیش کرنے کا سلیقہ ملتا ہے، وہ ان کی کاوش، کوشش، جہد و عزم، وسعت مطالعہ و رسوخ فی العلم اور ماہر فن اساتذہ کی رہنمائی کا رہین منت ہے۔

(۱) تعلیم و تدریس

مولانا کی عربی تعلیم کا آغاز ۱۹۲۴ء کے اواخر میں شیخ خلیل بن محمد عرب استاذِ ادب لکھنؤ یونیورسٹی کے درس سے ہوا، یہ تعلیم ان کے اس خانگی مدرسہ میں ہوئی جو یونیورسٹی جانے سے قبل اور آنے کے بعد جاری رہتا تھا، مولانا کے ساتھ عرب صاحب کے برادرِ خورد حسین بن محمد بھی شریک درس تھے، یہی دو نفری جماعت تھی جس پر عرب صاحب کی ساری توجہ مرکوز رہا کرتی تھی، ابتدائی شُد بُد کے بعد عربی زبان کی پہلی کتاب ''المطالعۃ العربیۃ'' شروع ہوئی، عرب صاحب کا خود ساختہ نصاب تھا جس میں مصری نصاب کی جدید کتابیں ''**الطریقۃ المبتکرۃ، مدارج القراءۃ، کلیلۃ دمنۃ، مجموعۃ من النظم و النثر للحفظ و التسمیع**'' وغیرہ شامل تھیں، عرب صاحب کا انداز درس بڑا شگفتہ ہوا کرتا تھا، عملی مشق اتنی زیادہ کرائی جاتی تھی کہ اجنبی زبان کی ساری وحشت و ثقالت دور معلوم ہوتی تھی، ابن المقفع

کی ''کلیلة دمنة'' عرب صاحب کے نزدیک بہت معیاری اور معرکۃ الآراء کتاب تھی، اس کے پڑھانے کا بھی عجیب طرز تھا، مولانا کو دن بھر محنت کر کے پورا سبق تیار کرنا پھر آموختہ کی طرح سنانا پڑتا تھا، تصحیح عبارت، نحوی وصرفی وجوہ سے واقفیت، سوالوں کا جواب اور عبارت کا پورا مفہوم سمجھنا ضروری ہوتا، انشاء کی مشق بھی ہوتی تھی، عربی میں بولنا بھی لازم کر دیا گیا تھا، اُردو بولنے پر جرمانہ عائد ہوتا تھا، نحو کے ابتدائی مسائل کے لئے ابوالحسن الضریر کی جامع ومختصر کتاب ''الضریری'' بھی عرب صاحب نے پڑھائی، یہ اندازِ تعلیم مولانا کی استعداد اور قوتِ مطالعہ کی اصل کلید تھا، جس کی مدد سے ہر قفل کھلتا چلا جاتا تھا، ''کلیلة دمنة'' کے بعد ''مجموعة من النظم والنثر'' شروع ہوئی، عرب صاحب نے نظم کا حصہ پہلے پڑھایا اور اسے زبانی یاد کرایا، مولانا لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ زبانی یاد کیا ہوا حصہ اگرچہ فراموش ہو گیا؛ لیکن حافظہ اور ذوق میں وہ اس طرح تحلیل ہو گیا تھا کہ اس کے اجزاء واثرات جزءِ بدن ہو گئے اور تحریر وانشاء میں اس کا رنگ نمایاں ہوا، عرب صاحب کے طریقۂ تعلیم کی یہ بھی خوبی تھی کہ وہ اچھے الفاظ، تعبیرات ومحاورات کا اس طرح چٹخارا لیتے، ان کی لذت وحلاوت کا اس طرح اظہار کرتے کہ وہ ہم لوگوں کے دل ودماغ پر مرتسم ہو جاتے، اور ہم سمجھتے کہ ان الفاظ کا لطف لینا اور ان کی قدر ضروری ہے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کے ذہن پر یہ اثر قائم کرتے کہ یہ الفاظ وتعبیرات کسی کی ذاتی ملکیت نہیں اور نہ یہ سربمہر خزانہ ہیں، یہ ہر اُس شخص کی ملکیت ہے جو اس کو صحیح طریقہ پر استعمال کر سکے، بعض اوقات انہوں نے ہماری انشاء کی کاپیوں میں کسی محاورہ، ضرب المثل یا جملہ کے صحیح استعمال پر اپنی مسرت کا اظہار کیا، جیسے ہم لوگوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، اور بعض اوقات انہوں نے اس پر انعام بھی عطا کیا ہو''۔ (پرانے چراغ ۱/۲۱۶)

ادب کے متوسطات کی تعلیم کے بعد عرب صاحب نے اپنے دینی ذوق کے پیش نظر قرآن کا وہ حصہ پڑھانا شروع کیا، جس کا مرکزی مضمون توحید ہے، سورۃ الزمر اور اس کے بعد کی چند سورتوں کا درس دیا، صحیح مسلم کی کتاب المغازی بھی شروع کرائی، قرآن وحدیث

کے ان دو اسباق کے علاوہ باقی ہر وقت عربی ادب ہی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، عربی میں نثر پر زیادہ توجہ تھی، نظم نسبتاً کم پڑھائی جاتی تھی، نظم میں قصیدۂ بانت سعاد، دیوانِ حماسہ، عشر قصائد، شنفریٰ کا قصیدۂ لامیۃ العرب، معری کا دیوانِ سقط الزند شامل ہے، قدیم معیاری کتابوں میں عرب صاحب کو ''نہج البلاغۃ'' بھی بہت پسند تھی؛ لیکن انہوں نے صرف اس کا خطوط کا حصہ پڑھایا جو ادب عالی کا بہت کامیاب نمونہ ہے، مقاماتِ حریری عرب صاحب کو پسند نہ تھی؛ لیکن درسی ونصابی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے بیس مقامات پڑھائے، عبدالقاہر جرجانی کی کتاب ''دلائل الاعجاز'' اُن کی پسندیدہ کتاب تھی، جسے پڑھاتے وقت انہیں بڑا لطف اور وجد آیا کرتا تھا اور اس کا حق ادا کیا کرتے تھے۔ بحتری کی اشعار بھی بہت پسند تھے وہ بھی پڑھائے، تعلیم کے آخری مرحلہ میں مشہور صاحب طرز مصری ادیب مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی کتاب ''النظرات'' کا بھی عرب صاحب نے مطالعہ کرایا، مولانا کو اس کا اسلوب بے حد پسند آیا؛ بلکہ دل ودماغ پر چھا گیا، اور بہت سے مضامین میں اس کی تقلید بھی کی، عرب صاحب کا یہ امتیاز تھا کہ وہ پڑھاتے وقت گویا فنا فی الکتاب والدرس رہا کرتے تھے اور جمعہ کے علاوہ کسی اور دن کی رخصت کے روادار ہرگز نہ تھے، عرب صاحب کے اصولِ تعلیم کا یہ ضابطہ تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان وفن پر پوری توجہ مرکوز کر کے تعلیم حاصل کرنی چاہئے، یہ ضابطہ تجربات کی روشنی میں دوسرے سارے طریقوں کے مقابلہ میں کامیاب اور مفید ترین ثابت ہوا، حضرت مولانا نے عرب صاحب کے یہاں دو ڈھائی سال صرف عربی زبان وادب کی تعلیم ہی میں گذارے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''یہی ہمارا اوڑھنا بچھونا تھا، یہی ہمارا منتہائے نظر اور سرمایۂ زندگی، اسی میں کمال پیدا کرنا ہمارے نزدیک سب سے زیادہ کامیابی اور عزت کی بات تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے تمام قوائے فکریہ، ہمارے تمام حواسِ ظاہری وباطنی اس فن کے حصول اور اس کی ترقی میں مصروف اور مرکوز تھے، ہم اُن کے یہاں عربی بولتے تھے، عربی میں سوچتے اور لکھتے تھے اور یہی ہماری دنیا تھی''۔ (پرانے چراغ ۱/۲۱۷ مختصراً)

عرب صاحب کے طرزِ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

''اپنے ذوق ونظر کو اپنے طلبہ تک منتقل کردینے اور ان کے رگ وریشہ میں اتار دینے کی عجیب وغریب قابلیت، زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کردینے اور منصف کا ہم زبان اور ہم مذاق بنادینے کی ان میں وہ بے نظیر قدرت تھی جو ہزاروں میں سے کہیں کسی ایک استاذ اور ماہر فن میں ہوتی ہے، یہ قابلیت کسی نہیں؛ بلکہ وہبی ہے، عربی زبان وادب کا وہ ذوق سلیم وذوق صحیح، پھر اس ذوق کو منتقل کرنے کی وہ قابلیت جو عرب صاحب میں دیکھی وہ نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ علمی وعربی حلقوں میں بھی شاذ ونادر ہی شاید پائی جائے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۹۰-۹۱)

مزید لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ اس مدرسہ (خلیل عرب صاحب کے خانگی مدرسہ) سے ہندوستان میں عربی تعلیم اور عربی انشاء وتحریر کے اس نئے تدور کا آغاز ہوا، جس کو علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ وفضلاء نے نقطۂ عروج تک پہنچادیا''۔

(پرانے چراغ ۱/۲۰۹ مختصراً)

صرف ونحو کی بعض قدیم کتابیں میزان ومنشعب، صرف میر ونحو میر، پنج گنج وغیرہ مولانا نے اپنے چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنیؒ سے پڑھیں، اس کے علاوہ صرف ونحو کی مزید تعلیم اپنے مولانا سید محمد طلحہ حسنیؒ سے بھی حاصل کی، جو صرف ونحو کے امام تھے اور عملی مشق کرانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

''صحیح عبارت پڑھنے اور صرف ونحو کے ضروری مسائل کے جزوِ دماغ بن جانے میں ان کا بڑا دخل ہے، وہ ادبی نحوی صرفی غلطی، عبارت کا غلط پڑھنا معاف نہیں کرتے تھے، اور کئی کئی دن تک اس پر طنز فرماتے اور چٹکیاں لیتے رہتے، جس کی وجہ سے بڑا چوکنا اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا، عربی زبان وصرف ونحو کے علاوہ ان سے اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۱۰۱)

۱۹۲۷ء میں مولانا نے لکھنؤ یونیورسٹی کے فاضل ادب میں داخل لیا، داخلہ کے امتیان

میں کامیاب ہوئے، یہاں بھی پورے شعبہ پر عرب صاحب ہی چھائے ہوئے تھے، ۱۹۲۹ء میں مولانا نے فاضل ادب کا کورس مکمل کیا اور امتیازی نمبرات کے ساتھ سند حاصل کی، اس دوران مولانا نے اردو کے ادبِ عالی کی مشہور اور اہم کتابوں کا بھی مطالعہ جاری رکھا جس سے مولانا کو عصری زبان وتعبیر میں اپنی دعوتی وتصنیفی سرگرمیاں انجام دینے میں بڑی مدد ملی۔

۱۹۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی نے (جو عربی زبان وادب کے محقق عالم اور ذوق آفریں تھے) ندوۃ العلماء میں تدریسی ذمہ داریاں قبول کیں، مولانا نے ان سے باضابطہ دیوانِ نابغہ پڑھا، شرحِ شذور الذہب کے درس میں شریک ہوئے اور تفسیر قرآن میں استفادہ بھی کیا، اسی دوران مولانا نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ میں ایک اُردو مضمون کا ترجمہ عربی میں کیا، ہلالی صاحب نے تھوڑی سی تصحیح کے بعد اپنے تعارفی مکتوب کے ہمراہ علامہ سید رشید رضا مصری کے معروف مجلّہ ''المنار'' میں اشاعت کے لئے ارسال کردیا، علامہ رشید رضا نے وہ مضمون شائع کیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر صاحب مقالہ چاہیں تو میں اسے الگ رسالہ میں بھی طبع کرسکتا ہوں، تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مقالہ ''**ترجمة الامام السيد أحمد بن عرفان الشهيد**'' کے نام سے طبع ہوکر آ گیا، مولانا کی یہ پہلی تصنیف تھی جو ۱۶/سال کی عمر میں منظر عام پر آئی۔

مولانا کے برادرِ بزرگ اور مربی جناب ڈاکٹر سید عبد العلیؒ عربی اخبارات ورسائل کے مطالعہ کے بے حد شوقین تھے، اسی لئے بہت سے عربی رسائل وجرائد اور اخبارات ان کے پاس آتے تھے، مولانا نے ان کی مدد سے اخبارات پڑھنے شروع کئے، رفتہ رفتہ سمجھنے لگے اور اس سے تعبیر واظہارِ خیال میں وہ قدرت نصیب ہوئی، جو کسی اور کتاب سے نہیں ہوسکی، ان مجلّات میں دمشق کا اخبار ''**فتى العرب**'' اور فلسطین کا ''**ألجامعة الاسلامية**'' سرفہرست تھے، اس کے بعد مولانا نے متعدد عربی مضامین لکھنے شروع کئے، ۱۹۳۲ء میں ندوۃ العلماء سے عربی رسالہ ''**الضياء**'' شائع ہونا شروع ہوا، تو اس نے مولانا کے عربی ذوق اور

تحریری مشق پر مہمیز کا کام کیا، اور اس سے قلم میں روانی و جوانی پیدا ہوئی، اس دوران متعدد عربی رسائل اور تصنیفات کے مطالعہ کا شغف بھی رہا۔

پھر ۱۹۳۴ء میں جب مولانا ندوۃ العلماء کے استاذ منتخب ہوئے، تو عربی ادب کی بعض کتابیں آپ سے متعلق رہیں، جن میں دیوانِ حماسہ، القراءۃ الرشیدۃ، حکایات الاطفال وغیرہ ہیں، اس وقت ندوہ کی پوری فضا پر عربی زبان وادب، انشاء وخطابت چھائی ہوئی تھی۔ مشہور ادیب مولانا مسعود عالم ندوی کی رفاقت میں مولانا کی ادبی وعلمی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں، عربی زبان کی تعلیم میں عرب صاحب کی طرح گھول کر پلا دینے اور ہر طرح سے مشق کرانے کا اہتمام مولانا نے خوب خوب کیا، اس سلسلہ میں ہلالی صاحب کے برادرِ خورد شیخ محمد عربیؒ کا تعاون بھی حاصل رہا، عرب ادباء میں مولانا کو امیر شکیب ارسلان اپنی تحریروں کی اسلامیت اور پختگی کی وجہ سے پسند آئے؛ لیکن اس سے بھی زیادہ مولانا علی میاںؒ سید عبدالرحمٰن کواکبی کی تخیلی کتاب ''ام القریٰ'' سے متأثر ہوئے، جس میں امت اسلامیہ کے حقیقی امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز بڑی بالغ نظری اور باریک بینی سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد مولانا کی ادبی تحریری وتقریری سرگرمیاں تا آخر باقی رہیں، جن کی کچھ تفصیلات آرہی ہیں۔

(۲) عربی ادب کے نصاب کی ترتیب اور دیگر ادبی سرگرمیاں

ندوۃ العلماء کی تحریک کا ایک اہم مقصد ایسا نصاب تیار کرنا تھا، جس کے ذریعہ عربی زبان کو ایک زندہ اور جیتی جاگتی زبان کی طرح پڑھا جاسکے اور براہِ راست عربوں میں دعوت وتبلیغ کا کام کیا جاسکے، اس کی مکمل کوشش پورے طور پر منظم انداز میں سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے دورِ نظامت میں شروع ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے مصری وزارتِ تعلیم کی چند عربی ریڈروں کو داخل نصاب کرنا چاہا، چناں چہ مجلس انتظامی کی تائید سے

''القراءۃ الرشیدۃ'' اور کامل کیلانی کی ''حکایات الاطفال'' وغیرہ داخل درس کی گئیں؛ لیکن ایک بڑی خامی ان میں یہ تھی کہ یہ اگرچہ مبتدی طلبہ کی نفسیات اور زبان کی تعلیم کے جدید اصولوں کے مطابق مرتب کی گئی تھیں، مگر ان میں کوئی دینی اور اخلاقی تعلیم بالکل نہ تھی اور ہر صفحہ پر تصویریں بھی تھیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دل میں نئے نصاب کی ترتیب کا داعیہ بڑی تیزی سے پیدا ہوا، اس کام کا آغاز ''مختارات من ادب العرب'' کی ترتیب سے ہوا، جو قرنِ اول سے لے کر عصر حاضر تک کے عربی نثر وادب کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل ہونے کے ساتھ سجع وقافیہ، تصنع اور تکلف سے آزاد اور صالح مقاصد اور صحت مند خیالات کی آئینہ دار بھی ثابت ہوئی، یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں مکمل ہوئی، اور ۱۹۴۲ء میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی اور دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ میں ادبِ عربی کے نصاب میں داخل کی گئی، مشہور ادیب علی طنطاوی نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تأثرات یوں ظاہر کئے:

> ''اگر کسی ادیب کے ذوق کی دلیل اس کا انتخاب ہے، تو قارئین کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے کچھ عرصہ ہوا، ادبی منتخبات اور نمونوں کے مجموعوں کو جمع کیا؛ تاکہ اُن میں سے کسی کو ثانویات شرعیہ کے طلبہ کے سامنے رکھیں، ہماری کمیٹی کے ممبران نے (جو سب ادباء میں سے تھے) علیحدہ علیحدہ تلاش وجستجو شروع کی، اور اس موضوع کی کتابوں کا جائزہ لیا، آخر میں ہم سب متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ درسی منتخبات کے مجموعوں میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ مجموعہ مختارات ہے جو زبان کی اصناف اور ادب کے متنوع نمونوں کا سب سے جامع مجموعہ ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۱۱)

مختارات زیادہ تر جدید حلقوں اور یونیورسٹیوں کے ایم اے عربی کے کورس میں داخل ہوئی، جن میں علی گڈھ، الٰہ آباد، حیدرآباد، مدراس، دہلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیاں نمایاں ہیں، سعودی عرب کی وزارت تعلیم نے بھی اس کو اپنے یہاں کے نصاب میں داخل کیا، پاکستان

و بنگلہ دیش، عرب ممالک اور بعض مغربی ممالک میں بھی یہ داخل درس ہوئی؛ لیکن اس کتاب پر سب سے زیادہ جفاکس ستمگر نے کی، یہ مولانا کی زبان میں پڑھئے:

''البتہ اس کو ہمارے قدیم مدارس میں بڑی مشکل سے بار ملا، اور ملا بھی تو جلد اس کو چھٹی دے دی گئی، کہ ان حلقوں کا ردعمل ''انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال'' کے بجائے ''انظر الیٰ من قال ولا تنظر الی ما قال'' پر ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۱۲)

مولانا نے اس سلسلہ میں دوسری کتاب ''القراءۃ الراشدۃ'' مرتب کی، جو تین حصوں میں منظر عام پر آئی اور بے حد مقبول ہوئی، یہ اصلاً مصری ریڈر ''القراءۃ الرشیدۃ'' کا متبادل ہے۔ مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''کتاب میں اس کا التزام کیا گیا کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو؛ لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جارہی ہے، یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جارہا ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۱۴)

اس سلسلہ کا تیسرا اور سب سے اہم سلسلہ ''قصص النبیین'' کا ہے، جو کامل کیلانی کی حکایات الاطفال کا نعم البدل ہے، حکایات الاطفال میں تصویروں کے ساتھ لغو قصوں کا طومار ہے، جو اخلاقی لحاظ سے کسی بھی طرح مفید نہیں ہے، اس کام کی طرف مولانا کو مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے متوجہ کیا تھا، اس کتاب میں مولانا نے چند امور کا التزام کیا ہے، ایک تو یہ کہ الفاظ کا ذخیرہ (Vocabulary) کم سے کم ہو؛ لیکن اعادہ و تکرار سے اُسے ذہن میں نقش کردیا جائے، دوسرے یہ کہ کتاب کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے اور آیاتِ قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑدی جائیں۔ تیسرے یہ کہ اسلام کے بنیادی عقائد (توحید، ورسالت اور معاد) کی تلقین و تعلیم ضمناً ہوجائے۔ چوتھے یہ کہ قصوں کو پھیلا کر لکھا جائے اور اُن میں ایسی رہنمائی کا سامان ہو کہ بچوں کے دلوں میں کفر و شرک کی نفرت، ایمان و توحید کی محبت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت راسخ ہوجائے اور یہ سب غیر شعوری طریقہ پر ہو۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۱۶-۲۱۷ مختصراً)

یہ سلسلہ بے حد مقبول ہوا، اس کے دوسرے ایڈیشن پر مشہور ادیب ومجاہد سید قطب شہید کا مقدمہ شائع ہوا جو بے حد مؤثر ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ:

''میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں اور جن میں انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے حکایات وقصص بھی شامل ہیں، خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی ہے، جو ''القصص الدينية للاطفال'' کے نام سے مصر میں مرتب ہوا، اور جس کے لئے مواد قرآنِ مجید سے اخذ کیا گیا تھا؛ لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ''قصص النبيين للاطفال'' کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے؛ اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصہ کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آ گئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۱۸)

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے اس سلسلہ کو بچوں کا علم کلام قرار دیا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے بھی لکھا ہے کہ:

''اس کتاب میں زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا ہے جیسے گوشت اور ناخن''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۱۷)

یہ کتاب عالم عربی کے متعدد جامعات میں داخل ہوئی، برصغیر کے مدارس وجامعات نے دل کھول کر اس کا استقبال کیا اور داخل درس کیا؛ لیکن وہی طبقہ یہاں بھی مولانا کی تکلیف کا سبب بنا۔ مولانا کی زبان میں:

''اگر مصنف کو اپنی کسی کتاب کے داخل نصاب نہ ہونے پر استعجاب اور دوستانہ شکوہ ہوسکتا ہے، تو اس کتاب پہ کہ وہ زبان آموزی اور دینی تلقین کا بیک وقت کام کرتی ہے؛ لیکن جماعتی اور مدرسی عصبیت بڑے بڑے حقائق پر پردہ ڈال دیتی ہے، تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں جدید تعلیمی ادارے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوا ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۱۸)

مولانا دریا آبادی نے اس سلسلہ کو (جو تیسرے حصہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ تک آ کر رک گیا تھا) مکمل کرنے پر اصرار کیا، مگر یہ سلسلہ بہت دنوں تک موقوف رہا اور تقریباً تیس سال بعد ۱۹۷۵ء میں ماہِ رمضان المبارک میں اس کی تکمیل کا داعیہ مولانا میں پیدا ہوا، اور چوتھے اور پانچویں حصہ کی تکمیل ہوئی، پانچواں حصہ سیرت رسول اللہ سے متعلق ہے اور ضخیم ہے، یہی آگے چل کر مولانا کی مشہور کتاب ''السیرۃ النبویۃ'' (نبی رحمت) کا محرک ثابت ہوا۔

قصص النبیین کا یہ سلسلہ 'ادب الاطفال' کے خلا کو پر کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوا اور کوئی بدل ابھی تک اس کا سامنے نہیں آ سکا ہے، نصابِ تعلیم کے تعلق سے دیگر فضلاء ندوہ نے بھی کام کیا ہے، اور کتابیں تیار کی ہیں۔ جن میں: **تاریخ الادب العربی، الادب العربی بین عرض ونقد، معلم الانشاء، منثورات، مختار الشعر العربی، تمرین الصرف والنحو، علم التصریف** وغیرہ نمایاں ہیں۔

قصص النبیین کے سلسلہ کے علاوہ مولانا کی ایک کتاب ''قصص من التاریخ الاسلامی'' بھی ادب الاطفال ہی کے سلسلہ کی چیز ہے، ادب الاطفال (Children's Literature) کے علاوہ ادبِ نبوی کو واضح کر کے پیش کرنے میں بھی مولانا کا اہم رول رہا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی ان احادیث کو مولانا نے منتخب کر کے اپنی کتابوں میں جمع کر دیا ہے جن میں صدق واخلاص، جمال وبلاغت، شیرینی وچاشنی، ساتھ ہی پیغمبرانہ بلاغت واعجاز کے عناصر پوری طرح ملتے ہیں، مولانا نے انتخاب میں صحت سند کا بڑا اہتمام کیا ہے، یہ احادیث ادبِ عربی کا سب سے کامیاب نمونہ ہیں۔

ادبِ اطفال اور ادبِ نبوی کے علاوہ تیسری قسم مناجات اور دعاؤں کے ادب کی ہے، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جن دعاؤں کا ذکر ہے، ان کی تاثیر، جمال اور بلاغت وجاذبیت بے نظیر ہے، یہ دعائیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی قطعی دلیلیں

اور مستقل معجزے ہیں، جو کسی انسان کے بس میں نہیں، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا نور، آپ کی بندگی وسادگی، عجز وانکساری اور خشوع وخضوع سب کچھ واضح ہوجاتا ہے، اور ان سے دعا ومناجات کے طریقے اور اسالیب اخذ کئے جاسکتے ہیں، اس کے مختلف نمونے مولانا نے ذکر کئے ہیں، یہاں ہم ان میں سے ایک نقل کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے:

اللّٰھم انک تسمع کلامی وتریٰ مکانی وتعلم سری وعلانیتی، لا یخفیٰ علیک شیءٌ من امری، وأنا البائس الفقیر، المستغیث المستجیر، الوجل المشفق، المقر المعترف بذنوبی، أسألک مسألة المسکین، وأبتھل إلیک ابتھال المذنب الذلیل، وأدعو لک دعاء الخائف الضریر، دعاء من خضت لک رقبتہ، وفاضت لک عبرتہ، وذل لک جسمہ، ورغم لک أنفہ، اللّٰھم لا تجعلنی بدعائک شقیاً وکن بی رؤوفاً رحیماً یا خیر المسؤلین ویا خیر المعطین.

الٰہی! تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، میرے پوشیدہ وظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بے کس سوال کرتے ہیں، تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے، اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے، جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو، اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہوں، اے اللہ! تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہوجا، اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر

اے سب دینے والوں سے اچھے۔

مولانا لکھتے ہیں:

''کیا خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی ناتوانی و بے نوائی اور فقر و احتیاج، عجز و مسکنت کے اظہار و اقرار کے لئے اور رحمتِ خداوندی کو جنبش میں لانے کے لئے ان سے زیادہ پر تاثیر، پر خلوص اور دل نشین الفاظ انسانی کلام میں مل سکتے ہیں؟ اور اپنے دل کی کیفیت اور عجز و مسکنت کا نقشہ الفاظ میں اس سے بہتر کھینچا جا سکتا ہے؟ یہ الفاظ تو دریائے رحمت میں تلاطم پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں، آج بھی ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے دل امڈ آتا ہے، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور رحمتِ خداوندی صاف متوجہ معلوم ہوتی ہے''۔ (دعائے خیر البشر ۱۸-۱۹، از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

اس انداز میں مولانا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و مناجات کا ذکر کیا ہے اور اس کے ادبی مقام کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، واقعہ ہے کہ ادب میں صداقت و خلوص کا عنصر حقیقی روح پیدا کرتا اور اسے بقائے دوام بخشتا ہے، اور یہ عنصر جس طرح دعا و مناجات میں ملتا ہے کسی اور صنف ادب میں نہیں ملتا۔

چوتھی قسم سفرناموں کے ادب کی ہے، مولانا نے اس موضوع پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ان کے ذاتی تجربات کا نچوڑ ہے، مولانا نے مشرق و مغرب کے متعدد اسفار کئے ہیں، جن کی تفصیلات ان کی خودنوشت سوانح حیات: کاروانِ زندگی ''فی مسیرۃ الحیاۃ'' اور ان کے سفرناموں ''مذکرات سائح فی الشرق العربی'' (شرق اوسط کی ڈائری) ''من نھر کابل الی نھر الیرموک'' (دریائے کابل سے دریائے یرموک تک) اور ''اسبوعان فی ترکیا'' (دو ہفتے ترکی میں) وغیرہ میں ملتی ہیں۔

ادب کی اس صنف میں مولانا نے زائر و سیاح کو معاشرہ اور سماج کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے، واقعات و مشاہدات کا اپنی قلبی واردات و افکار اور احساسات و جذبات نیز خیالات کی روشنی میں مخلصانہ اور ہوش مندانہ تجزیہ کرنے کی دعوت دی ہے، مولانا کی تصنیف

''مذکرات سائح فی الشرق العربی'' میں یہ نہج بے حد نمایاں ہے جس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ادیب اپنے تبصرہ وتجزیہ کے ذریعہ سفرنامہ کو مؤثر ترین بنا سکتا ہے اور اس میں جان ڈال سکتا ہے۔ ایک سفرنامہ کی ادبی حیثیت اسی وقت مسلم ہوسکتی ہے کہ جب اس میں سیاح کے دل کی دھڑکنیں اور ضمیر کی سرگوشیاں محسوس ہوں اور مشاہدات وواقعات کے ذکر کے ساتھ نفسیاتی اثرات، ردِعمل، افکار وخیالات بھی بے کم وکاست، کسی احتیاط وتکلف کی رعایت کے بغیر مذکور ہوں، یہی وہ عنصر ہے جو سفرنامہ کو ادب بناتا ہے اور اسی کی رعایت ودعوت حضرت مولانا علی میاںؒ کے ہاں ملتی ہے۔ (مقدمہ: مذکرات سائح فی الشرق العربی)

پانچویں قسم سیر وسوانح کا ادب ہے، سیر وسوانح ایک مستقل فن ہے جس کی کچھ شرطیں مولانا نے بیان کی ہیں، ہم اس کا مختصراً ذکر کرتے ہیں:

(۱) سیرت وسوانح کا کام شروع کرتے وقت اس کام کے لئے کوئی اہم محرک وداعی (مثلاً قلبی رغبت، ضمیر کی آواز، جذبۂ دفاع، اعترافِ حق، محبوبیت، فضل وکمال سے متأثر ہونا وغیرہ) ضرور موجود ہونا چاہئے، یہ محرکات نہ ہوں تو تحریر بے وزن اور بے قیمت ہوجاتی ہے۔

(۲) صاحب سوانح کی صحبت میں رہ کر یا واقعات واخبار کے علم اور غیر جانب دارانہ مطالعہ کے ذریعہ اس سے گہری اور ناقدانہ واقفیت بھی اہم شرط ہے، سوانح نگار اور صاحب سوانح کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق بہرحال ضروری ہے، جس کی بنیاد پر سوانح نگار صاحب سوانح کی خصوصیات سے واقف ہو اور اس کے حالات وواقعات کا امانت داری کے ساتھ جائزہ لے۔

(۳) الفاظ ومعلومات کا ایسا خزانہ بھی ہونا لازمی ہے جس کی مدد سے سوانح نگار اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح بیان کرنے پر قادر ہوسکے۔

(۴) احساسِ ذمہ داری وامانت ودیانت اور صاحب سوانح کی شخصیت کی قدر وقیمت، قدوقامت اور مرتبہ ومنزلت کے اظہار کی پوری قدرت بھی ضروری ہے۔

(۵) سوانح نگار یہ حقیقت بھی ذہن نشیں رکھے کہ الفاظ کا ایک درجہ حرارت (Temperature) ہوتا ہے، اس کی پوری رعایت کی جائے اور "أنزلوا الناس منازلھم" کے اصول پر پورا عمل ہو، افراط وتفریط اور غلو ومبالغہ سے ذرا بھی کام نہ لیا جائے۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ شخصیات پر کچھ لکھنا آسان کام نہیں جوئے شیر لانے اور پتہ مارنے کے مرادف ہے، مولانا کو چوں کہ خود اس کا تجربہ تھا اور وہ اس راستہ سے بڑی احتیاط اور خوش اسلوبی سے گذرے تھے، سوانح نگاری ان کی تصنیفات میں بہت نمایاں ہے، تاریخ نگاری اور تاریخ سے شغف ان کی زندگی کا روشن باب ہے، اس لئے مولانا کے یہ تجربات اور اصول بڑے کارآمد اور بنیادی ہیں۔

چھٹی قسم مقدموں کے ادب کی ہے، کسی معاصر مصنف یا بلند پایہ عالم یا رفیق کی تصنیف پر مقدمہ لکھنا صرف ایک تقلیدی عمل نہیں ہے، جسے رواداری اور مروّت کے تقاضے نبھانے یا مؤلف وناشر کی دل جوئی کرنے اور خواہش پوری کرکے خوش کرنے کے لئے انجام دیا جائے؛ بلکہ یہ تو ایک گواہی ہے جس کے آداب، احکام اور ذمہ داریاں ہیں، یہ شہادت اگر ٹھیک ٹھیک نہ دی جائے، کتاب کا علمی جائزہ نہ لیا جائے، تو اس سے کتاب کی علمی قدر وقیمت گھٹ جاتی ہے، مقدمہ محض تعریف اور مدح سرائی کا نام نہیں ہے؛ بلکہ اس میں کتاب کے موضوعات ومقاصد، مؤلف کے مقام وحالات، اس کی علمی وعقلی نشوونما، تالیف کے محرکات واسباب کا ذکر اور مؤلف کی کامیابی وناکامی کا تفصیلی جائزہ سب کچھ ہونا چاہئے، اس لئے مقدمہ نگار کو کتاب کے موضوع اور مؤلف سے تعلق ہونا چاہئے؛ تاکہ اسے مؤلف کے عقلی، علمی، فکری وجذباتی نشوونما، موضوع کے ساتھ اس کے تعلق وانصاف اور محنت وکامیابی کا اندازہ ہوسکے، اس سے واقف ہوئے بغیر مقدمہ نگاری بامقصد اور منصفانہ نہیں ہوسکتی۔ حضرت مولانا نے جو قیمتی مقدمات تحریر فرمائے ہیں ان میں یہی اصول اپنایا ہے اور اسی کی دعوت بھی دی ہے۔

اس کے علاوہ دیگر اصنافِ ادب (جن میں شعر ونظم کا خصوصاً استثناء ہے) میں بھی

مولانا کی تحریریں موجود ہیں۔

مولانا کا عربی اسلوب پرکھنا ہم جیسوں کے بس کی بات نہیں، عربی کے چوٹی کے ادباء نے مولانا کے اسلوب کی رفعت و پاکیزگی، بلاغت وروانی اور حلاوت و جمال کی داد دی ہے۔ علامہ عبدالعزیز میمن نے مولانا کے بارے میں یہ فرمایا کہ: ''عربی زبان پر لکھنے کی جو قدرت مولانا علی میاں کو حاصل ہے وہ ہندوستان میں کسی کو میسر نہیں''۔

اردو ادب میں بھی مولانا کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے، جس کا اندازہ برصغیر کے مشہور اردو ادباء کے اعتراف سے کیا جاسکتا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کئی بار یہ اعتراف کیا کہ مولانا اردو بڑی اچھی لکھتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ: ''ذاکر حسین صاحب کا کسی کی انگریزی یا اُردو کے بارے میں یہ رائے رکھنا میرے نزدیک مصنف کے لئے بڑی معتبر سند ہے''۔ (پرانے چراغ ۱۸۰/۲)

رابطۂ ادبِ اسلامی کا قیام اور سرگرمیاں

حضرت مولانا علی میاںؒ نے ادب کو پیشہ اور فن کے طور پر اپنانے، محدود ومخصوص کرنے، عبارت آرائی وتزئین کے ذریعہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے، اپنی مہارت وکمال کا سکہ بٹھا کر اپنے مادی مقاصد کی تکمیل کی ہمیشہ مخالفت کی، مولانا ایسے ادب کو صرف صنعت وفن کاری اور تقلید سمجھتے ہیں جو زور وشور، روح، جدت وندرت اور دل آویزی کے جوہر سے خالی ہوتا ہے، یہ روایتی ادب ہے جو اس وقت رائج ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک اور ادب ہے جو فطری، رواں، سلیس، دل آویز اور قلب وروح کو تسخیر کر لینے والا ہے، اس ادب سے مکتبے پُر ہیں؛ لیکن مصنوعی ادب اس لئے چھا گیا ہے کہ یہ رواں اور سلیس ادب ان افراد کا شاہ کار ہے جو ادباء کی وردی میں نہیں ہیں، اور جنہوں نے ادب کو ذریعہ معاش اور پیشہ نہیں بنایا، اور اس کی تاریخ بھی قدیم ہے؛ کیوں کہ

مکاتیب وخطوط اور قصوں کہانیوں کے تقلیدی ادب کی تدوین سے بہت پہلے ہی حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ فطری اور سحر انگیز ادب مدون ہو چکا تھا؛ لیکن ادب کے مؤرخین اور تحقیق وریسرچ کا کام کرنے والوں نے اپنی ساری توجہ تقلیدی اور روایتی ادب پر مرکوز کردی، وہ اسی زنداں کے اسیر اور اسی لکیر کے فقیر رہے جو استاذِ اول نے کھینچ دی تھی، اس طرح اُس ادب پر پردہ پڑا رہا جس سے عربی زبان کی صلاحیت وبرتری اور اس کی گہرائی ظاہر ہوتی ہے، اور اہل زبان کا کمالِ فن ''ملکہ'' اور زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، اور درحقیقت وہی ادب کی اولین اور حقیقی تربیت گاہ ہے۔ اوپر ادبِ نبوی کا ذکر آیا ہے کہ وہ مولانا کی توجہ کا مرکز شروع سے رہا ہے اور اس موضوع پر مولانا کے مقالات بھی ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں دمشق کی معروف علمی اکیڈمی ''المجمع العلمی'' نے مولانا کو رکن منتخب کیا تو مولانا سے مضمون کا مطالبہ کیا، مولانا نے ''عربی زبان کا کتب خانہ از سرنو کھنگالنے کا محتاج ہے'' کے عنوان سے عربی ادب اور اس کی تاریخ کے دوبارہ جائزہ اور ان ہیرے جواہرات کو سامنے لانے کی ضرورت پر مضمون لکھا جو خزف ریزوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں، مولانا ادب برائے ادب ''الفن للفن'' (Anb ism) کے داعی وقائل کبھی نہیں رہے، انہوں نے ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی کا ہمیشہ برملا اعلان کیا، مولانا نے ادب کو دعوتِ اسلامی کا سب سے اہم وسیلہ سمجھا اور عقیدہ وجوش، جذبہ واخلاص اور صدق کی بنیادوں پر ادب اسلامی کے فروغ ورواج کی آواز سب سے پہلے ۱۹۵۷ء میں لگائی، یہ وہ آواز تھی جو رفتہ رفتہ تحریک بنی اور پھر عالمی رابطہ ادبِ اسلامی کی شکل میں سامنے آئی۔

رابطہ ادبِ اسلامی کا قیام مشہور ادیب ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا کی تحریک ودعوت پر منظم شکل میں سامنے آیا، پاشا صاحب نے اپنی معروف کتاب: ''**نحو مذهب اسلامي في الأدب و النقد**'' میں لکھا ہے کہ:

''ادب میں ایک اسلامی مدرسہ بنانے اور قائم کرنے کی صدا سب سے پہلے ہم نہیں

لگا رہے ہیں، ہم مسلمانوں کے بلند پایہ ادباء واہل کمال کی پیروی کر رہے ہیں۔اس موضوع پر سب سے پہلے جس نے لکھا اور توجہ دلائی وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذاتِ گرامی ہے، یہ کام مولانا نے دمشق کی ''المجمع العلمی'' کی رکنیت کے بعد کیا، آپ نے ایک مقالہ پیش کیا جس میں ایک اسلامی ادب قائم کرنے اور اس پر توجہ دینے کی دعوت دی، اس طرح مولانا اس کام کے سب سے پہلے داعی اور محرک ہیں، مولانا کے بعد سید قطب شہید، محمد قطب، نجیب کیلانی، عماد الدین خلیل وغیرہ نے بھی اس کام کو آگے بڑھایا''۔

(نحو مذہب اسلامی فی الادب والنقد ۹۴-۹۵)

مئی ۱۹۸۴ء میں مکۃ المکرّمہ میں مولانا سے سعودی عرب کے ممتاز علماء کا ایک وفد ملا، جس میں ڈاکٹر عبدالباسط بدر، استاذ حیدر غدیر، ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح اساتذۂ جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض وجامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ شامل تھے۔ان حضرات نے مولانا سے رابطہ ادب اسلامی کے اغراض ومقاصد کا ذکر کیا، اس کے آئین کا مسودہ پیش کیا اور مولانا سے اس کی سربراہی قبول کرنے اور اسے بین الاقوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کرنے کی اجازت چاہی، یہ بھی طے ہوا کہ عرب دانشوروں کی ایک مجلس بنادی جائے اور عالم عربی کے تمام علاقوں سے ادباء واہل قلم کو شریک کیا جائے، یہ بھی طے ہوا کہ اس کا ہیڈ آفس ندوۃ العلماء لکھنؤ ہوگا، نائب صدر ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح اور جنرل سکریٹری مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ ہوں گے، اس سے پہلے اپریل ۱۹۸۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار ''مذاکرۂ ادبیات اسلامی'' کے عنوان سے ندوۃ العلماء میں ہو چکا تھا، جس میں اہم موضوع ''عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کی ادبیات میں اسلامی عناصر کی تلاش'' تھا، یہ دعوت وتحریک بہت مقبول ہوئی، علماء وادباء عرب اور مفکرین برصغیر کا ایک ممتاز ومؤقر وفد بڑی تعداد میں شریک ہوا، مولانا نے اس موقع پر جو خطاب کیا وہ بے حد فکر انگیز تھا، اس سیمینار میں ادب کے راستہ سے آنے والے الحاد وتشکیک اور فحاشی وعریانیت کے سیلاب کی روک تھام پر زور دیا گیا جو مصر میں خصوصاً بڑی قوت سے بہہ رہا تھا، اور ادب کو تخریب کے بجائے تعمیر کے

لئے استعمال کرنے، عربی ادب وانشاء اور تنقید وتاریخ ادب کو صحیح رخ دینے، جدید نسل کو صالح غذا پہنچانے کے لئے ایک نیا ذخیرۂ کتب اور ایک جدید مکتب خیال پیدا کرنے اور منتشر الذہن، ضعیف العقیدہ اور غیر جانب دار ادباء کی اجارہ داری ختم کرنے کی آواز اٹھائی گئی، اسی میں رابطہ ادب اسلامی کا خاکہ سامنے آیا، جو ۱۹۸۴ء کے اخیر میں اس کی مجلس عاملہ کا پہلا مشاورتی اجتماع ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، جو بے حد کامیاب رہا۔ جنوری ۱۹۸۶ء میں رابطہ ادب کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں رابطہ کے دستور اساسی کو آخری شکل دی گئی، تنظیمی انتخابات ہوئے اور حضرت مولانا کو تاحیات صدر منتخب کیا گیا، اس موقع پر عالم عرب کے بعض ادباء وشعراء موجود تھے جن میں معروف شاعر عمر بہاء الامیری قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں اور اداروں کے ممتاز مفکرین وعلماء بھی شریک ہوئے، مولانا نے اپنا مقالہ ''ہندوستان کا اسلامی ادبی اسکول'' کے عنوان سے پیش کیا، جس میں خصوصیت سے یہ ذکر کیا گیا کہ عرب ممالک اور دیگر اسلامی ملکوں میں بدقسمتی سے دینی عنصر ادب کے میدان سے دور ہو گیا ہے؛ لیکن ہندوستان کا اُردو ادب اس سے بڑی حد تک مستثنیٰ ہے، مولانا نے اپنے مقالہ میں علامہ شبلی نعمانی، حالی، محمد علی جوہر، اقبال اور دیگر ادباء وشعراء کے تذکرے اور ان کی اسلامیت کی طرف اشارے بھی کئے۔ جون ۱۹۸۶ء میں رابطہ کا عالمی اجلاس استنبول (ترکی) میں منعقد ہوا، مولانا نے اپنے خطاب میں ترکی کے اسلامی ادب میں انقلابی اور قائدانہ کردار ادا کرنے کے سلسلہ میں مولانا جلال الدین رومی اور ان کی مثنوی کی تاثیر کا ذکر کیا، دوسرے خطاب میں مولانا نے اقبال کی معرکۃ الآراء نظم ''طلوع اسلام'' کو موضوع بنا کر گفتگو کی اور اقبال کا یہ شعر پڑھا:

عطا مؤمن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

فروری ۱۹۸۷ء میں ''اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات'' کے عنوان سے رابطہ

ادب کا ایک سیمینار جے پور میں منعقد ہوا، یہ سیمینار رابطہ کی ہندوستانی شاخ کے زیر اہتمام تھا، متعدد وقیع مقالات اس میں پیش کئے گئے، حضرت مولانا نے سیمینار میں جو تقریر فرمائی وہ مغرب کے پورے فکر ونظام پر ایک ناقدانہ تبصرہ تھا، بہت مؤثر ثابت ہوئی، آخر میں تقریر میں مولانا نے احتسابِ کائنات اور وقیع ووسیع علمی وتحقیقی کاموں کی طرف توجہ دلائی۔

نومبر ۱۹۸۷ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک عظیم سیمینار ''اُردو ادب پر حضرت سید احمد شہید کی تحریک کا اثر'' جیسے اہم موضوع پر منعقد ہوا، موضوع کی مناسبت سے مقالات وخطبات پیش کئے گئے، مولانا نے بھی تحریک سید احمد شہید اور اس کے دائرۂ کار اور اثرات کا جائزہ لیا۔

اگست ۱۹۸۹ء میں ترکی میں ''رابطہ ادب اسلامی'' کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں عالم عرب کے بڑے وفود نے شرکت کی، مولانا نے ادب کی حقیقت اور اس کے اصل کردار کے عنوان سے خطاب کیا اور ادب واخلاق کے رشتہ کو مضبوط تر کرنے کی دعوت دی، اس سیمینار میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مدیر ''البعث الاسلامی'' نے مولانا کی تصنیف ''قصص النبیین'' کے پانچوں حصوں کی فنی وادبی خصوصیات پر ایک مقالہ پیش کیا، جسے بڑی توجہ سے سنا گیا، اس سیمینار میں اسلامی ادب اور تعلیمات کی روشنی میں بچوں کے ادب پر بین الاقوامی انعامی مقابلہ کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۹ء میں حیدرآباد میں رابطہ ادبِ اسلامی کا پانچواں مذاکرۂ علمی منعقد ہوا، مولانا نے اپنا خطبہ صدارت ''تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادبِ اسلامی کا حصہ'' کے عنوان سے پیش کیا، اس کے علاوہ متعدد علمی مقالات بھی سنائے گئے۔

اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ''حمد ومناجات'' کے عنوان سے رابطہ کا ایک تاریخی سیمینار رائے بریلی میں بلایا گیا، مولانا نے اپنا خطبہ ''حمد ومناجات اور ان کی دینی وادبی قدر وقیمت'' کے عنوان سے پیش کیا جو بہت مؤثر ثابت ہوا۔

اکتوبر ۱۹۹۱ء میں بھوپال میں رابطہ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں دعوتی واصلاحی ادب

کے عنوان سے متعدد مقالے پیش کئے گئے، حضرت مولانا نے اپنے خطاب میں ادب کی انقلاب آفرینی اور غیر معمولی تاثیر اور بقائے دوام کے لئے سوز وساز اور جذب وخلوص کو لازماً اختیار کرنے کی دعوت دی۔ مولانا نے فرمایا:

''یہ بھی تاریخ کا عجیب معمہ ہے کہ جس طبقہ کو سب سے زیادہ حقیقت شناس، فراخ دل اور متوازن ہونا چاہئے تھا، اسی طبقہ نے کوتاہ نظری اور تنگ دلی کا مظاہرہ کر کے خود کو حرف ونقش میں قید کرلیا ہے، جن لوگوں کا قلب وجگر جمال وکمال سے آراستہ ہونا چاہئے تھا، انہوں نے ہی ادب کو چند محدود اصطلاحات اور مقاصد تک محدود کرلیا ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر''

(کاروانِ زندگی ۵۴/۵)

اگست ۱۹۹۳ء میں استنبول میں رابطہ کا ایک اجلاس ہوا، جس میں مولانا نے عملی طور پر ادبِ اسلامی کا نمونہ بننے کی دعوت دی، اس کے علاوہ جو اہم سیمینار رابطہ ادبِ اسلامی کے زیر اہتمام ہوئے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

اپریل ۱۹۹۴ء میں ''حدیث نبوی کے ادبی مقام وامتیازات'' کے عنوان سے جامعہ سلفیہ بنارس کا سیمینار۔

اپریل ۱۹۹۵ء میں ''ادب میں سفرناموں کی اہمیت'' کے موضوع پر اورنگ آباد میں سیمینار۔

نومبر ۱۹۹۵ء میں اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کی دعوت پر رابطہ کا اجلاس، بموضوع ''سوانحی ادب وتذکرہ نگاری''۔

اگست ۱۹۹۶ء میں ترکی میں رابطہ کا عظیم سیمینار اور اسی کے تحت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ایک اعزازی اجلاس۔

نومبر ۱۹۹۶ء میں حیدرآباد میں رابطہ کا مذکرۂ علمی بموضوع ''ملفوظات ومواعظ ادب

کے آئینہ میں''۔

۴/۵/۶/ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو پٹنہ میں رابطہ کا اجلاس، پھر ۲۴-۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۷ء ہی کو لاہور میں رابطہ کا تاریخی بین الاقوامی سیمینار بموضوع ''حرمین شریفین کے سفرنامے جدید تحدیات کے تناظر میں''۔

جون ۱۹۹۸ء میں پونہ کا سیمینار بموضوع ''تاریخ نویسی کا جائزہ ادب کے تناظر میں''۔

فروری ۱۹۹۹ء میں بنگلور میں ''ادبِ اسلامی میں قصہ نگاری'' کے عنوان سے منعقدہ سیمینار۔

ان سارے سیمیناروں میں مولانا شریک رہے، ہندوستان کے علاوہ رابطہ کی شاخیں پاکستان، بنگلہ دیش، ملیشیا، انڈونیشیا، ترکی، ساؤتھ افریقہ، مغرب عربی کے ممالک، سعودیہ عربیہ، مصر، اردن، ہر جگہ قائم اور مصروفِ عمل ہیں، دین کو ادب، فکر، سیاست، اقتصاد سے اور تمام عملی گوشوں سے الگ کرنے کی جو دشمنانہ سرگرمیاں جاری ہیں ان کا مقابلہ رابطہ ادب نے مولانا کی قیادت میں بڑی شدت سے کیا ہے، اور ادب کا اسلامی رجحان عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کا ایک بہت بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ قول وعمل کے جامع تھے، جس ادب کے فروغ کا انہوں نے پیغام دیا اسے برت کر دکھایا، اسی جامعیت کو مولانا کے تلامذہ منتسبین اختیار کررہے ہیں، اور یہی ذمہ داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس کا ادب وعلم سے کوئی بھی رشتہ ہو کہ علم کی اصل روح عمل ہے، ادب وعلم اگر جوہر عمل سے خالی ہوں تو وہ ان کھوکھلے درختوں کی طرح ہوجاتے ہیں جن کو اندر سے گھن لگ گیا ہو۔ شیخ سعدیؒ نے بھی اسی کو بیان کیا ہے:

علم چنداں کہ بیشتر خوانی
چوں عمل در تو نیست نادانی

مولانا کی اہم تصانیف، ترجمے اور خصوصیات

حضرت مولانا تین سو سے زائد کتابوں اور رسائل کے مصنف ہیں، عربی میں ۱۷۷ر تصانیف ہیں، سب سے پہلی باضابطہ عربی تصنیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' (مطبوعہ ۱۹۵۰ء) ہے، اور اردو کی سب سے پہلی تصنیف ''سیرتِ سید احمد شہیدؒ (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) ہے۔

مولانا کی ان تصانیف نے ایک دنیا کو متأثر کیا، ان کی قابل فخر تصنیفات میں ''ماذا خسر العالم'' اپنے مضامین ومشمولات کی جامعیت، نزاکت واعتدال اور اسلوبِ بیان کی سحر آفرینی اور اثر اندازی کی وجہ سے اسلامی دنیا میں ایک فکری اور عملی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، یہ صرف ایک کتاب نہ تھی، ایک نسخۂ شفا تھا جس سے مریضوں نے اپنا مرض پہچانا، علاج کیا اور بیماری دور کی، ایک مدرسہ اور مکتب فکر کی اساس تھی جس کے زیر سایہ ہزاروں تلامذہ اور منتسبین تیار ہوئے اور یہ فکر دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچانے میں لگ گئے، کتاب پڑھئے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک آبشار ہے جس سے جھرنے بہہ رہے ہیں، نگہِ بلند، سخنِ دلنواز اور جانِ پرسوز کے جو اوصاف کسی بھی میر کارواں کا رختِ سفر، زادِ راہ اور سرمایۂ حیات ہوتے ہیں، وہ حضرت مولانا کی شخصیت میں، کردار میں اور تصانیف میں خصوصاً ''ماذا خسر العالم'' میں بہت نمایاں طور پر محسوس کئے جاسکتے ہیں، کتاب کے صفحہ صفحہ سے مولانا کے دل کا گداز، فکر کی سلامتی اور پاکیزگی، معلومات ومطالعہ کی وسعت، عالم اسلام کے حالات کا باریک بینی سے جائزہ اور تمام مسائل ومشاکل کے حل کی بے لوث کوشش، مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری اور فرائض یاد دلانے کا ذوق وجذبہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ ''ماذا خسر العالم'' میں ایک مضمون ''محمد رسول اللہ روح العالم العربی'' کے عنوان سے ہے، یہ کتاب کا سب سے جاندار اور طاقت ور حصہ ہے، مولانا اس کو اپنے لئے نجات وسعادت کا سرمایہ سمجھتے تھے۔

مولانا نے تحریر فرمایا کہ:

''اگر کسی بدعت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہوتا، تو مصنف وصیت کر جاتا کہ کتاب کے یہ صفحات اس کے کفن میں رکھ دئے جائیں کہ وہ ان کو اپنے لئے ذریعۂ مغفرت اور وسیلہ شفاعت سمجھتا ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۶۳)

یہ مضمون علامہ اقبالؔ کے اس بلیغ شعر کی شرح ہے:

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدِ عربی سے ہے عالم عربی

ماذا خسر العالم کا اُردو ترجمہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' بھی اپنی اثر پذیری میں پیچھے نہیں رہا، اس کے علاوہ مولانا کی اہم تصانیف میں **الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ فی الأقطار الاسلامیۃ** (مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش) **رجال الفکر والدعوۃ** (تاریخ دعوت وعزیمت) **السیرۃ النبویۃ** (نبی رحمت) **روائع اقبال** (نقوش اقبال) **الطریق الی المدینۃ** (کاروانِ مدینہ) **اذا ھبت ریح الایمان** (جب ایمان کی بادِ بہاری چلی) **الصراع بین الایمان والمادیۃ** (معرکہ ایمان ومادیت) **النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن** (منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین) **العقیدۃ والعبادۃ والسلوک** (دستورِ حیات) **المرتضیٰ، القادیانی والقادیانیۃ، المسلمون فی الھند، الأرکان الأربعۃ** (ارکانِ اربعہ) **التفسیر السیاسی للاسلام** (عہد حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح) **صورتان متضادتان** (دو متضاد تصویریں) **الی الاسلام من جدید**، حیاتِ عبد الحیؒ، مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، سوانح مولانا عبد القادر رائے پوریؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ، تذکرۂ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، صحبتے با اہل دل، پاجا سراغ زندگی، قرآنی افادات، وغیرہ سرفہرست ہیں۔

مولانا کی تصنیفات میں کتاب وسنت پر اعتماد اور انہیں سے اخذ واقتباس، مناظر

اسلوب سے بعد، اسرارِ شریعت کا فہم، تاریخ اسلام اور تاریخ عالم سے استدلال اور عبرت وموعظت کے پہلوؤں پر توجہ اور حقیقت بینی کے عناصر بہت نمایاں محسوس ہوتے ہیں، تصنیفی وتالیفی کام ان کے نزدیک ذریعہ کسب اور وسیلہ معاش نہیں تھا، اس لئے مولانا کا قلم کہیں بھی انحراف کا شکار نہیں ہوا ہے، علمیت، نکتہ رسی، گہرائی وگیرائی عالم اسلام کے مشاکل ومسائل کا باریک بینی اور دوراندیشی سے جائزہ اور انہیں حل کرنے کی کوشش کے ساتھ پیغمبرانہ اخلاق اور سلف صالح کے زہد واستغناء اور نجابت وشرافت کے نمونے بھی مولانا کے ہاں خوب ملتے ہیں۔

مولانا کی عربی وادبی عبارتوں میں بے پناہ جاذبیت اور سحر ہے، یہ امتیاز انہیں بلند پایہ افراد کو میسر آتا ہے جو بات کی تہہ اور حقیقت تک پہنچ جائیں، یہ قرآن کے شغف وبرکت کا نتیجہ ہے، مولانا کی کوئی تحریر وتقریر قرآن وسنت کے حوالوں سے خالی نہیں ہے؛ بلکہ اس میں ایسی حلاوت وتاثیر ہوتی ہے جو معاصرین کے یہاں ناپید ہے، ساری تالیفات میں یہی جوش وجذبہ کارفرما ہے، اسی لئے پڑھنے والا مولانا کے پاکیزہ احساسات، دل کی دردمندی، عقل کی بلندی اور فکر کی سلامتی کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے، مشاہیر اہل کمال اور علماء کے تأثرات مولانا کی کتابوں کے سلسلہ میں اتنے زیادہ ہیں کہ وہ خود مستقل کتاب بن سکتے ہیں، ان میں بعض تأثرات کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ بہت بڑا امتیاز ہے کہ انہیں عربی، اُردو، فارسی اور انگریزی چاروں زبانوں پر عبور تھا، چناں چہ انگریزی مراجع ومصادر سے استفادہ کرنے میں مولانا کو کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی اور ان کے حوالے مولانا کی کتابوں میں جابجا ملتے ہیں، تصنیف کے علاوہ مولانا کو ترجمہ پر بھی بے مثال قدرت حاصل تھی، ماذا خسر العالم، القادیانی والقادیانیۃ وغیرہ کتابوں کا اردو ترجمہ بھی مولانا نے خود ہی کیا ہے، اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہیدؒ کے رسالہ توحید کو مولانا نے عربی میں منتقل کیا ہے۔ علامہ اقبال کے متعدد قصائد کا عربی میں ترجمہ کیا، مجدد الف ثانیؒ کے بعض رسائل کا بھی عربی ترجمہ فرمایا، اس کے علاوہ ترجمہ کے سلسلہ میں

مولانا کے اور بھی قابل قدر کام ہیں۔

مولانا کی تصانیف میں انگریزی ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد ۷۰ر سے زائد ہے، انگریزی ترجمہ کا کافی کام ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کا رہین منت ہے، وہ انگریزی کے کہنہ مشق صاحب قلم اور مترجم تھے، سب سے پہلے انہوں نے ''ماذا خسر العالم'' کا ترجمہ (Islam and Word) کیا، جس کے بارے میں بہت سے انگریزی کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ کسی غیر انگریزی کتاب کا ابھی تک انگریزی میں اس کتاب سے بہتر ترجمہ نہیں ہوا ہے، اس کے علاوہ آصف صاحبؒ نے نقوشِ اقبال، کاروانِ مدینہ، ارکانِ اربعہ وغیرہ کا ترجمہ بھی کیا اور ہر موقع پر کامیاب رہے، آصف صاحبؒ کے علاوہ اور متعدد انگریزی داں افراد نے بھی مولانا کی کتابوں کا بڑے سلیقہ سے ترجمہ کیا ہے، جن میں سید محی الدین صاحب سابق سیکشن آفیسر حکومت یوپی سرفہرست ہیں، انگریزی کے علاوہ مولانا کی تصنیفات کا ترجمہ فرانسیسی، فارسی، بنگالی، ترکی، ملیشین، گجراتی، تامل، ملیالم، ہندی وغیرہ متعدد عالمی وعلاقائی زبانوں میں ہوا ہے، ترکی زبان میں ترجمہ کا کام جناب یوسف قراچہ ندوی (ترکی نژاد) نے کیا ہے۔

مولانا کی کتابوں کے اردو وعربی مترجمین میں مولانا محمد الحسنیؒ، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، مولانا نور عظیم ندویؒ، ڈاکٹر شمس تبریز خاں، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید سلمان حسنی ندوی، مولانا شمس الحق ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی وغیرہ سرفہرست ہے۔

میں اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کی کتاب ''روائع اقبال'' کا ترجمہ نقوشِ اقبال (جو ڈاکٹر شمس تبریز خاں کے قلم سے ہے) ترجموں میں سب سے کامیاب اور مؤثر ترجمہ ہے اور اس کا ہر ہر پیراگراف شاہکار ہے، اسی مترجم کے قلم سے ''تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات (الاسلام! اثرہ فی الحضارۃ وفضلہ علی الانسانیۃ) ندوۃ العلماء ایک دبستانِ فکر، ایک رہنما تحریک (ندوۃ العلماء مدرسۃ فکریۃ شاملۃ) منصف نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین، (النبوۃ والانبیاء فی ضوء

القرآن) دو ہفتے مغرب اقصیٰ مراکش میں (اسبوعان فی المغرب الاقصیٰ) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان (کیف ینظر المسلمون الی الحجاز وجزیرۃ العرب) وغیرہ بہت مؤثر ترجمے ثابت ہوئے ہیں۔

مولانا محمد الحسنیؒ بھی بہت کامیاب مترجم تھے، اور انہوں نے کافی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ ترجمے (جن کی تعداد ایک دو سے زائد نہیں) بعض حضرات نے بڑی رواداری، سرسری اور خشک انداز میں کئے ہیں، اور ان میں اصل کتاب کا جوش اور ادبیت نہیں آسکی ہے اور انہیں دیکھ کر یہ محسوس فوراً ہوجاتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے، ان میں سرفہرست مولانا کی کتاب "مذکرات سائح فی الشرق العربی" کا اردو ترجمہ "شرق اوسط کی ڈائری" ہے، ایسے ترجموں کو مزید مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لئے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

حضرت مولاناؒ کے عربی واردو اسلوب کے نمونے

ہم یہاں مولانا کے عربی اور اردو اسلوب کے دو نمونے پیش کررہے ہیں، ان سے مولانا کے زور قلم اور تاثیر و بلاغت کا کچھ اندازہ ہوگا۔

مولانا نے ۲۰ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ مطابق ۳۰ دسمبر ۱۹۵۰ء میں ایک پیغام عربوں کے نام تحریر فرمایا، جس کا مضمون یہ ہے:

لو جمع لی العرب فی صعید واحد واستطعت أن أوجه إليهم خطاباً تسمعه آذانهم وتعيه لقلت لهم! أيها السادة! إن الإسلام الذی جاء به سيدنا محمد العربی صلی اللّٰه عليه وسلم هو منبع حياتكم، ومن أفقه طلع صبحكم الصادق، وأن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم هو مصدر شرفكم وسبب ذكركم، وكل خير جاء كم، بل وكل خير جاء العالم، فإنما هو عن طريقه وعلیٰ يديه، أبى اللّٰه أن تتشرفوا إلا بانتسابكم إليه وتمسككم بأذياله

والاضطلاع برسالته والاستماتة فی سبیل دینه، ولا راد لقضاء اللّٰه ولا تبدیل لکلمات اللّٰه، إن العالم العربی بحر بلا ماء کبحر العروض حتی یتخذ سیدنا محمد صلی اللّٰه علیه وسلم إماماً وقائداً لحیاته وجهاده، وینهض برسالته الإسلام کما نهض فی العهد الأول، ویخلص العالم المظلوم من براثن مجانین اوربا – الذین یأبون إلا أن یقبروا المدنیة ویقضوا علی الإنسانیة القاضء الأخیر بانانیتهم واستکبارهم وجهلم – ویوجه العالم من الانهیار الی الازدهار، ومن الخراب والدمار والفوضیٰ والاضطراب إلی التقدم والانتظام والأمن والسلام، ومن الکفر والطغیان الی الطاعة والإیمان، وإنه حق علیٰ العالم العربی سوف یسأل عنه عند ربه فلینظر بما ذا یجیب؟ (ماخوذ: وصایا أساطین الدین والأدب والسیاسة للشبان، مرتبه: عبداللّٰه مزوع)

ترجمہ: اگر راقم کے لئے عرب ایک میدان میں جمع کردئے جائیں اور اس کے امکان وقدرت میں ہو کہ وہ اُن سے براہِ راست ایسا خطاب کر سکے جس کو ان کے کان سنیں اور دل قبول کریں تو میں ان سے کہوں گا کہ میرے قابل احترام بھائیو! وہ دین اسلام جس کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے وہ تمہاری زندگی کا اصل سرچشمہ ہے اور اسی کے افق سے تمہاری صبح صادق طلوع ہوئی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت تمہارے لئے شرف کا باعث اور تمہاری اہمیت وعظمت کا سبب ہے، ہر خیر ونعمت جو تم کو ملی؛ بلکہ ہر خیر جو دنیا کو پہنچی وہ آپ ہی کے ذریعہ سے اور آپ ہی کے دین کے راستہ سے ملی، اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں کہ تم کو آپ کی طرف انتساب، آپ کا دامن پکڑے، آپ کے پیغام کا حامل بنے اور آپ کے دین کے راستہ میں ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار ہوئے بغیر کوئی عزت ملے، اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کو ٹالنے والی اور اس کے ارشادات کو تبدیل کرنے والی کوئی طاقت نہیں، عالم عربی فن عروض کی اصطلاح ''بحر'' کی طرح نام کا سمندر ہے جس میں پانی کا ایک قطرہ نہیں

ہوتا، اور یہ صورتِ حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا امام اپنی زندگی وجدوجہد کا قائد نہ بنالیا جائے، اور عرب اسلام کی دعوت اور پیغام لے کر پھر اس طرح نہ اٹھیں جیسے عہد اول میں اٹھے تھے، اور اس ستم رسیدہ دنیا کو یورپ کے ان ستم گروں کے پنجہ سے آزاد نہ کریں جو صالح تمدن اور حقیقی انسانیت کا کام تمام کر دینا چاہتے ہیں، اور پھر عالم عربی اس معاملہ میں صف آرا ہو کر عالم انسانیت کو انتشار؛ بلکہ احتضار سے بچا نہ لے اور اس کو توحید و وحدت، امن وسلامتی، طاعت وایمان کی لائن پر نہ ڈالے، یہ عالم عربی کا فریضہ ہے جس کے بارے میں اللہ کے یہاں سوال ہوگا، دیکھنا ہے کہ عرب اس کا کیا جواب دے گا''۔ (کاروانِ زندگی ۱۵۲/۷-۱۵۳)

شاہ اسماعیل شہیدؒ کے تذکرہ میں مولانا علی میاںؒ نے تحریر فرمایا ہے:

''۲۴/ذی قعدہ ۱۹۴۶ھ سے لے کر اس دن تک شاید کوئی دن طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی، جس کی اور فضیلتیں برطرف اس کی شہادت ملہم اور شہداء کی مغفرت مسلم، تکفیر وتضلیل میں کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو، لعنت وسب وشتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو، علماء کی مجلس میں اس پر اتنی لعنت کی گئی جتنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بنی امیہ کے دربار میں نہیں کی گئی، فقہ وفتویٰ کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو اس کے کفر کے ثبوت میں نہ پیش کی گئی ہو، وہ ابوجہل وابولہب سے زیادہ دشمن اسلام، فرعون وہامان سے زیادہ مستحق نار، کفر وضلالت کا بانی، بے ادبوں، گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مقلد وشاگرد بتایا گیا، اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کے لئے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستہ میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا، جن کو خون چھوڑ کر کہ اس کا ان کے یہاں کیا ذکر اسلام کی صحیح خدمت میں پسینہ کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی، اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزت وعصمت بچانے کے لئے اس نے اپنا سر کٹایا، تو کیا اس کا یہی گناہ تھا اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین وایمان، جان ومال، عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، سکھوں کے گھروں میں مسلمان عورتیں تھیں، مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی اور ان مین

گھوڑے باندھے جاتے تھے، اس وقت یہ غیرت ایمانی وحمیت اسلامی والے جو ایک کلمہ کفر برداشت نہیں کر سکتے کہاں تھے؟ اور کیا آج بھی شاہ ولی اللہؒ کے پوتے کے سوا کوئی کافر نہیں؟

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز

بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھوسکا
اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

(دعوت وعزیمت کے روشن ستارے، مصنفہ آبادشاہ پوری ۲۳۲-۲۳۳)

دعوتِ اسلامی کے میدان میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی سرگرمیاں

طریقۂ کار، افکار و آراء اور خدمات

(چند جھلکیاں)

حضرت مولانا علی میاںؒ کی پوری زندگی دعوتِ اسلامی اور مسلمانوں کے مسائل ومشاکل کے حل اور خاتمہ کی کوششوں میں صرف ہوئی ہے، اور ہر جگہ قرآنِ کریم کے اس بیان کردہ اصول وخطوط کو حرزِ جاں بنانے اور سینہ سے لگانے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے:

ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن.

ترجمہ: اے نبی! اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجئے اور لوگوں سے ایسے طریقہ پر مباحثہ کیجئے جو بہترین ہو۔

مولانا نے اپنی دعوتی سرگرمیوں کے لئے جو نہج اور طریقۂ کار اختیار فرمایا اور اس پر تاحیات قائم رہے، وہ تشدد وشدت اور ٹکراؤ کا نہیں تھا، اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ اس میں تدریج وحکمت اور مصلحت کی پوری رعایت شامل تھی، اس میں تربیت، افراد سازی، ذہن سازی، خیر خواہی اور اخلاص کے تمام عناصر ملتے ہیں۔

دعوت کا یہ منہج مولانا نے حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اخذ کیا تھا، جسے مولانا دعوت کے تمام مناہج میں افضل اور متعدل قرار دیا کرتے تھے، اس کی توضیح مولانا نے اپنے ایک رسالہ ''**منهج افضل فی الإصلاح للدعاة والعلماء**'' میں فرمائی ہے۔

اس تفصیلی مضمون کا خلاصہ یوں ہے کہ جب مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے اسلام کو

مٹانے؛ بلکہ دفن کرنے کی ساری کوششیں شروع کردیں اور نئے دین کو رائج کردیا، خود نبوت کا دعویٰ کردیا، برہمنوں کے عقائد وعادات سے بے حد متأثر ہوکر ان کی نقل شروع کردی اور ان سے تعلق خاطر اتنا بڑھتا گیا کہ وہ تمام امور میں دخیل ہونے لگے، اس وقت صورتِ حال یہ ہوگئی تھی کہ اسلام مظلوم ہوگیا تھا، اور اسے یتیمی کا داغ سہنا پڑ رہا تھا، یہ ہندوستان کی تاریخ کا تاریک ترین دور تھا جو اگرچہ کچھ لمبے عرصہ تک باقی رہ جاتا تو اس ملک میں شاید کوئی اسلام کا نام لیوا باقی نہ بچتا، اس سنگین فضا میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اٹھے اور کلمہ حق بلند کیا، امراء ووزراء کو خطوط لکھے، جن کے اسلوب کی بلاغت اور حلاوت اور نرمی وسہولت سے مکمل افہام وتفہیم بے حد مؤثر ثابت ہوئی، ان خطوط میں شیرینی اور تلخی، نرمی وسختی اور شدت ولین کا امتزاج بلاشبہ مجدد صاحبؒ کی غیرت وحمیت اور رعایت حکمت ومصلحت کا بین ثبوت ہے، مجدد صاحب خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری انجام دیتے رہے، اور بغاوت برپا کرنے کا کوئی خیال تک ان ے دل میں نہ آیا کہ یہ کفر کے لئے مزید راستہ ہموار کرنا ہوسکتا تھا، چناں چہ وہ اپنی اسی حکیمانہ روش کے مطابق اصلاح وتبدیلی کی کوششوں میں سرگرم رہے، رفتہ رفتہ اثرات بڑھے اور جہانگیر کے زمانہ میں یہ کوشش کامیاب ہوئی اور اکبر کا گمراہ کن نظام وعقیدہ دفن کردیا گیا۔

مجدد صاحبؒ کے اس طریقۂ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ موجودہ انقلابی اور پرفتن دور میں اسے اختیار کرنے کی ضرورت واہمیت سب سے زیادہ ہے، خاص طور پر اس طبقہ کو اس پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہئے جو سیاسی قوتوں، حکومتوں اور جماعتوں کو چیلنج کرنے، ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کی اپنی سرگرمیوں میں کسی قسم کی نرم روی، حکمت ومصلحت پسندی، ذہن سازی، تیاری اور تدریجی مراحل کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتا، اس طرح کی بے جا شدت پسندی بسا اوقات مثبت دعوتی اور عملی کاموں کے راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

مجدد صاحب کا طریقۂ کار جو اصلاً قرآن سے ماخوذ ہے، بڑی افادیت واہمیت کا حامل ہے، اور آغاز ہی سے وہ دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں کامیاب قابل اعتماد اور مؤثر ثابت ہوتا رہا ہے۔ (منہج افضل فی الاصلاح للد عاۃ والعلماء، ربانیۃ لا رہبانیۃ، تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم مختصراً)

مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جابجا اس کی تاکید فرمائی ہے کہ دعوتِ اسلامی کا کام کرنے والے افراد اور جماعتوں کو جلد بازی اور سارے مرحلوں سے بیک وقت گذر جانے کی خواہش سے دستبردار ہونا پڑے گا، یہ حقیقت ہے کہ حکیمانہ دعوت اور عوام کے دلوں میں ایمانیات واساسیات کو بٹھانے اور جمانے کا مرحلہ سیاست وحکومت اور انتظام کے مراحل سے بدرجہا مقدم اور بنیادی ہے، اور یہ پہلا مرحلہ اگر مستقل جاری رہے اور داعیان اس کے لئے بالکل سرگرم؛ بلکہ فنا ہوجائیں، تب کہیں جاکر دوسرے مراحل میں کامیابی ملتی ہے اور اچھا اور خاطر خواہ نتیجہ سامنے آتا ہے؛ لیکن دعوتِ اسلامی کے عاملین ہی اگر جلد بازی کا شکار ہوکر اس اساسی مرحلہ سے اچٹتے ہوئے گذر جائیں اور قوم کی تربیت، ذہن سازی اور کردار سازی کے بغیر سیاست وحکومت کے مراحل تک فوراً پہنچنا چاہیں تو نہ تو کامیابی کی ضمانت لی جاسکتی ہے اور نہ ہی خاطر خواہ نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ (تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم)

دعوت کا یہ طریقۂ کار قرآنِ کریم اور سیرتِ رسول سے مستفاد ہے جس کو مجددین اور مصلحین ہر دور میں اپناتے رہے ہیں، حضرت مولانا علی میاںؒ کی علمی اور دعوتی زندگی میں اس منہج قرآنی کا التزام ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے، عرب ممالک اور دیگر دعوتی زندگی میں اس منہج قرآنی کا التزام ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے، عرب ممالک اور دیگر اسلامی ممالک کے سربراہوں، ذمہ داروں، امراء واعیان سے مولانا کی گفتگو، طرزِ خطاب، خطوط ومکاتیب اور دعوت واصلاح کی کوششوں سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ بعینہٖ اسی طرح کا حکیمانہ طریقۂ کار ہے جو مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے اختیار فرمایا تھا، اور جس کی تائید قرآن وسنت سے ہوتی ہے، اس میں انداز وآگاہی، خطرات کی نشان دہی اور اصلاح وتبدیلی کے

جذبات کے ساتھ ساتھ حکمت و مصلحت کی رعایت، مسائل و مشاکل کے اسلامی معتدل حل، نرم روئی اور خیر خواہی کے جذبات بھی ملتے ہیں، امراء و سربراہان اور لیڈران و قائدین کی رہنمائی اور خیر خواہانہ اصلاح کا یہ کام مولانا کی دعوتی سرگرمیوں کا ایک اہم باب ہے، مولانا نے براہِ راست گفتگو، ملاقاتوں، خطوط و رسائل اور اپنی تصانیف کے ذریعہ یہ خدمت انجام دی، اصلاً یہ اسی حدیث پر عمل تھا، جس میں ''ائمہ مسلمین'' کے ساتھ خیر خواہی و نصح کا ذکر آیا ہے۔ ''النصیحة للّٰه ولرسوله ولكتابه ولأئمة المسلمين وعامتهم'' ۔اس خدمت میں مولانا کا خلاص قابل رشک ہے، جس میں کسی قسم کے مادی فوائد اور معاوضوں کا تصور بھی نہیں ملتا، بہر حال مولانا کی اس بے لوث خدمت سے ان کی فکر کی بلندی، دل کی پاکیزگی اور جذبات و احساسات کی سلامتی کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے، تحریک پیام انسانیت (جس کے قائد اور روحِ رواں مولانا ہی تھے اور جو معترضین و ناقدین کی فضول گوئیوں اور غیر معتدل تأثرات کے باوجود اپنی نوعیت کی پہلی، مؤثر اور وقت کی بے حد اہم اور ضروری تحریک ہے) کے پلیٹ فارم سے مولانا نے طبقاتی اور فرقہ وارانہ کشمکش ختم کر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو قریب آنے کی دعوت دی، اجتماعی اور سماجی مشکلات کا جائزہ لیا اور ان کا اسلامی حل پیش کیا، مل جل کر قوم و وطن کے مفاد میں تعمیری کام کرنے کا جذبہ ابھارا اور غیر مسلموں کے سلسلہ میں اسلام کی پاکیزہ اور بلند پایہ تعلیمات اور اخلاق کا نمونہ پیش کیا اور پوری طرح مدارات، حسن اخلاق اور باہمی اتحاد کی دعوت دی، مولانا کی اس دعوتِ انسانی میں وہی حکمت و تدریج کارفرما معلوم ہوتی ہے جو اسلام کے پیغام انسانی و اجتماعی اور رسول کے عمل سے مستفاد ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہی دعوت کا حاصل اور مقتضائے مصلحت ہے، مولانا نے اپنی دعوت میں تقریباً تمام مؤثر وسائل دعوت کو اختیار فرمایا ہے جن کی کچھ تفصیلات ملاحظہ ہوں:

(۱) یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عمل میں وہ قوت و تاثیر ہے جو الفاظ میں نہیں، دعوت و اصلاح کے ہزاروں مضامین، مقالوں اور تقریروں کے مقابلہ میں عملی مظاہرہ و نمونہ بے

انتہاء کامیاب ومؤثر ثابت ہوتا ہے، اور ایسا تو مشاہدہ میں آئے دن آتا رہتا ہے کہ خوش کلام مگر بدعمل افراد کی دعوت واصلاح کی کوششیں بالکل بے اثر اور بے فیض ہوجاتی ہیں، کامیاب وبامراد داعی وہی ہوتا ہے جو اپنے عملی نمونوں سے اصلاحی کوششوں میں کامیاب ہوجائے اور اثر پیدا کردے، اگرچہ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو، مولانا رحمہ اللہ نے عملی نمونہ کے ذریعہ سے تربیت واصلاح اور دعوت کے کام کو سب سے اہم اور مؤثر دعوتی وسیلہ سمجھا اور داعیوں کے لئے اس کی اہمیت کا ذکر فرمایا ہے۔ (فقہ الدعوۃ ملامح وآفاق (کتاب الامۃ) مضمون سید ریاض عاشور ۲۹)

خود مولانا کی دعوتی سرگرمیوں میں اس اہم وسیلہ دعوت کا التزام ملتا ہے، مولانا کا زہد واستغناء، سادگی، متاعِ دنیا سے بے انتہاء بعد وبیزاری اور مخلصانہ بے لوث وبے صلہ خدمت ودعوت اس کی واضح دلیل اور مولانا کا نمایاں امتیاز ہے، اسی کا اثر تھا کہ اصلاح ودعوت، بے لاگ تنقید وتبصرہ اور روک ٹوک، مداہنت اور باطل کو برداشت نہ کرسکنے اور حقائق کو واشگاف کرنے میں مولانا کو کبھی کوئی باک نہ ہوا اور نہ ہی لومۃ لائم کا خوف کبھی دامن گیر ہوکر ان کوششوں سے دستکش بنا سکا؛ بلکہ مولانا نے جہاں جہاں جو کچھ کہا اس کا اثر قبول کیا گیا، ان کی تلخ نوائیوں کے زہر نے ہمیشہ تریاق کا کام کیا اور ہر حال میں وہ عزیز اور مقبول ومحبوب رہے۔ (علماء ومفکرون عرفتہم، شیخ محمد المجذوب ۱/۱۴۳)

(۲) وسائل دعوت میں مولانا نے تعلیم وتربیت کو بڑی اہمیت دی، مولانا کا یہ عقیدہ تھا کہ نئی پود کی صالحیت، افرادسازی اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لئے تعلیم وتربیت ہی کا سب سے اہم رول ہوتا ہے، مولانا نے اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ (علماء ومفکرون عرفتہم، شیخ محمد المجذوب ۱/۱۵۱) خود برصغیر کی عظیم وبے مثال درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک طویل عرصہ تک مولانا نے تعلیمی وتربیتی کارواں کی قیادت اور سفینہ کی ناخدائی فرمائی ہے۔

(۳) وعظ وتذکیر بھی ایک اہم وسیلہ دعوت ہے جو مولانا کی تمام تحریروں، تقریروں، لکچرس، اسفار، مختلف اور ہر سطح کے لوگوں سے ملاقاتوں میں بے حد نمایاں حقیقت یہ ہے کہ

مولانا نے تذکیر ووعظ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا اور یہ ایک دن بھی موقوف نہ ہوا۔

(۴) مولانا اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل خاک کی آغوش میں ہونے والی تسبیح ومناجات سے بدر جہا بہتر ہے اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے علمی ودعوتی جہاد ہزاروں نوافل، اعتکافوں اور عزلت پسندیوں سے افضل ہے، اسی گہرے ایمان ویقین اور فکر بلند کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا نے عرب وعجم کا دورہ کیا، مغرب ومشرق کے مے خانے دیکھے اور گوشے چھان ڈالے۔ قرآنِ کریم کی یہ آیت ہر جگہ ان کی توجہ اور نقطہ التفات رہی:

کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتومنون باللّٰه.

ترجمہ: اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)

چناں چہ اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اشاعت دین کے جذبہ بے پناہ کے ساتھ مولانا نے مشرق ومغرب ہر جگہ نہ جانے کتنے مدارس، مساجد، مراکز اور اداروں کا سنگ بنیاد رکھا، تاسیس میں شریک ہوئے، نہ جانے کتنی تحریکوں میں حصہ لیا، نہ جانے کتنی کانفرنسوں، سیمیناروں اور جلسوں میں مولانا بلائے گئے اور ہر جگہ مولانا نے برملا بے خوف وخطر دعوت واصلاح کی صدا لگائی - تیری آواز مکے اور مدینے - متعدد علمی واسلامی اکیڈمیوں اور اداروں کے قیام وتاسیس اور شرکت وتعاون کے راستہ سے بھی مولانا نے دعوتی سرگرمیاں بڑھائیں، جن میں رابطہ عالم اسلامی، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مجمع علمی دمشق اور رابطہ ادب اسلامی وغیرہ کے پروگراموں میں شرکت اور یورپ وہندوستان میں مختلف اسلامی اداروں اور تنظیموں کی ذمہ داری وقیادت کرتے ہوئے مولانا نے تادم مرگ فکری، مذہبی اور معاشرتی مسائل کے تجزیہ وحل اور اصلاح ودعوت کا کام انجام دیا اور دعوتی سرگرمیوں

کی راہ میں حائل تمام موانع اور رکاوٹوں کا حل تجویز کیا اور آخر تک اپنی دعوتی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مصروفِ عمل رہے اور ان کا طائر بلند پرواز بیماری، بڑھاپے اور کمزوری کی پرواہ کئے بغیر ہمیشہ اڑتا رہا اور بلند ہمت رہا۔

ومن تكن العلياء همّة نفسه ❖ فكل الذى يلقاه فيها محبب

ترجمہ: جس کا مطمح نظر بلندیوں اور رفعتوں کو پہنچتا ہوا سے اس راہ کی ساری زحمتیں اور پریشانیاں عزیز اور محبوب ہوتی ہیں۔

(۵) تصنیف وتالیف کے راستہ سے حضرت مولانا کی دعوتی سرگرمیاں ''عیاں راچہ بیاں'' کا مصداق ہیں، مولانا کی سیکڑوں تصنیفات اور مضامین ومقالات ہیں جو اپنے موضوعات کی اہمیت ونزاکت اور موجودہ اہم مسائل کے تجزیہ وحل کے لحاظ سے منفرد شان رکھتے ہیں، ان تصانیف کے ذریعہ جو فکری اور روحانی خلا پر ہوا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی تالیفات دعوتِ اسلامی اور ثقافت اسلامی کے میدان میں بنیادی مراجع ومصادر کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان میں ایک مؤرخ کی جامع عقلیت، ایک عالم کی دقت نظر اور تحقیق، ایک ادیب کی بلاغت وادبیت اور ایک مخلص داعی کا جذبہ وحرارت سب کچھ جمع معلوم ہوتا ہے۔

(۶) صحافت بھی مولانا کی دعوتی کوششوں کا ایک اہم ذریعہ رہی ہے، ۱۹۳۲ء میں ندوۃ العلماء کے عربی پرچہ ''الضیاء'' اور ۱۹۴۰ء میں اُردو مجلہ ''الندوہ'' کی ادارت میں مولانا شریک رہے، ۱۹۴۸ء میں انجمن تعلیمات اسلام کی طرف سے ایک پرچہ ''تعمیر'' نکالنا شروع کیا، ۱۹۶۳ء میں ندائے ملت نکلنا شروع ہوا تو اس کی سرپرستی اور نگرانی فرمائی، ندوۃ العلماء سے ۱۹۵۵ء میں ''البعث الاسلامی'' ۱۹۵۹ء میں ''الرائد'' اور ۱۹۶۳ء میں ''تعمیر حیات'' جاری ہوا تو مولانا تاحیات ان کے ذمہ دار وسرپرست رہے، ہند وبیرونِ ہند کا غالباً ایسا اسلامی مجلّہ اور اخبار نہیں ہے جس میں مولانا کے چشم کشا مضامین ومقالات، تأثرات، انٹرویوز، افکار اور آراء طبع نہ ہوئی ہوں۔

حضرت مولانا کی تحریروں اور افکار کا بغور جائزہ لینے سے مولانا کا ایک واضح اور معتدل دعوتی منہج سامنے آتا ہے، میں اپنے مختصر اور محدود مطالعہ کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس منہج کی اساسیات میں مندرجہ ذیل عناصر شامل ہیں:

(۱) کتاب وسنت پر پورا اعتماد وانحصار

علوم قرآن وتفسیر مولانا کا پسندیدہ مضمون تھا، اس پر مولانا نے بڑی محنت فرمائی، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے پاس جاکر تفسیر میں تخصص کیا اور بڑی گہرائی سے قرآن کا مطالعہ فرمایا تھا۔ حدیث نبوی سے بھی مولانا کو بڑا شغف تھا، ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے مولانا نے علم حدیث حاصل کیا تھا، مولانا کی تمام تصنیفات اور دعوتی سرگرمیوں میں قرآن وحدیث سے شغف، اعتماد اور اخذ واقتباس بے حد نمایاں نظر آتا ہے، کتاب وسنت سے مولانا کو کمالِ ایمان، توانائی اور روحانیت وبرکت جیسی اہم نعمتیں نصیب ہوئیں۔

(۲) مصلحین ومجددین کے طریقۂ کار کی پابندی

ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مجددین نے جو حکیمانہ، تدریجی اور متوازن طریقۂ دعوت اپنایا تھا، خاص طور سے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو اسلوب اختیار فرمایا تھا، مولانا اس کے بڑے مداح اور مؤید تھے، یہ اسلوب بھی اصلاً کتاب وسنت سے مستفاد ہے اور اس میں افراط وتفریط اور بدعت کے بجائے اعتدال اور سنت کا اہتمام ملتا ہے، مولانا نے اپنی زندگی میں اسی کو اپنائے رکھا اور اس کے فائدے ہر جگہ محسوس ہوئے۔

(۳) زمانہ کے تمام تغیرات اور مسائل ومشاکل سے باخبری اور تجزیہ

مولانا اپنے زمانہ کے مسائل وانقلابات اور ان کے اثرات ونتائج سے کبھی بے خبر نہ

رہے، ہمیشہ مسلمانوں سے متعلق تمام مسائل کا بڑا ناقدانہ اور ہر موقع پر ان کی معتدل آرا اور افکار سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا۔

(۴) تاریخ اقوام وملل سے گہری واقفیت اور احاطہ

مولانا کی بیشتر تحریروں میں تاریخی واقعات، ان سے عبرت وموعظت کے نتائج اخذ کرنے اور ماضی کے گمراہ کن اور تباہ کن امور سے دور رکھنے اور ڈرانے کے مضامین ملتے ہیں، یہ چیز ان کی مقبول ترین معرکۃ الآراء تصنیف ''ماذا خسر العالم'' میں بڑی نمایاں ہے، مولانا کے بقول وہ شروع سے تاریخ کے طالب علم رہے ہیں، اور ان کی اکثر تحریریں تاریخی موضوعات سے متعلق رہیں، انہیں اسلام کی سیاسی، فکری، علمی اور روحانی تاریخ کے ساتھ ہی یورپ کے قدیم ترین فلسفوں اور مذاہب وادیان واقوام کی تاریخ کا گہرا علم اور مطالعہ تھا۔

(واقع العالم الاسلامی، مصنفہ: مولانا علی میاںؒ)

اسی لئے تاریخی استدلالات کا عنصر مولانا کی تحریروں اور دعوتی سرگرمیوں میں خوب ملتا ہے، جو ان کے وسیع وعمیق مطالعہ قرآن اور کتاب اللہ سے قوتِ اخذ واقتباس کا بین ثبوت ہے۔

(۵) مغربی تہذیب کے بارے میں مولانا کا معتدل موقف

مولانا نے اپنی زندگی میں ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کا اصول اپنائے رکھا، صاف ستھری چیزیں اخذ کرنے اور آلودہ وبیکار چیزوں کو چھوڑنے کی مولانا نے ہمیشہ دعوت دی، مغربی تہذیب کے مفاسد ومفاتن پر بڑی سخت تنقید فرمائی اور اس کی اچھی چیزوں کو اخذ کرنے کی دعوت دی، مولانا اعتدال کے داعی اور اس پر عامل تھے، انہوں نے مغربی تہذیب سے بالکلیہ اجتناب یا مکمل تقلید کی دعوت کبھی نہیں دی؛ بلکہ اس افراد وتفریط سے ہمیشہ گریزاں اور مخالف رہے، انہوں نے اہل مغرب سے ہمیشہ جاہلیت سے اسلام کی طرف آنے کی بات کہی اور نئی پود کو مغربی تہذیب کے سحر آفریں شرور ومفاسد سے دور رہنے کی تلقین کی۔

(۶) عربوں کی اصلاح کا اہتمام

یوں تو مولانا کے دعوتی کاموں کی جولان گاہ مشرق بھی ہے اور مغرب بھی، عرب بھی ہے اور عجم بھی؛ لیکن مولانا نے عربوں کی اصلاح ودعوت کا اہتمام زیادہ فرمایا، ان کے مسائل پر بار بار قلم اٹھایا، تقریریں کیں اور انہیں سلجھانے اور حل کرنے کی کوششیں فرماتے رہے، وہ عرب کو روئے زمین کی سب سے زیادہ مستحق اکرام ومودّت قوم سمجھتے تھے؛ لیکن ان کے نزدیک اسلام وایمان کا درجہ ہر چیز سے فائق تھا، مولانا نے بارہا فرمایا اور جگہ جگہ لکھا ہے کہ اسلام وایمان کی صلابت کے ساتھ عرب سب سے زیادہ مستحق قیادت ہیں، انہیں اپنا یہ مقام سمجھنا اور یہ منصب سنبھالنا چاہئے۔ (کاروانِ زندگی ودیگر محاضرات، العرب والاسلام ۶۰)

(۷) اسلوبِ بیان کی بلاغت وادبیت

ادب مولانا کے نزدیک سب سے اہم وسیلہ دعوت ہے، دعوتی کاموں میں مولانا کا تقریری وتحریری اسلوب بڑا ادیبانہ اور سحر آفریں ہے جو ہر موقع پر دلوں میں گھر کرتا، اثر کرتا اور وآمادۂ عمل کرتا رہا ہے، یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے، قرآن وحدیث سے والہانہ شغف، وسعت اور جہد مسلسل نے مولانا کو یہ امتیاز عطا کر دیا تھا، ان کی کوئی بات یا تحریر اس امتیازی جوہر سے خالی نہیں ہے، ان میں بے پناہ تاثیر اور کشش ہے اور یہ مولانا کے مخلص وبے لوث ہونے کی دلیل ہے؛ اس لئے کہ یہ ان کے دل کے اندرون کی صدا ہوتی ہے اور:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی رائے میں دعوتی سرگرمیوں میں تین اہم نکتوں کو پیش نظر اور مطمح نگاہ بنانا ضروری ہے، ہم مختصراً ان کا ذکر کرتے ہیں۔ (ماخوذ از: تذکرات سائح فی الشرق العربی ۹۵-۹۶)

ا:- عام لوگوں میں ایمان کے مبادی اور اساسیات کی تخم ریزی اور استحکام، عقائد واعمال، معاملات واخلاق کی تصحیح، تزکیۂ نفس اور دعوت کا مرحلہ تنظیم، حصولِ اقتدار اور انتظامی امور کے مراحل سے پہلے کا درجہ رکھتا ہے، سارے مراحل سے تدریجاً گذرنا ہی مفید ہوتا ہے، تدریج واعتدال میں منافع پورے حاصل ہوتے ہیں اور مقصد میں اچھی طرح کامیابی ہوتی ہے؛ لیکن اگر داعیان جلد بازی سے کام لے کر عوام اور قوم کی تربیت، ذہن سازی اور انہیں ڈھالے بغیر بیک وقت سیاست وحکومت کے مرحلہ کو حاصل کرنے ہی میں منہمک ہو کر اپنا سارا زور بازو صرف کر ڈالیں تو یہ جلد بازی مقصد کے حصول میں مخل ثابت ہوگی، نہ تو سارے فوائد مل سکیں گے اور نہ ہی منزلِ مقصود نصیب ہو سکے گی، دعوتِ اسلامی کے آغاز کی تاریخ اس سلسلہ کا بڑا اہم نمونہ ہے، جس میں دعوت کا مرحلہ مکہ مکرمہ میں ۱۳؍سال اور مدینہ منورہ میں ۱۰؍سال کے طویل عرصہ کو محیط نظر آتا ہے، عہد رسالت میں حکومت وسیاست کی مدت دعوت کی مدت سے بے حد مختصر ہے، اس لئے تدریج واعتدال ہی خیر کا وہ پہلو ہے جو دعوتِ اسلامی کی کامیابی اور تاثیر کے لئے ایک فعال عنصر کا کام کرتا ہے۔

۲:- ایسے افراد پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے جو پیغام دعوت کے سچے معنوں میں امین وحامل اور وارث ہوں، جو ہر شگاف پاٹ سکتے اور ہر خلا پر کر سکتے ہوں، اور تربیت وتزکیہ کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا سکتے ہوں، کوئی بھی تحریک، ادارہ اور دعوت اپنی قوت، مالی استحکام اور مضبوطی کے باوجود اگر افراد سازی کے میدان میں روز بروز قدم نہ بڑھاتی رہے تو یہ اس کے لئے خطرہ کا الارم ہے، اگر رجالِ کار ہی تیار نہ ہوں تو پرانے باصلاحیت افراد یکے بعد دیگرے رفتہ رفتہ ختم ہو کر اس تحریک ودعوت کو قلاش اور مفلس وبے مایہ چھوڑ جائیں گے، اس لئے رجال سازی کا کام دعوت کے اہم ترین نقاط میں شامل ہے۔

۳:- دعوتِ اسلامی کے افراد کو قلب وروح کی غذا سے شاد کام اور سیراب کیا جانا بھی نہایت ضروری ہے، ان کا جوشِ عمل، وفورِ جذبات، حرارت ولگن اور شوق ونشاط حوصلہ

افزائی کے ساتھ ہی اس غذاءِ قلبی وروحانی کا بڑی حد تک رہین منت ہے، یہ اُن کی خرچ کی ہوئی صلاحیتوں کا نعم البدل ہے، انسان تو ایک جلتا ہوا چراغ ہے، جس میں اگر تیل نہ ڈالا جائے تو اسے گل ہونا ہے، دعوتِ اسلامی کے کام کو گل ہونے اور سرد پڑنے سے بچانے کے لئے اس کے افراد کے دلوں کی آنچ تیز اور جذبات گرم کرنے پڑیں گے؛ تاکہ وہ ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رہیں اور کبھی ان کے پاس سے اضمحلال، دل شکستگی اور کسر ہمت کا گذر ہی نہ ہوسکے، ایسا بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے دعوتِ دینی اور تحریک سیاسی کے کارکنان شروع میں بڑے بلند حوصلہ، عالی ہمت اور اولوالعزم رہے، مگر جب سخت حالات آئے، قید وبند یا دار ورسن کا مرحلہ آیا، اذیتوں میں مبتلا ہوئے، فوراً ہی ان کا جوش کافور اور حرارت سرد پڑ گئی، جذبات مردہ ہوگئے اور حوصلہ ہی ختم ہوگیا اور وہ اپنے سفر میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے؛ بلکہ بہت پیچھے ہٹتے گئے، حتیٰ کہ بسا اوقات وہ بازاری لوگوں سے بھی گئے گذرے ہوگئے، تو صرف جوش وجذبات اور وقتی قربانیوں ہی میں کمال نہیں، اصل کمال تو استقلال اور بقاء ودوام میں ہے، ظاہر ہے یہ جوہر بغیر روحانی تربیت، تزکیۂ قلب اور دلوں کو ذکر ایمانی اور حلاوتِ دینی سے معمور کئے بغیر ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔

مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ ہمیں اپنے دل ودماغ اور عقل وخرد کو پاکیزہ کرکے صرف اور صرف دعوتِ اسلامی، خدمت وقربانی اور لوگوں کو جاہلیت کی تیرگی سے اسلام کی تابانی میں لانے کی کوششوں کے لئے مخلصانہ سرگرم عمل ہوجانا چاہئے، یہ ہماری ذمہ داری اور فرضِ منصبی ہے، جس کی انجام دہی ضروری ہے۔ (نحو بعث اسلامی جدید ۱۶)

مولانا کی ان آراء سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ تربیت کا لحاظ، مرحلہ بہ مرحلہ دعوتِ اسلامی کے کارواں کو آگے بڑھانا، تدریج واعتدال کی رعایت، جلد بازی سے پرہیز اور حکمت مندانہ اقدام کسی بھی دعوتی تحریک کی پوری کامیابی اور حصولش مقصد کی ضمانت ہوتے ہیں۔

چند معاصر تحریکات وافراد کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ بڑے شدومد سے پھیلایا جارہا ہے کہ مولانا نے خلافتِ اسلامیہ کی بحالی کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا اور نہ ہی تحریک چلائی اور نہ اس سمت میں مولانا مودودیؒ، حسن البنا شہید، سید قطب شہید وغیرہ کی طرح مولانا کا کوئی عملی کام سامنے آسکا۔

حاشا وکلا! یہ ایک بے بنیاد خیال ہے جس کے پیچھے فی الواقع جماعتی اور فرقہ پرستانہ عصبیت وجہالت کارفرما ہے، مولانا کا کہنا اور کرنا صرف یہ تھا کہ وسائل ومقاصد میں نمایاں فرق ہوتا ہے، جس کا لحاظ ضروری ہے، حکومت اصلاً مطلوب ومقصود نہیں ہے؛ بلکہ وہ وسیلہ ہے، اصل مقصود غلبہ اسلام ہے جس کے لئے پہلے زمین تیار کرنی پڑتی ہے، مرحلہ بہ مرحلہ کام ہوتا ہے، تدریج واعتدال ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، پھر کہیں جاکر اصل مقصد میسر آتا ہے، اسی طریقۂ کار میں کامیابی ہے، ورنہ جلد بازی میں اتنے مفاسد ہوتے ہیں جو ناقابل تدارک ثابت ہوتے ہیں، اس لئے پہلا کام تو عوام اور قوم کو راسخ الایمان، صائب العقیدہ اور صالح بنانا ہے، ان میں ایمان ومذہب پر یقین کامل اور اعتماد پیدا کرنا ہے، اور اس سلسلہ میں اس طریقہ کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا، ہم بھی خلافتِ اسلامی کی بحالی کی کوشش کرنے والوں کے دل سے قدرداں ہیں، ہم اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کہ انہوں نے کیا طریقۂ کار اپنایا اور بالآخر کیوں ناکام رہے؟ لیکن اس حقیقت کا اعتراف بہرحال سب کو ہے کہ مولانا علی میاںؒ کا طریقۂ کار حکمتِ نبوت سے ہم آہنگ ہے اور اس کی تاثیر اور سلامتی سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی رائے میں دعوتِ اسلامی کے مختلف بنیادی شعبے اور میدانِ عمل ہیں، اس کی تفصیل ان کی تحریروں اور تقریروں میں جابجا ملتی ہے، ذیل میں ہم چند اہم اور بنیادی شعبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ (ماخوذ از: الدعوۃ فی العصر الحاضر لسماحۃ الشیخ الندوی ۹-۱۹)

۱:- مسلمانوں میں دینی ومذہبی شعور، ایمانی استقامت اور جذبۂ عمل اُبھارنے کا کام

بڑی اہمیت کا حامل ہے، اخلاص، تصحیح عقائد، غیر اسلامی عادات ورسوم سے نفرت وبعد اور اسلام ومسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور اس کے حل کی کوشش دعوتِ اسلامی کا اہم ترین شعبہ ہے۔

۲:- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی، عقلی اور جذباتی تعلق کو مستحکم اور مضبوط کرنا اور جان، مال، اہل وعیال، عزت ومنال اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبت وشیفتگی کا عام جذبہ بیدار کرنا بھی دعوتِ اسلامی کا عظیم شعبہ ہے۔

۳:- اسلام کے مفہوم اور حقیقتِ دین کو تحریف وانحراف سے بالکلیہ محفوظ رکھنا، اسلامی حقائق ومفاہیم کو جدید مغربی تصورات یا سیاسی واقتصادی تعبیرات واصطلاحات کے تابع نہ ہونے دینا اور اسلام کی خالص سیاسی توضیح اور تفہیم وتشریح سے احتیاط برتنا بھی دعوتِ اسلامی کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔

۴:- مہذب اور تعلیم یافتہ (Educated) طبقات اور عالم اسلامی میں فکری وتربیتی قیادت کے ذمہ داران اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے کارکنان اور صحافیوں کا اسلام کی صلاحیت، حقانیت اور تاثیر وقوت پر اعتماد بحال کرنا بھی دعوتِ اسلامی کا نازک شعبہ ہے، نئی پود خصوصاً عصری دانش گاہوں کے نونہالان کو اس حقیقت کا ایقان بے حد ضروری ہے کہ اسلام زمانہ کی ترقیات وانقلابات سے مرعوب ومتأثر اور ہمنوا نہیں ہے؛ بلکہ وہ پورے کاروانِ انسانی کی قیادت اور رہبری کے لئے وجود پذیر ہوا ہے، وہ ایک مکمل اور مستقل نظامِ حیات اور ضابطۂ زندگی ہے، وہ عالی ترین افکار ومقاصد کا حامل ہے، اس کا پیام نوع بہ نوع ہے، تروتازہ ہے، جاری وساری ہے، اور پوری دنیائے انسانیت کے لئے ہے، وہ زندگی کی منجھداروں اور گردابوں میں پھنسی کشتی کو ساحل مراد پر پہنچانے کا کام کرتا ہے، وہ انسانی سماج کو مغرب کے کھوکھلے اور عریاں کلچر کی پستیوں اور گراوٹ اور محرومیوں سے نکال کر اسلام کی آغوشِ عدل ورحمت میں پہنچانے کا مقدس فریضہ انجام دیتا ہے، وہ شروع سے جاہلیت وکفر کے ظالم وبے رحم پنجوں سے امتوں کو آزاد کراتا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نظامِ

وحدت ومودت میں داخل کرتا آیا ہے، یہی راہِ سعادت وسلامتی ہے اور اسی کا دامن تھامنے میں نجات وعافیت ہے، ان حقائق کی یقین دہانی اور ایمان پر اس درجہ اعتقاد کی بحالی دعوت کا بنیادی شعبہ اور داعیوں کی اصل ذمہ داری ہے۔

۵:- یورپی نظام تعلیم وتربیت کو (جو اسلامی ملکوں میں بڑی تیز رفتاری سے اپنایا اور پھیلایا جارہا ہے اور جس کے اثراتِ بد سے ایک عالم متأثر ہورہا ہے) بدل کر اور ختم کرکے اسلامی اقوام کی شخصیت، عقائد، پیغام اور قدر ومنزلت سے بالکل ہم آہنگ اسلامی نظام ونصابِ تعلیم وتربیت کی تنفیذ ایک نہایت عظیم ذمہ داری اور اہم دعوتی شعبہ ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے اقوام وملل کی زندگی میں نظام تعلیم وتربیت کی تاثیر کا بارہا ذکر کیا ہے، مولانا کا کہنا تھا کہ موجودہ صورتِ حال کا بگاڑ اسی یورپی فاسد نصاب ونظام کی وجہ سے ہم میں گھس آیا ہے، نصاب ونظام تعلیم وتربیت میں وہ قوت ہوتی ہے جو حالات کا پورا نقشہ بدل ڈالتی ہے، نظام مغرب کو ہٹا کر اسلامی نقطۂ نظر سے تیار شدہ نصاب کی تنفیذ کے بغیر نہ تو عالم اسلام اپنے قدموں پر کھڑا ہوسکتا ہے، نہ اس کی سلامتِ عقل ودماغ اور قوتِ فکر وعمل کا جوہر نمایاں ہوسکتا ہے، نہ ہی حکومتوں، انتظامی ذمہ داریوں اور اصلاحی سرگرمیوں کے لئے وہ رجال کار تیار ہوسکتے ہیں جو اسلامی تعلیم وتربیت کو حکومت وانتظام، معاشرہ وسماج اور ذرائع ابلاغ؛ بلکہ ہر شعبہ میں نافذ ودخیل کرکے ایک اسلامی اور مؤمنانہ زندگی کے جمال وکمال کی دل آویزیوں اور خصوصیات کا نقشہ پیش کردیں، اور نہ ہی ایک صالح معتدل اسلامی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، یہ اسلامی نصاب ونظام تعلیم وتربیت ہی کی برکت ہوتی ہے کہ پورا اسلامی معاشرہ تشکیل پاجاتا ہے اور قابل نمونہ ثابت ہوتا ہے۔

۶:- عقیدہ وعبادت اور دینی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنا، لوگوں کو ان کی خود ساختہ رسوم وعادات سے دور کرنا اور ان کے ماضی کی بے اعتدالیوں کو دور کرکے ان کے حال کو اسلامی قالب میں ڈھالنا بھی ایک اہم دعوتی کام ہے، اسلامی حکومتوں اور معاشروں کا یہ

فرض ہے کہ وہ ایسی مستقل اسلامی تمدنی منصوبہ بندی کریں جو مغرب کی اندھی اور ہر جائز وناجائز تقلید، عجلت پرستیوں، بے اعتدالیوں اور نقائص سے کوسوں دور ہو، اور اپنے تمام خطوں، شہروں، علاقوں، گھر، انفرادی واجتماعی مرحلوں، ہوٹلوں، پارکوں، دفاتر، سواریوں، جہازوں، غرضے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی ثقافت کی نمائندگی کریں، یہ صرف اسلامی حیات واقدار ہی کی نمائندگی نہیں ہوگی؛ بلکہ اس سے اسلام کی طرف ایک خاموش، جاذب اور مؤثر دعوت کا کام بھی انجام پائے گا۔

۷:- تمام اسلامی ممالک میں ایک ایسی علمی اور منظّم تحریک کا قیام بے حد ضروری ہے، جس کے ذریعہ نئی تعلیم یافتہ نسل اسلام کے علمی ذخائر اور اس کی روشن تاریخ سے بخوبی واقف ہو سکے اور جس کے ذریعہ اسلامی علوم کے تن مردہ میں نئی روح پھونکی جائے اور خونِ زندگی دوڑایا جائے، اور موجودہ متمدن دنیا کے سامنے یہ واضح ہو جائے کہ اسلام کا قانون اور اس اس کا تعلیمی وتربیتی نظام دنیا کا سب سے وسیع، جامع، ترقی یافتہ اور مکمل نظام ہے، وہ بے انتہاء پائیدار اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہے، اس کی صلاحیت وفوائد کے جاری چشمے اور بہتے سوتے کبھی خشک نہیں ہو سکتے، وہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ حیاتِ انسانی کی قیادت اور ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے الٰہی قانون کے سامنے دوسرے تمام خود ساختہ انسانی نظام ریت کی دیوار ثابت ہوتے رہے ہیں، اس طرح کی علمی وعملی تحریک کے قیام کی کوشش بھی دعوت کے زمرہ میں شامل ہے۔

۸:- مغربی تہذیب کے علوم وافکار اور ایجادات واختراعات ایک مادۂ خام کی طرح ہیں، جن کی خوبیاں اور اچھے عناصر عالم اسلام کے قائدین اور ذمہ دارانِ حکومت کو اخذ کر کے ایسی مکمل اور جامع تہذیب وثقافت قائم کرنے اور عام کرنے کی تگ ودو میں لگ جانا چاہئے، جس میں ایک طرف ایمان، اخلاقِ حسنہ، تقویٰ، رحمت وانصاف کی بنیادیں کارفرما ہوں، تو دوسری طرف قوت وایجاد، فراخی اور وسعت کے عناصر بھی موجود ہوں، اس طرح یہ کامل اور

متوازن تہذیب وجود میں آ کر عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔

۹:- جن اسلامی ممالک میں بدقسمتی سے نام نہاد مسلمانوں اور اسلام دشمنوں کی حکومتیں اسلامی عناصر کو ختم کرنے کا کام کررہی ہیں اور اسلام کی ایسی تشریح کررہی ہیں، جو ان کی سیاسی مصلحتوں سے ہم آہنگ اور ان کے اصل سرپرستوں، مربیوں اور ذمہ داروں کی خواہشات اور تمناؤں کے عین موافق ہوں، داعیوں کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے سامنے یہ حقیقت واشگاف کردیں کہ اس طرح کی سیاست بے فیض اور بے فائدہ ہے جو کسی اسلامی ملک میں (بالخصوص جس کا تاریخ دعوت وتہذیب اسلامی میں اہم رول اور روشن تاریخ رہی ہے) کبھی پنپ نہیں سکتی اور نہ ہی کامیاب ہوسکتی ہے؛ بلکہ انہیں اس طرف متوجہ کردیں کہ وہ اپنی ساری طاقتیں اور توانائیاں اسلامی ممالک کو قوت وامداد پہنچانے اور ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرنے میں صرف کریں، اسلامی شریعت کی تنفیذ کا راستہ ہموار اور فضا سازگار کرنے میں لگ جائیں، اپنی ذاتی ومادی نفع اندوزیوں سے بچیں اور اجتماعی مصالح کو ملحوظ رکھیں جن میں اسلام کا بھی نفع ہے اور دنیا وآخرت میں ان کی کامیابی کی ضمانت بھی۔

۱۰:- عالم اسلام میں ایسی مثبت اور دعوتی تحریک کا قیام عمل میں لانا چاہئے جو ہر لحاظ سے مستحکم ہو اور اس کے کارکنان میں بلند ہمتی، عالی دماغی، روشن ضمیری، دقتِ نظر، رقتِ قلب، شجاعت وبلند حوصلگی، عزم ویقین، پاکیزگی نفس، سلامتی فکر ودل کے ساتھ ہی موجودہ بڑی طاقتوں (جو آج انسانیت کی قیادت سنبھالے ہوئے ہیں، اور اپنی قوت وظلم کے بل بوتے پر بغیر کسی جواز واستحقاق کے متعدد مسلم وغیر مسلم ممالک اور اقوام کی قسمت کا فیصلہ کرتی رہتی ہیں) سے پنجہ آزمائی اور ہر موڑ پر ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیتیں بھی ہوں، ایسی جماعت کے قیام کی کوششیں عالم اسلام کے ذمہ داروں کا ایک اہم فریضہ ہے، جسے مصلحتوں سے ٹالا نہیں جانا چاہئے۔

۱۱:- وہ ممالک جہاں بدقسمتی سے مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں داعیوں کی ذمہ

داری یہ ہے کہ وہ اعمال واقوال، سیرت وکردار اور سلوک ومعاملات میں ہر جگہ اسلام کی ایسی نمائندگی کرنے کی فضا پیدا کریں جو باعثِ کشش وتاثیر ہو، وہ روحانی اور اخلاقی قیادت کا کام انجام دینے کے ساتھ ہی وطن اور سماج کو اخلاق گراوٹ، کرپشن، روحانی افلاس، معاشرتی پستی اور ادبار کے اُن مفاسد سے بچائیں جو کسی بھی غیر مسلم جماعت وحکومت کا امتیاز ہوتے ہیں، اس طرح اشاعتِ اسلام کا راستہ ہموار ہوگا، زمین تیار ہوگی اور فضا سازگار ہوگی، اور رفتہ رفتہ یہ حقیقت اُبھر کر بڑے زور وشور سے سامنے آئے گی کہ اسلام ہر لحاظ سے معتدل اور مستحق قیادت ہے، ملک کو اس کی ضرورت ہے، چناں چہ مسلمانوں کو اپنی قیادت وتبلیغ کا زریں موقع ہاتھ آجائے گا، بس ضرورت توازن، حکمت، اعتدال اور جماؤ کے ساتھ متحد ہوکر کام کرنے کی ہے، آگے ساری منزلیں واہوتی جائیں گی اور ساری رکاوٹیں دور ہوتی نظر آئیں گی۔

مولانا نے ہندوستان میں عملی طور پر یہی ذمہ داری انجام دی ہے، مسلمانوں کے تمام مسائل ومشاکل ومشاکل کے بارے میں مولانا کا جو رول رہا ہے اور تحریک پیام انسانیت کے راستہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو قریب کرکے اور اسلام کی جامعیت اور رواداری کا تصور دلوں میں بٹھا کر دعوتِ اسلام کی جو کوششیں مولانا فرمارہے ہیں وہ اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں۔

مولانا کے دعوتی نہج اور طریقۂ کار کی یہ چند جھلکیاں ہیں جو قدرے تکرار اور تفصیل کے ساتھ آگئی ہیں، ان سے مولانا کی فکری ودعوتی جامعیت، داعیوں کو طریقۂ دعوت، دعوتی شعبوں اور ذمہ داریوں سے واقف کرانے کے ساتھ ہی مولانا کے منہج دعوت کا توازن، اعتدال، رعایتِ حکمت ومصلحت اور تدریج جیسے عالی اوصاف بڑی وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں۔

۱۹۹۶ء میں حکومت ترکی نے مولانا کی ادبی ودعوتی خدمات کے اعزاز واعتراف میں ایک کانفرنس منعقد کی تھی، جس میں عرب وعجم کے درجنوں اہل علم وادب نے اپنے وقیع

مقالات میں مولانا کے علمی، ادبی اور دعوتی کارناموں کا بڑی وضاحت سے تجزیہ کیا تھا، اس موقع پر مشہور عرب مفکر وعالم ڈاکٹر یوسف قرضاوی ڈائریکٹر ''مرکز سیرت وسنت'' جامعہ قطر کا مقالہ قابل تعریف تھا، انہوں نے اپنے مقالہ ''ركائز الفقه الدعوى عند العلامة ابى الحسن الندوى'' (حضرت مولانا علی میاںؒ کی دعوتی فقہ کے عناصر ومبادی) میں مولانا کی دعوتی فکر کو ۲۰ راساسی عناصر پر مبنی قرار دیا ہے، یہاں ان کا مختصراً ذکر موضوع کی مناسبت سے اہمیت کا حامل ہوگا۔ (ماخوذ از: ماہنامہ ''افکار ملی'' مارچ ۲۰۰۰ء ۲۴-۲۶، مضمون: پروفیسر شفیق احمد ندوی)

(۱) مادیت کے مقابلہ میں ایمانِ راسخ جو مولانا کی تین کتابوں ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، اور معرکۂ ایمان ومادیت'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(۲) عقل پر وحی کی برتری جس کی تشریح مولانا نے اپنے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے خطبوں کے مجموعے ''النبوية والانبياء فى ضوء القران'' اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اپنے لیکچر ''مذہب وتمدن'' (۱۹۴۲) میں کی ہے، جامعہ ملیہ میں مولانا نے یہ لیکچر اس وقت دیا تھا جب ان کی عمر صرف تیس سال کی تھی۔

(۳) قرآنِ کریم سے گہری وابستگی جوان کے قرآنی مطالعوں ''تأملات فى سورة الكهف'' اور قرآن کا مطالعہ کس طرح کریں (المدخل الى الدراسات القرآنية) وغیرہ میں نظر آتی ہے۔

(۴) سنت رسول اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ شیفتگی جو مولانا کی کتاب ''نبی رحمت'' اور سیرتِ رسول (برائے اطفال) اور کاروانِ مدینہ کے مطالعہ سے واضح ہے۔

(۵) روحانیت کی چنگاریوں کو روشن کرنے کا جذبہ جوان کی معرکۃ الآراء کتاب ''ارکانِ اربعہ'' میں اسلامی عبادتوں کے اسرار ومصالح کی تشریح وتفہیم سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۶) مولانا کی دعوتی فکر کی چھٹی خصوصیت مثبت اندازِ فکر اور تعمیری کدوکاوش ہے، جس کی وضاحت ان کی کتابوں ''دو متضاد تصویریں'' اور ''اسلام کی سیاسی تفسیر'' (عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح) کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔

(۷) ساتویں خصوصیت جہاد فی سبیل اللہ کا احیاء ہے، جو ان کی تصانیف ''جب ایمان کی بہائی آئی، سیرتِ سید احمد شہید، اور انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے مطالعہ سے اجاگر ہوتا ہے۔

(۸) اسلامی تاریخ سے سبق آموزی اور عظمائے اسلام کے کارناموں سے عبرت اور جذبے کا حصول جوان کی کتابوں ''**المد والجزر فی تاریخ الاسلام**'' اور ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کی پانچوں جلدوں سے نمایاں ہے۔

(۹) مغربی فکر اور مادہ پرستانہ تہذیب وتمدن پر تنقید بھی ان کی نمایاں خوبی ہے، جو ان کے آکسفورڈ یونیورسٹی کے لیکچر ''مغرب اور اسلام'' اور ''مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں'' اور دیگر کتب سے واضح ہے۔

(۱۰) دسویں خصوصیت جاہلی تعصب اور قوم پرستی کی تردید ہے، جس کی عکاسی مولانا کی درجنوں کتابوں سے ہوتی ہے۔

(۱۱) ردقادیانیت اور عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ جوان کی کتاب ''**النبی الخاتم**'' اور ''**القادیانی والقادیانیة**'' سے ظاہر ہے۔

(۱۲) ذہنی ارتداد کا مقابلہ بھی جوان کی کتاب ''**ردة ولا ابابکر لها**'' سے نمایاں ہے، ان کا امتیاز ہے۔

(۱۳) امتِ مسلمہ کے قائدانہ کردار کا تسلسل اور اس کی بازیابی کی جدوجہد جو ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' اور ''**قیمة الامة الاسلامیة بین الام ودورها فی العالم**'' میں جھلکتی ہے۔

(۱۴) صحابہ کرام کی عظمت جوان کی کتاب ''دو متضاد تصویریں'' اور ''المرتضیٰ'' وغیرہ سے ظاہر ہے۔

(۱۵) مولانا کے فکر کی پندرہویں بنیاد مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس کی بازیابی پر توجہ سے عبارت ہے، مثلاً دیکھئے ان کی کتاب ''مسلمان اور مسئلہ فلسطین''۔

(۱۶) آزاد اسلامی تعلیم وتربیت کی ضرورت پر زور بھی ان کے یہاں کم نہیں، مثال کے طور پر دیکھئے ان کی کتاب ''التربیة الاسلامیة الحرة''۔

(۱۷) بچوں کی تربیت تو ان کا خاص جوہر ہے، مثلاً دیکھئے: ''قصص النبیین'' اور ''قصص من التاریخ'' وغیرہ۔

(۱۸) مبلغین اور مخلص کارکنوں کی تیاری کا جذبہ جوان کے عمومی کارناموں اور تبلیغی ودعوتی مواعظ سے نمایاں ہے۔

(۱۹) اسلامی بیداری اور اسلامی تحریکات کی متوازن رہنمائی اور رفع نزاعِ باہمی جو خود ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں ہے۔

(۲۰) بیسویں اور اہم بنیاد یہ ہے کہ مولانا پوری انسانیت کو مخاطب کرتے ہیں، بائیس سال کی عمر میں مولانا بابا صاحب امبیڈکر سے ملنے بمبئی گئے اور ان کے سامنے دعوتِ اسلام رکھی۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے اپنے ایک دوسرے مقالہ ''فقه الدعوة عند العلامة ابی الحسن'' میں لکھا ہے کہ:

> ''مولانا کی سات خصوصیات قابل رشک ہیں اور وہ ہیں: داعیِ دین کی صفات سے ان کا متصف ہونا اور مواقع کا حصول واستعمال، عقل وحکمت سے سرفرازی، وسعتِ مطالعہ اور کثرتِ معلومات، ادبی صلاحیت وبصیرت اور جیتے جاگتے دل کے ساتھ مردِ مؤمن کے اخلاق وکردار اور صحیح اسلامی عقیدہ سے مزین شخصیت''۔ (ماخوذ از: ماہنامہ ''افکار ملی'' مارچ ۲۰۰۰ء ۲۶، مضمون: پروفیسر شفیق احمد ندوی)

تعلیمی وتربیتی، صحافتی ومعاشرتی، علمی وفکری، سیاسی واقتصادی تمام میدانوں میں مولانا کی دعوتی سرگرمیوں اور خدمات کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، دعوتِ اسلامی کے اسالیب، طریقۂ کار اور اندازِ فکر پر بھی مولانا نے بہت کچھ لکھا اور کہا ہے۔ مولانا نے بجا فرمایا ہے کہ داعی کو وقت کی نزاکتوں، چیلنجوں، مسائل ومشاکل، دشمنانہ سرگرمیوں، معاشرہ وسماج کی ضروریات سے پوری باخبری کے ساتھ مخاطب کی نفسیات، ذہن ومزاج اور مقام موقع کی پوری رعایت بھی کرنی چاہئے۔

مشہور عالم وادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا کا یہ تصریفی (دین کی دعوت مختلف اسالیب سے پیش کرنا) اندازِ بیان سمجھنے کے لئے اور ان کے مقالات کے اندر جو ایک بے چین روح اور دین کی سربلندی کی تڑپ ہے، نیز جو معرفت وآگاہی کے خزانے ہیں، اُن کی قدر اگر کی، تو عرب علماء اور دانشوروں نے کی، وہ ہم سے کہیں زیادہ فراخ دل اور وسیع القلب ثابت ہوئے''۔ (میر کارواں ۲۱۸)

حقیقت واقعہ یہی ہے کہ مولانا کی دعوت وشخصیت سے جتنا استفادہ ممکن تھا وہ برصغیر میں نہ ہوسکا، اور اس میں ہماری بے توفیقی اور بعض موقعوں پر فرقہ وارانہ عصبیت اور قدر ناشناسی کا بڑی حد تک دخل ہے۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مولانا نے جو طریقۂ دعوت اپنایا تھا وہی فطری طرق دعوت ہے، جس میں مقصد کو بار بار مختلف زاویوں سے پیش کیا جائے، اور اس کے فطری ہونے کا ثبوت قرآنِ کریم سے ملتا ہے: ﴿ولقد صرفنا فی ھٰذا القراٰن لیذکروا﴾ ہم نے اِس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہوش میں آئیں۔

مولانا کے دعوتی اور فکری مدرسہ میں بے شمار تلامذہ اور داعیان کی ٹیم تیار ہوئی ہے، مولانا کا یہ دعوتی مدرسہ تخرب اور تعصب کے ان مفاسد سے کوسوں دور تھا جن سے بڑی مشکل سے انسان بچ پاتا ہے، اور جن کا شکار بہت سی تحریکات ہوچکی ہیں، اِس مدرسہ کا یہی امتیاز ہے

کہ اس میں اعتدال، سہولت ونرمی اور حسن اخلاق کا جوہر گرانمایہ ملتا ہے اور تشدد وتنگی، افراط وتفریط اور بے اعتدالیوں کا دور دور تک نام ونشان بھی نظر نہیں آتا۔

دعوتِ اسلامی وہ محور ہے جس کے گرد مولانا کی ساری زندگی گھومتی رہی ہے، وہ سفر ہو یا حضر، صحت ہو یا مرض، فراخی ہو یا تنگی، ہر مرحلہ اور ہر موقع پر مولانا نے اپنا داعیانہ کردار باقی رکھا اور زندگی اسی میں گذار دی، انہیں دینی ودعوتی مقاصد وجذبات کے ساتھ مولانا ایک عرصہ تک مولانا مودودیؒ کے ساتھ رہے، بعض اسباب (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے) کی بنیاد پر ان سے الگ ہوئے اور پھر رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا کام ایک مدت تک انجام دیتے رہے اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں تا آخر باقی رہا۔

مولانا کا تعلق اس خانوادۂ نبوت سے تھا جس کی فیض رسانیوں نے عالم کا نقشہ بدلا اور ذہن ودماغ تبدیل کئے تھے، اِسی خانوادہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ جیسی شخصیت وجود میں آئی تھی، جس نے شعائرِ اسلامیہ کو از سرِ نو اس ظلمت کدۂ ہند میں زندہ کیا تھا اور روحِ جہاد پھونکی تھی، باطل پرستوں سے دو بدو مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں اپنی جانِ عزیز کی قربانی پیش کی تھی، اسی خاندانِ عالی مقام سے مولانا کا تعلق تھا، ان کی سیرت وکردار کو اسلامی سانچہ میں ڈھالا گیا تھا، دعوتی وفکری ماحول میں ان کی نشو ونما ہوئی تھی، مشفق ماں نے ان کے لئے رو رو کر بارگاہِ الٰہی میں داعی بنانے کی جو دعا کی تھی وہ مقبول ومستجاب ہوئی تھی، تقویٰ وصلاح نے مولانا کی زندگی قابل رشک اور بے مثال بنادی تھی، مولانا کی داعیانہ شخصیت کی تعمیر میں خاندان، ماحول، وسیع ومتنوع ثقافت اور معاصر علماء ومشائخ اور مفکرین واصحابِ کمال سے ربط وتعلق کے اثرات بہت گہرے نظر آتے ہیں، مولانا اپنے آغاز ہی سے داعی ومصلح تھے، ان کا یہ مزاج وفکر ان کی تالیفات ومضامین اور خود عملی زندگی سے نمایاں ہے، وہ ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوتِ اسلام دینے بمبئی تشریف لے گئے تھے، اس وقت مولانا کی عمر کل ۲۱ رسال کی تھی،

مولانا نے ڈاکٹر امبیڈکر سے بڑی سفائی سے فرمایا تھا:

''ڈاکٹر صاحب! آپ سے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے لوگ ملے ہوں گے، اورانہوں نے اونچی اونچی باتیں کہی ہوں گی، میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اگر آپ کو اپنی اوراپنی برادری کی نجات کی فکر ہے اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے، تو میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۱۵۹)

اب یہ تقدیری بات تھی اور گویا آیت قرآنی: ﴿انک لاتہدی من احببت ولکن اللہ یہدی من یشاء﴾ (اے نبی! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) کی تفسیر تھی کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے اسلام کے بجائے اپنی پ/ری قوم کے ساتھ بدھ مت کا انتخاب کرلیا اوراس انتخاب کی غلطی کا احساس انہیں اپنی زندگی ہی میں ہوگیا تھا۔ بہرحال مولانا نے تازندگی اپنا یہ داعیانہ منصب بحال رکھا اور زبان وقلم سے جہاد میں مشغول رہے، ان کی پوری زندگی دعوت الی الاسلام کا دوسرا نام ہے، موت بھی قابل رشک پائی، اورجیسا کہ بیان کرنے والوں نے بیان کیا کہ مولانا نے آخری ہچکی سورۂ یٰس کی آیت: ﴿انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمن بالغیب فبشرہ بمغفرۃ واجر کریم﴾ (آپ تو صرف اس شخص کو خبردار کرسکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے، اے مغفرت اوراجر کریم کی بشارت دے دیجئے) پڑھتے ہوئے لی، جو بجا دور پر آیتِ دعوت انذار ہے۔

مشہور ادیب شیخ علی طنطاوی مرحوم نے مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

''برادرم! ابوالحسن! آپ اپنی جماعت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم ودائم رہئے، میری رائے میں اس وقت آپ کے سوا کسی اور داعی کا اسلوب اور طریقۂ کار اتنا متوازن اور معتدل نہیں ہے''۔ (مقدمات الشیخ علی الطنطاوی ۱۱۱)

تاریخ دعوت وعزیمت (رجال الفکر والدعوۃ) مولانا کی بلند پایہ اور مشہور ترین تصنیفات میں ایک ہے، جس میں مولانا نے مجددین وداعیان کا بڑی تفصیل سے تذکرہ فرمایا

ہے، حضرت مولانا علی میاںؒ بھی بلاشبہ انہیں مجددین وداعیان میں ایک ہیں، دعوت وعزیمت ان کا خصوصی مزاج وطبیعت بن گئی تھی، اس لئے وہ بجاطور پر تاریخ دعوت وعزیمت میں جگہ پانے کے مستحق اور اہل ہیں۔

مولانا کی دعوت کا بنیادی امتیاز اخلاص اور استغناء ہے، دعوتی سرگرمیوں میں کبھی مولانا کو عجب وکبر اور حرص چھوکر بھی نہیں گذرا، استغناء اور مادی چیزوں سے مولانا کا بعد وزہد ہی ان کی اور ان کی دعوت کی مقبولیت، محبوبیت اور تاثیر کا اصل سبب تھا، مولانا نے اپنی دعوتی سرگرمیوں؛ بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اسی پیغمبرانہ اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور اپنایا جسے قرآنِ کریم نے بار بار دہرایا ہے: ﴿وما اسألكم عليه من اجر ان اجرى الا على رب العلمين﴾ (میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے)

واقعہ یہ ہے کہ اخلاص واستغناء کی تفسیر اس سے زیادہ جامع اور مکمل تعبیر میں نہیں کی جاسکتی، اور اسی وصف نے مولانا کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندانی وارث ہونے کے ساتھ ہی روحانی وارث وامین بھی بنادیا تھا، جس سے بڑا امتیاز میری نظر میں اس دنیائے آب وگل میں کوئی اور نہیں ہوسکتا:

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

نوٹ: عربی حوالوں میں ترجمہ مضمون نگار کے قلم سے۔

❐❖❐

حضرت مولانا علی میاںؒ کا جماعتِ اسلامی اور

مولانا مودودیؒ سے تعلق

جماعتِ اسلامی برصغیر ہندو پاک میں عصرِ جدید کی ایک منظّم تحریک ہے، اور تعلیم یافتہ ودانشور طبقہ پر سب سے زیادہ اثر اس تحریک کا ہی پڑا ہے، جماعت کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا شمار بیسویں صدی کے نامور مفکرین اور داعیوں میں ہوتا ہے، حضرت مولانا علی میاںؒ ۱۹۳۴ء کے بعد ہی سے ان سے واقف ہوگئے تھے اور انہوں نے ندوۃ العلماء میں تدریس کے دوران مولانا مودودیؒ کی کتابوں اور مقالات سے کافی استفادہ بھی کیا تھا اور اس استفادہ کا رنگ بھی مولانا علی میاںؒ کی تحریروں میں نمایاں ہوا تھا۔

ملاقات پہلی بار اگست ۱۹۳۹ء میں لاہور میں ہوئی، مولانا محمد منظور نعمانی ودیگر رفقاء بھی ساتھ ہی تھے، مراسلات کا آغاز اگست ۱۹۴۰ء سے ہوا، مجلّہ الندوہ میں ''میری محسن کتابیں'' کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا، اس کے لئے مولانا علی میاںؒ نے مولانا مودودیؒ کو بھی دعوت دی، اس کے جواب میں مولانا مودودیؒ نے جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم ہی ان کی اصل محسن کتاب ہے۔ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں اسے پڑھئے، کتنا پیارا اسلوب ہے:

> ''میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے، اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا ہے، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں، حقیقت اس طرح برملے مجھے دکھائی دیتی ہے، گوئی اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے، انگریزی میں اس کنجی کو شاہ کلید (Master key) کہتے ہیں، جس سے ہر قفل کھل جائے، سو میرے لئے یہ قرآن شاہ کلید ہے، مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں، وہ کھل جاتا ہے، جس خدا نے یہ کتاب

بخشی ہے، اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے''۔ (پرانے چراغ ۳۰۶/۲)

اس جوابی مکتوب میں مولانا مودودیؒ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''پردہ'' کے عربی ترجمہ کی خواہش ظاہر کی اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ندوہ کے سوا کسی اور مرکز کی طرف نظر نہیں جاتی، براہِ کرم آپ کسی ایسے صاحب کو اس کام پر مامور فرمائیں، جو جیتی جاگتی زبان میں اسے منتقل کر سکیں''۔ (پرانے چراغ ۳۰۵/۲)

جنوری ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودی لکھنؤ تشریف لائے، ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں قیام ہوا، لکھنؤ کے لوگوں میں وہ سب سے زیادہ مانوس مولانا علی میاںؒ ہی سے تھے، اس موقع پر مولانا علی میاںؒ کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی شگفتگی، اخلاق اور مقصد کی لگن اور تڑپ سے بے حد متأثر ہوئے۔

اس دوران جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آ چکا تھا، مولانا علی میاںؒ اپنے رفیق قدیم مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ساتھ جماعت میں شامل اور مولانا مودودی کے ہم خیال ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۲ء مولانا مودودیؒ پھر لکھنؤ آئے اور مولانا علی میاںؒ کی خواہش پر انہوں نے جمعیۃ الاصلاح طلبہ ندوۃ العلماء کے اجلاس میں اپنا مقالہ ''نیا تعلیمی نظام'' کے عنوان سے پڑھا اور مولانا ہی کی سفارش پر انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ''نوعِ انسانی کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل'' کے عنوان سے وقیع مقالہ پیش کیا، لکھنؤ میں مولانا مودودیؒ کا پروانہ وار استقبال ہوا۔

فروری ۱۹۴۲ء میں لاہور میں جماعت اسلامی کی عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا، مولانا علی میاںؒ اس میں شریک ہوئے، اس وقت مولانا مودودیؒ کے بعض افکار و نظریات کی مخالف ہندوستان کے مشہور اہل قلم فاضل افراد کر رہے تھے، اس لئے یہ تجویز بھی آئی کہ مولانا مودودیؒ فی الحال جماعت کی امارت سے سبک دوش ہو جائیں، اور مولانا امین احسن اصلاحی کو امیر مقرر کر دیا جائے، اس موقع پر مولانا علی میاںؒ کی تائید مولانا مودودیؒ کے حق میں تھی، مولانا علی میاںؒ کا یہ خیال تھا کہ اس مصنوعی رد و بدل کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جماعت کا وجود

مولانا مودودیؒ ہی کی کوششوں اور تحریروں کا رہین منت ہے، اس کا انتساب بدستور انہیں کی طرف رہے گا، اس رائے کے مطابق فیصلہ ہوا، اور مولانا مودودیؒ ہی امیر جماعت رہے۔

اکتوبر ۱۹۴۲ء میں جماعت کی مجلس انتظامیہ کا دوسرا اجلاس دہلی میں ہوا، مولانا علی میاںؒ اس میں شریک رہے، اس کے بعد مولانا مودودیؒ کے ہمراہ علی گڈھ میں ایک دو دن قیام رہا اور یونیورسٹی میں مولانا مودودیؒ کی مقبولیت اور محبوبیت کا اندازہ ہوا، اس دوران مولانا مودودیؒ جماعت کا ایک عربی آرگن نکالنا چاہتے تھے، مولانا علی میاںؒ نے یہ رائے دی کہ پرچہ کے اجراء سے پہلے کا کام یہ ہے کہ عربی میں مضامین کا ترجمہ کر کے انہیں عالم عربی کے مؤقر جرائد میں طبع کرالیا جائے، مولانا مودودیؒ نے یہ ذمہ داری مولانا علی میاںؒ ہی کو سپرد کرنا چاہی؛ لیکن انہوں نے مولانا مسعود عالم ندویؒ کو اس کام کے لئے موزوں بتایا، چناں چہ انہیں کا انتخاب ہوا، اور پہلے جالندھر میں پھر مغربی پنجاب میں ''دارالعروبۃ'' قائم ہوا اور یہ کام شروع کر دیا گیا، مولانا مسعود عالم ندویؒ نے جماعت کے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر کے جماعت کو عالم عربی میں متعارف کرانے کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی، مولانا علی میاںؒ تقریباً تین سال تک لکھنؤ کی جماعت کے امیر رہے، اس دوران انہیں تین چیزوں کا شدت سے احساس ہوا، ایک تو یہ کہ مولانا مودودیؒ کے سلسلہ میں جماعت کے معتقدین ومنتسبین بڑے غلو ومبالغہ سے کام لے رہے ہیں، جس کا نتیجہ دوسرے داعیوں اور مفکرین سے بیزاری اور بیگانگی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے، جو بہت ہی خطرناک ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ تنقید میں بہت بے باک ہو گئے ہیں اور علماء کرام اور دیگر دینی حلقوں پر طعن وتشنیع کا مزاج رکھتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ان میں کوئی دینی تڑپ، اصلاح کا نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں اضافہ کی کوشش سنجیدگی سے نہیں ہو رہی ہے، یہ وہ اسباب تھے جو مولانا کے لئے مولانا مودودیؒ کی تحریروں سے متأثر ہونے اور انجذاب کے احساس کے ساتھ افسردگی اور تکلیف کا

سبب بنے، اور یہ احساس ہوا کہ کام عملی حدود تک نہیں پہنچ پا رہا ہے، چناں چہ جماعت سے تعلق میں فرق آنا شروع ہوا، دوسری طرف ۱۹۴۰ء کے بعد ہی سے مولانا کا ربط شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی تحریک دعوت سے بڑھا، یہ رجحان بڑھتا گیا اور مولانا کے دل کو وہاں تسلی ملی، اس ذہنی کشمکش کی اطلاع مولانا نے خود ہی مولانا مودودیؒ کو دی، جس کے جواب میں مولانا مودودیؒ نے انہیں یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۳ء میں مولانا علی میاںؒ جماعت سے علیحدہ ہو گئے اور جماعت تبلیغ سے منسلک ہو کر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے، علیحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا اور پھر بھی مولانا مودودیؒ اور جماعت کے افراد خصوصاً اپنے رفیق مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ سے مولانا علی میاںؒ کے روابط آخر تک بڑے اچھے رہے، اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مارچ ۱۹۴۴ء میں مولانا علی میاںؒ پٹھان کوٹ میں دارالاسلام میں مولانا مودودیؒ کے مہمان بھی رہے، مولانا مودودیؒ نے غایت محبت وتعلق کا معاملہ کیا، اسٹیشن پر آ کر رخصت کیا، مولانا کے رسالہ "**دعوتان متنافستان**" کو بے حد پسند کیا اور سراہا۔

یہ صرف رائے اور نظریہ کا اختلاف تھا جو کبھی نفرت وعداوت اور ذاتی بغض وعناد کی سرحد سے نہیں مل سکا، مولانا مودودیؒ کی مخالفت میں مولانا علی میاںؒ کبھی بھی تکفیر وتفسیق اور تضلیل کی ان حدوں کو نہیں پہنچ سکے، جہاں تک مولانا مودودیؒ کے شدید ناقدین پہنچے، اس کی وجہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں مولانا علی میاںؒ کی خاندانی نجابت وشرافت، اعتدال، حق پرستی اور ذاتی وشخصی تعصب وعناد سے بعد ونفرت ہی کو دخل رہا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۴ء میں مولانا علی میاںؒ نے مولانا مودودیؒ سے لاہور سینٹرل جیل میں ملاقات کی، پھر جون ۱۹۵۶ء میں دمشق کی مؤتمر اسلامی کانفرنس میں ملاقات رہی، جس میں مولانا مودودیؒ کے اصرار پر ان کی تقریر کا دوبار مولانا علی میاںؒ نے عربی میں ترجمہ

بھی کیا، پھر ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا قیام عمل میں آیا، تو ان اداروں کے سالانہ جلسوں اور میٹنگوں کے موقع پر بار بار ملاقات کا سلسلہ جاری رہا، آخری ملاقات جولائی ۱۹۷۸ء میں لاہور میں ہوئی، مولانا مودودیؒ نے بڑی محبت سے ملاقات کی، گفتگو میں جنرل ضیاء الحق کا ذکر آیا تو مولانا مودودیؒ نے کہا کہ انہیں کسی طرح ناکام نہیں ہونے دینا چاہئے، مولانا نے ''تحریک پیام انسانیت'' کا تعارف کرایا تو مولانا مودودیؒ نے کہا کہ اصلاحِ معاشرہ کے لئے اس طرح کی تحریکوں کی پاکستان میں بھی ضرورت ہے۔ (کاروانِ زندگی ۲/۲۶۹)

مولانا علی میاںؒ کے بقول جماعت اسلامی اور مولانا مودودی سے ان کے ربط وتعلق کا اصل سبب مولانا مودودی کے وہ تنقیدی اور مؤثر مقالات ومضامین تھے، جن میں مغربی تہذیب کے فلسفہ زندگی اور مادہ پرستانہ موقف کی شدت سے مخالفت کی گئی تھی (ان میں سے اکثر مضامین تنقیحات میں شامل ہیں) اس مسئلہ میں مولانا علی میاںؒ مولانا مودودیؒ کے پورے مؤید، معاون اور مداح رہے، اور مولانا مودودیؒ کی ذہانت، ذہن کی صفائی ورسائی اور جدید اسلوب میں تحریر وتفہیم کی امتیازی قوت وقدرت کو ان کا اصل جوہر سمجھتے رہے۔ مولانا نے لکھا ہے:

''واقعہ یہ ہے کہ اس جدید تعلیم یافتہ نسل پر ذہنی وعلمی طور پر مولانا مودودی نے گہرا اور نہایت وسیع اثر ڈالا ہے، انہوں نے اس نسل کی صدہا بے چین روحوں، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے؛ بلکہ اس کا گرویدہ بنانے اور اس کے دل ودماغ میں اسلام کا اعتماد ووقار بحال کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے، جہاں تک اس تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کا تعلق ہے اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف ومفکر ان کا مقابل وہمسر ملے گا، مولانا مودودیؒ کے بعض خیالات وتحقیقات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تحریروں اور مضامین مغرب کی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کے گہرے مطالعہ اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں، انہوں نے ایسے مبصرانہ اور جرأت مندانہ انداز میں اس کی تنقید اور اس کے علمی تحلیل وتجزیہ کا فرض انجام

دیا ہے، جو خود اعتمادی سے بھرپور اور مرعوبیت وسطحیت سے دور ہے''۔ (پرانے چراغ ۲/۳۰۰)

نئی نسل میں اسلام پر اعتماد اور اسلام کی سربلندی، اسلامی حکومت کے قیام وضرورت کا جذبہ جو مولانا مودودیؒ نے پیدا کیا، وہ ان کی ایسی خدمت ہے جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی؛ لیکن دین کی وہ جدید تفہیم وتشریح جو مولانا مودودی کی کتابوں ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، تفہیمات، رسائل ومسائل'' وغیرہ میں پائی جاتی ہے، اور جس میں سیاسی رنگ نمایاں اور تزکیۂ باطن کا عنصر دبا ہوا ہے، اس سے مولانا علی میاںؒ کبھی متفق نہیں رہے، اسی طرح بعض صحابۂ کرام کے سلسلہ میں جو سوءادب مولانا مودودی کے قلم سے سرزد ہوگیا ہے وہ بھی مولانا علی میاںؒ کو کبھی پسند نہیں رہا، اور ان کی بے اطمینانی بڑھتی گئی، مولانا علی میاںؒ نے جماعت اسلامی سے اپنی علیحدگی وبے اطمینانی کے اسباب کے اظہار میں ہمیشہ احتیاط کا دامن تھامے رکھا اور ایسی باتیں کبھی نہیں کہیں جن سے غلط مقاصد حاصل کیا جاسکے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

> بے اطمینانی کے اسباب ریاضی واقلیدس کے قواعد کی طرح بندھے ٹکے لفظوں اور ضابطوں کی شکل میں بیان نہیں کئے جاسکتے، اس کے اسباب مختلف النوع ہوسکتے ہیں، ان کا تعلق تعلیم وتربیت، ماحول کے اختلاف، وہ شخصیتیں جن سے آدمی متأثر ہوتا ہے، ان کی رنگارنگی، ذاتی تجربات، موروثی وخاندانی اثرات، ذہنی ارتقاء اور مطالعہ کے نتائج سے بھی ہوسکتا ہے''۔ (پرانے چراغ ۳۱۵)

اس طرح کے سوالات کے جوابات میں مولانا اپنی تصانیف ''تاریخ دعوت وعزیمت، تزکیہ واحسان، ارکانِ اربعہ، منصب نبوت'' وغیرہ کے مطالعہ کی طرف رہنمائی کرتے تھے؛ لیکن پھر جب مولانا علی میاںؒ نے دین کی اس جدید تفہیم (جو مولانا مودودی کے علاوہ سید قطب شہید نے بھی اپنائی ہے) کا اثر برصغیر اور بلادِ عربیہ کے نوجوانوں کی تحریر وتقریر اور فکر وخیال میں نمایاں دیکھا اور فکر وعمل اور سعی وجہد کی پٹری بدلتی دیکھی، تو سب سے پہلے اپنی عربی کتاب ''النبوة والأنبياء في ضوء القرآن'' کے تیسرے ایڈیشن (اور اس کے اردو ترجمہ ''منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین'' کے دوسرے ایڈیشن) میں اس پر ایک

مختصر نوٹ لکھا، پھر مولانا نے اپنی دیانت کا تقاضا سمجھتے ہوئے اگست ۱۹۷۸ء میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا، جو ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کے عنوان سے طبع ہوا اور اس کا عربی ترجمہ ''التفسیر السیاسی للاسلام'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا، مولانا نے اس کتاب میں یہ التزام کیا ہے کہ مولانا مودودی کی خدمات اور تصنیفی انفرادیت کے اعتراف کے ساتھ کہیں کوئی طنزیہ جملہ یا تیز لفظ نہ آنے پائے، اس میں مولانا پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں، مولانا نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

''پیش نظر کتاب ایک علمی واصولی تبصرہ وجائزہ ہے، وہ نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، نہ فقہ وفتویٰ کی زبان میں، وہ ایک اندیشہ کا اظہار ہے اور ''الدین النصیحۃ'' (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے حکم پر عمل کرنے کی مخلصانہ کوشش، اس کی کوئی سیاسی غرض ہے نہ کوئی جماعتی مقصد۔ اس ناخوش گوار کام کو محض عند اللہ مسئولیت وشہادت حق کے خیال سے انجام دیا گیا ہے، جو لوگ دین کی سنجیدہ اور مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہیں، ان میں طلب حق کی سچی جستجو اور اپنی دینی ترقی وتکمیل کا جذبہ صادق پایا جاتا ہے، انہوں نے ہمیشہ صحت منداور تعمیری تنقید اور مخلصانہ مشورہ کی قدر کی ہے، اور فکر وسعی اسلامی کی طویل تاریخ میں دین کے صحیح فہم وتفہیم اور اسلام کی صیانت وحفاظت میں اس سے ہمیشہ مدد لی گئی ہے''۔

(عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح ۶، طبع دوم)

مولانا نے یہ کتاب طبع ہونے کے بعد مولانا مودودی کی خدمت میں بھیجی، تو انہوں نے اپنے جوابی مکتوب میں لکھا:

''میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ میری جس چیز کو آپ نے خدشات کا موجب سمجھا اس پر تنقید فرمائی، مزید میری جن جن چیزوں کو آپ دین اور اہل دین کے لئے مضرت رساں یا موجب خطرہ سمجھتے ہوں ان پر بھی بلا تکلف تنقید فرمائیں، میں نے کبھی اپنے کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا، نہ میں اس پر برا مانتا ہوں؛ البتہ یہ ضروری نہیں کہ میں ہر تنقید کو برحق مان لوں اور ناقدین کے بیان کردہ خدشات اور اندیشوں کو صحیح تسلیم کرلوں''۔ (پرانے چراغ ۲/۳۱۷)

مولانا مودودیؒ کا یہ ردعمل ہندوستان میں جماعت کے متفق حلقوں کے ردعمل سے بے حد مختلف رہا، آخری عمر میں مولانا مودودیؒ کو مزید احساس ہو چلا تھا کہ خلافتِ اسلامیہ کے قیام کے لئے معاشرے کے افراد کی دینی اخلاقی تربیت اور سیرت سازی و تعمیرِ کردار پر پہلے سے اور زیادہ زور دینا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے روحانی و باطنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے (خواہ اس کا کچھ بھی نام رکھا جائے اور تصوف کے مروجہ طریقوں سے کتنا ہی احتراز کیا جائے) اور اگر ان کو مہلت ملتی تو اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کے قیام پر بھی اور زیادہ زور دیتے اور اس کے لئے اپنی توجہ کو مرکوز کر دیتے۔

مولانا علی میاںؒ کی یہ کتاب (عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح) اپنے اسلوبِ نگارش کے لحاظ سے بہت مثبت اور معیاری ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ حکمت و مصلحت، اعتدال وتوازن، ایجابی ومثبت تعمیری انداز، افہام و تفہیم کی مخلصانہ کوشش، تہذیب وشائستگی کے التزام، طعن و تشنیع اور سخت جملوں سے احتراز، ذاتی تعصب وعناد سے بعد اور محض حق وصدق کے اظہار واقرار کے جذبات کی پوری رعایت کے ساتھ مولانا علی میاںؒ نے جو طریقہ اپنایا وہی طریقہ اگر اس حلقے اور طبقے نے بھی اپنا ای ہوتا جس نے اپنی تنقیدوں میں لہجہ کی شدت اور طعن و تشنیع سے کام لیا (اگرچہ اس کے جواب الجواب میں جماعت کے بعض منتسبین نے بھی کچھ کم شدت پسندانہ رویہ نہیں اپنایا، جن میں مرحوم مدیر ''تجلی'' مولانا عامر عثمانی وغیرہ سرفہرست تھے) اور اگر مخلصانہ افہام واصلاح کی سعی پیہم کی جاتی، تو شاید حالات ایسے نہ رہتے اور بہت کچھ تبدیلی ہوتی؛ لیکن تدبیر کی بے بسی اور تقدیر کی کارفرمائی مسلمہ حقیقت ہے، اسے کیسے ٹالا جاسکتا ہے؟ **وکان امر اللہ مفعولاً**۔

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں پرانے چراغ دوم اور کاروانِ زندگی اول سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاسؒ
اور جماعتِ تبلیغ سے
حضرت مولانا علی میاںؒ کا ربط و تعلق

بلاخوف وتردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ برصغیر ہندو پاک کی اس صدی کی سب سے کامیاب دعوتی تحریک وہ تبلیغی تحریک ہے جسے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے فہیم ومدبر انسان نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں میوات کے کوردہ علاقہ اور وہاں کے اکھڑ جاہل باشندوں سے شروع کرکے پورے ہندوستان میں پھیلا دیا۔

رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ اور ان کی دعوت وتبلیغ سے حضرت مولانا علی میاںؒ کا ربط ان کی زندگی کا ایک اہم اور تاریخی موڑ ہے، جس سے اُن کی خداداد فطری صلاحیتوں کا نشو ونما ہوا۔ یہ ۱۹۴۰ء کی کہانی ہے کہ جب مولانا نے اپنے رفیق قدیم مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ہمراہ ہندوستان کے دینی مراکز اور دینی سرگرمیوں اور تحریکوں کا مشاہدہ کرنے کے مقصد سے رختِ سفر باندھا اور دہلی میں نظام الدین کی کی مسجد میں فروکش ہوئے، یہیں اس مردِ خود آگاہ (مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ) سے ملاقات وزیارت ہوئی، جو ایک جہاں دگر گوں کرنے اور ایک عالم فتح کرنے کا عزمِ ایمانی اور جوشِ مردانہ لے کر اٹھا تھا، اور جسے اللہ نے قبولیت وشہرت کے اس بامِ عروج تک پہنچایا کہ اس کے ثمرات آج تک محسوس ومشاہد ہیں۔ رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے جس شفقت اور گرم جوشی سے اور جذبِ دل

کی خاص کیفیت کے ساتھ ملاقات کی، اس کا اثر مولانا علی میاں کے دل پر اتنا گہرا ہوا کہ اس دعوتی کام میں زندگی لگا دینے اور ہمہ تن منہمک ہوجانے کا شدید داعیہ پیدا ہوا، پھر یہی مولانا کی تبلیغی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بنا، پوری زندگی مولانا نے دعوتی وتبلیغی ذمہ داریاں انجام دینے میں صرف کردی اور پھر بھی یہی احساس دامن گیر رہا کہ:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پہلی ملاقات کے بعد مولانا علی میاں لکھنؤ تشریف لاتے ہیں، اندر جوش وجذبہ ابل رہا ہے، دل بے قرار ہے، دماغ صرف اسی مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال ہورہا ہے، نہ دن کی پرواہ ہے نہ رات کی خبر، نہ راحت وسکون کا پتہ ہے اور نہ عیش آرام کی خواہش، ہر لمحہ ولحظہ صرف یہی تمنا اور کوشش ہے کہ ایمان وعمل لوگوں کے دلوں میں اور زندگیوں میں رچ بس جائے، ہر دم اسی کی جستجو اور آرزو ہے، یہی دلچسپی کا سامان ہے اور توجہ کا مرکز بھی، پھر اس حقیقت پر یقین بھی ہے کہ:

نشانِ منزلِ جاناں ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

کبھی ندوۃ العلماء کے طلبہ کے ساتھ اس محلّہ میں جارہے ہیں، کبھی اُس علاقہ میں پہنچ رہے ہیں اور ہر جگہ تجدیدِ ایمان، تلقینِ دین اور تبلیغِ نماز کا پیغام دے رہے ہیں۔

ان مخلصانہ سرگرمیوں کی اطلاع جب رئیس التبلیغ تک پہنچتی ہے، تو ان کے دل کی مسرت کا عالم نہ پوچھئے، قلب وجگر شاد شاد ہوجاتے ہیں، بے قراریوں کو قرار، خلش وتپش اور اضطراب وقلق کو سکون محسوس ہوتا ہے۔ اور حضرت مولانا علی میاںؒ کے جوہر کھلتے ہیں، تو پھر محبت وشفقت کا ایک اتھاہ سمندر رئیس التبلیغ کے دلِ دردمند میں موجیں مارتا ہے، کبھی اپنے مکتوب میں ''عمدۃ الآمال والامانی'' سے مخاطب ہوتے ہیں، تو کبھی ''جوہر تاباں، معدنِ

سیادت، سیدی وسید عالم، سلالۂ خاندانِ نبوت'' جیسے بلند پایہ الفاظ سے خطاب فرماتے ہیں۔ کبھی لکھتے ہیں کہ:

''آں محترم کی توجہاتِ عالیہ سے تبلیغ کو جس قدر نفع پہنچا ہے اب تک لگنے والوں میں کسی سے نہ ۸ یں پہنچا، میرا ضمیر شہادت دے رہا ہے کہ یہ کام دراصل آپ جیسے اہل اور خاندانِ نبوت ہی کے کرنے کا ہے''۔

(مکاتیب مولانا محمد الیاس صاحبؒ، ص: ۸، ۱۷، ۲۱، ۲۶، ۳۴، ۵۱، ۸۱، ۸۲ وغیرہ مختصراً)

کبھی یوں فرماتے ہیں کہ:

''مولانا میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں، آپ کی کیا تعریف کروں، تعریف کرنا محبت کا اوچھاپن ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۲۸۶ مختصراً)

حضرت مولانا علی میاںؒ پورے طور پر جماعت تبلیغ اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ترجمان بن گئے تھے، رئیس التبلیغ کو جتنا اعتماد اور توقع آپ سے تھی، غالباً کسی اور سے نہ تھی، مولانا علی میاںؒ کے تلامذہ اور رفقاء نے بھی تعاون میں کبھی دریغ نہیں کیا اور یہ کارواں بڑھتا گیا۔ کوئی دور سے دور جگہ اسے دور اور مشکل سے مشکل مرحلہ اسے مشکل معلوم نہیں ہوا، مولانا کی ہمت وحوصلہ وعزم کا طائر بلند پرواز کسی بلند سے بلند شاخ پر بھی آشیانہ بنانے کو آمادہ نہ ہوا، اور اپنی برق رفتاری اور طبیعت کی بے قراری وبے تابی سے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں اور دنوں میں کرلیا، یہ دل کی ایمانی قوت اور جذبہ حمایتِ دین کا واضح نتیجہ تھا۔

اس کے بعد تبلیغی اسفار مولانا کے اتنے شروع ہوئے کہ بالکل فرصت نہیں رہی، اسی دوران ستمبر ۱۹۴۲ء میں ندوۃ العلماء کی تدریس سے طویل رخصت لی، اور تبلیغی سرگرمیوں میں منہمک رہے، جولائی ۱۹۴۴ء میں رئیس التبلیغ اس دنیا سے رخصت ہوئے، ان کے صاحب زادے مولانا محمد یوسف صاحبؒ کو امیر جماعت منتخب کیا گیا، ان کا زمانہ جماعتِ تبلیغ کے عروج کا زمانہ بن گیا، ملک وبیرونِ ملک یہ سلسلہ اتنے زور وشور سے پھیلا کہ کوئی بھی سیل تیز وتند اور

سنگ گراں اس کی راہ میں حائل نہ ہو پایا، اسے وہ قبولیت محبوبیت اور ہر دل عزیزی نصیب ہوئی کہ مخالفین بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ اس کی مقبولیت عنداللہ کا مظہر ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ اب بھی اسی انداز میں اس خدمت میں مصروف رہے، ''حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت'' نامی کتاب بھی لکھی، جو بہت مؤثر و مقبول ہوئی، حضرت مولانا نے حجازِ مقدس اور عالم عرب تک اس کام کو پہنچایا اور اپنا قیمتی وقت اس قیمتی کام میں صرف کرتے رہے، اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی انداز میں آخر تک چلتا رہا۔

یہاں یہ حقیقت واضح کرنی بھی نامناسب نہ ہوگی کہ مولانا ایک وسیع اور متنوع ثقافت کے حامل تھے، ان کا ایک وسیع و عمیق فکری و علمی پس منظر (Back Ground) تھا ہر دور میں مولانا منصوصات و غیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں فرق کرتے رہے، اور ان کا خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا، وہ حالات کے تقاضوں کو جانتے تھے، نبض شناس تھے، ان کا یہ خیال تھا کہ ہر تحریک و دعوت اور ادارہ میں جو خدمتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے مقاصد و اغراض پر قائم ہوا، نمو و ارتقاء اور حرارت و دوام کے لئے زندگی اور اس کے مسائل سے باخبری اور جائز اور لازمی حد تک اس کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش و سعی بہت ضروری ہے، اس کے بغیر تحریکیں اور ادارے نمو اور زندگی کی صلاحیتوں سے محروم اور جامد ہو جاتے ہیں، اور ان کی افادیت آفاقی نہیں رہ جاتی محدود ہوتی اور سکڑتی چلی جاتی ہے، یہ خیالات جو مولانا کے خاص مطالعہ اور ذہنی ساخت کا نتیجہ تھے، ہر دور میں مولانا کے ساتھ رہے، اور:

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

یہ خیال رئیس التبلیغ کی وفات کے بعد بڑی شدت سے مولانا کے دل میں ابھرا، مولانا نے امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر ارکان کے سامنے اس کام کو زیادہ

منظّم اور مؤثر اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے پرکشش اور اطمینان بخش بنانے کے لئے طریقۂ کار اور انداز واسلوب میں کچھ تبدیلیوں اور اضافوں کی تجویز پیش کی؛ لیکن ارکان وذمہ داران کے ذہنوں نے یہ تجویز قبول نہ کی، ایسا شاید رئیس التبلیغ کی وفات کے بعد دعوت کے اس ابتدائی مرحلہ میں احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے ہوا۔

یہ تجویز مولانا نے کئی بار پیش کی، مگر اسے قبول نہ کیا جاسکا، دوسری طرف جماعت چوں کہ مخلصانہ اساسوں پر تعمیر ہوئی تھی اور امیر جماعت کے مستقل انہماک کی برکت تھی کہ اس کام کا فائدہ اور دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا تھا، عملی زندگیوں میں اصلاح وتبدیلی کے اثرات بے حد نمایاں تھے، ان سب کے پیش نظر مولانا نے اپنی تجویز پھر پیش نہ کی۔

لیکن چوں کہ مولانا کا ذہن وخیال تبدیلیاں چاہتا تھا اور دعوت کے اس کام کی آفاقیت اور عالمیت کو مزید بڑھانا چاہتا تھا، اور اس داعیہ وخیال پر کنٹرول خارج از استطاعت تھا، اس لئے مولانا نے مرکز سے تعلق اور دعوت کی مصروفیات کو باقی وجاری رکھنے؛ لیکن اپنے دائرۂ کار اور دائرۂ اختیار میں اس کو بیش از بیش سودمند اور مفید وبارآور بنانے اور حالات وماحول کے تقاضوں کی رعایت ولحاظ رکھنے اور دعوت وتبلیغ اور افہام وتفہیم میں اپنا اسلوب اور زبان استعمال کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ (یہ تفصیلات کاروانِ زندگی اول میں موجود ہیں، دیکھئے: باب یازدہم)

اور اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا، نہ تو مولانا کے دل میں ارکانِ جماعت کی طرف سے کوئی میل آیا اور نہ ہی ارکانِ جماعت کے دلوں میں مولانا سے کوئی بعد اور بیزاری پیدا ہوئی، ملاقاتوں، آمد ورفت، مراسلات اور دعوتی سرگرمیوں کو کامیاب بنانے کی کوششوں میں شرکت کا سلسلہ جاری رہا، فتنہ پرور افراد نے جب بھی جماعت کے خلاف آواز اٹھائی اور الزامات لگائے، مولانا کو برداشت نہ ہوا کہ آخر جماعت ان کی بھی محنتوں اور کاوشوں کا صلہ اور ثمرہ تھی، مولانا نے اس کا مقابلہ کیا اور جوابات دئے، اور آخر تک جماعت تبلیغ کو اصلاح وتبلیغ کی تمام معاصر کوششوں میں سب سے زیادہ کامیاب اور نتیجہ خیز کوشش سمجھتے اور ظاہر

کرتے رہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ تبلیغی کام بڑے زور وشور سے جاری رہا، مولانا کے حادثۂ ارتحال سے چند ماہ قبل جون ۱۹۹۹ء میں ندوۃ العلماء میں سابقہ متعدد تبلیغی اجتماعات کی طرح ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا، جس میں مولانا نے اپنی سخت علالت وضعف کے باوجود بصیرت افروز پرزور خطاب فرمایا اور جماعت تبلیغ کے اسٹیج سے آخری بار یہ انقلابی پیغام دیا:

''ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ کی زندگیوں میں خود انقلاب آئے، اور وہ انقلاب لازمی اور انفرادی نہ ہو؛ بلکہ متعدی اور اجتماعی بھی ہو، عقائد کے اعتبار سے بھی، اخلاق کے اعتبار سے بھی، معاملات کے اعتبار سے بھی، آپ کی زندگی دوسروں کے لئے مشعل راہ بنے اور دعوت اسلام کا کام دے، اور آپ میں ایک مقناطیسی طاقت پیدا ہو، جو افراد کو بھی کھینچے، معاشرہ کو بھی، ملک کو بھی، اور زمانہ کو بھی۔ **وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز**''۔ (کاروانِ زندگی ۲۶۳/۷-۲۶۴ مختصراً)

اسلامی اور اصلاحی انقلاب کی یہی جہد مسلسل تڑپ اور لگن مولانا کی پوری زندگی کا ایک تابناک پہلو ہے، جس میں کہیں بھی توقف وتردد نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی غفلت وکسل مندی آڑے آئی۔ گویا:

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

حضرت مولانا علی میاںؒ

اور برِصغیر کے مشائخ واکابر، اہلِ کمال علماء ومعاصرین

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کو فیاضِ ازل نے جن خوبیوں اور خصوصیات سے نوازا تھا، ان میں ایک بہت اہم خصوصیت یہ تھی کہ اپنے عصر کے تقریباً تمام مشاہیر، علماء، اکابر اہل اللہ، اہل فضل وکمال اور داعیان اور معاصر علماء سے مولانا کا اور ان کا مولانا سے بڑا گہرا ربط وتعلق تھا، اپنے وقت کے تمام اکابر سے مولانا نے کسبِ فیض کیا تھا اور منظور نظر رہ چکے تھے، یہ مولانا کی لاثانی خصوصیت ہے، اس کا کچھ اندازہ اگلی سطروں سے ہوسکتا ہے۔

اکابر ومشائخ اور بلند پایہ علماء

❐ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ:

حضرت رائے پوریؒ سے مولانا کا تعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے توسط سے شروع ہوا، ۱۹۳۹ء میں حضرت مولانا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی فنائیت وبے نفسی، ذہنی وسعت وحقیقت پسندی اور بے پایاں شفقت سے متأثر وعقیدت مند ہوکر حلقہ بگوشی کا فیصلہ کرلیا، حضرت رائے پوریؒ نے بھی بہت محبت وشفقت کا معاملہ فرمایا۔ مولانا منظور نعمانی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''اگرچہ یہ ناچیز ہی مولانا کے رائے پور جانے اور حضرت سے تعلق قائم ہونے کا اول ذریعہ بنا اور حضرت سے بیعت کا شرف بھی پہلے ناچیز ہی کو حاصل ہوا؛ لیکن موصوف کی

ان خداداد صفات اور خصوصیات کی وجہ سے جن کی اللہ کے ہاں اور اس کے مقبول بندوں کے ہاں بھی زیادہ قدر و قیمت ہے، حضرتؒ کے ہاں محبوبیت کا جو مقام ان کو حاصل ہوا وہ اس ناچیز کے لئے موجب مسرت ہونے کے باوجود ہمیشہ رشک وغبطہ کا باعث بھی بنا رہا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

(سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۲ طبع سوم)

مولانا سے حضرت رائے پوریؒ کی محبت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ایک مکتوب میں مولانا کو ''سیدی ومولائی'' کے بلند الفاظ سے مخاطب کیا ہے، مولانا حضرت رائے پوریؒ کے مجاز وخلیفہ بھی ہیں، اس کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''حضرت (رائے پوریؒ) نے اپنے سفر لکھنؤ کے موقع پر جو اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا، ۲۶/اپریل ۱۹۴۸ء کو ہمارے وطن دائرۂ شاہ علم اللہ رائے بریلی کو دوبارہ شرف بخشا، وہیں ایک روز بے سان گمان حضرت شاہ علم اللہؒ اور سید صاحبؒ کی مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مجھ سے فرمایا، میں آپ کو چاروں سلسلوں بالخصوص حضرت سید صاحب کے سلسلہ میں اجازت دیتا ہوں''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۳۵۳)

اس کے بعد مولانا نے بار بار رائے پور کا سفر کیا اور یہ تعلق مستحکم ہوتا چلا گیا، ۱۹۵۰ء میں حضرت رائے پوری کی ہم رکابی میں مولانا سفر حج پر تشریف لے گئے، اس سفر میں حضرت کی شفقت کے بڑے واقعات پیش آئے، حضرت نے مولانا سے فرمایا کہ یہ سفر میں نے تمہارے لئے کیا ہے، مولانا کی تصانیف خصوصاً سیر وسوانح کی کتابوں سے حضرت رائے پوریؒ کو بڑی دلچسپی تھی، طباعت سے قبل ہی مسودہ منگوا کر پوا سن لیا کرتے تھے، تاریخ دعوت وعزیمت کے بارے میں اپنے ایک مکتوب میں مولانا کو لکھتے ہیں کہ آپ کی کتاب سے سیری نہیں ہوتی، تاریخ دعوت وعزیمت کی تیسری جلد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے متعلق ہے، یہ مکمل نہ ہوسکی تھی، اور حضرت رائے پوریؒ ہر ملاقات میں مولانا سے اس کی تکمیل کا تقاضا کرتے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں اسے مکمل کرکے مولانا نے پیش کیا، تو حضرت نے پوری کتاب

مستقل بلاتوقف پڑھوا کر سنی، ۱۹۵۸ء کے اوائل میں حضرت رائے پوریؒ نے مولانا کو قادیانیت کے سلسلہ میں عربی میں کتاب مرتب کرنے کا حکم دیا، یہ کتاب مولانا نے بڑی محنت سے لکھی جو ''القادیانی والقادیانیۃ'' کے نام سے طبع ہوئی، اور جو اپنے اسلوب کی ممتاز مثبت خصوصیات کی وجہ سے اس موضوع کی کتابوں میں سب سے بلند مقام کی حامل ہے، ۱۹۵۹ء میں اسی کتاب کے اردو ترجمہ کا تقاضا بھی حضرت کی طرف سے ہوا، جسے مولانا نے اضافہ کے ساتھ مکمل کیا، اپنے مرشد کی سوانح بھی مولانا نے ''سوانح حضرت رائے پوریؒ'' ساڑھے تین سو صفحات میں مرتب فرمائی اور اگست ۱۹۶۲ء میں حضرت رائے پوری کے انتقال تک یہ تعلق قائم رہا۔

❑ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ:

حضرت شیخ سے مولانا کا ربط وتعلق ۱۹۴۰ء سے شروع ہوا، اور آخر تک باقی رہا، مراسلت کا سلسلہ بھی شروع سے رہا اور حضرت شیخ کے سیکڑوں خطوط مولانا کے پاس آئے، حضرت شیخ کی جامعیت، بے انتہا محبت اور علمی ذوق وشغف مولانا کو قریب کرتے گئے، حضرت شیخ کو بھی مولانا پر اس درجہ اعتماد وتعلق تھا کہ اپنی تمام عربی تصنیفات پر مولانا سے مقدمہ لکھوایا اور ایک مکتوب میں اپنا تعلق یوں ظاہر کیا کہ:

> ''دعاؤں میں نہ مکہ میں دریغ ہوا نہ مدینہ پاک میں، اور یہ بھی یاد نہیں کہ کسی دن آپ کے لئے صلاۃ وسلام میں تخلف ہوا ہو، اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ دل بستگی جتنی آپ سے ہے اتنی کسی سے بھی نہیں رہی''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۴۴۲)

شیخ کی شفقت کے متعدد واقعات مولانا نے اپنی کتاب ''شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب'' میں نقل کئے ہیں، حضرت مولانا کے بارے میں شیخ کے یہ الفاظ کتنے گہرے اعتماد وتعلق کا ثبوت دیتے ہیں کہ:

''بلاتصنع اور بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کے تعلق کو اپنے لئے وسیلہ نجات سمجھتا ہوں، اپنے لئے میں آپ سے دعاؤں کا سخت محتاج اور متمنی ہوں اور آپ کے لئے دعا کرنا اپنا فریضہ اور آپ کا اہم حق سمجھتا ہوں''۔

(حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اکابر و مشاہیر امت کی نظر میں، از: ممشاد علی قاسمی ۱۳۵)

مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران حضرت شیخ کا مشفقانہ رویہ بڑھتا گیا، ۱۹۸۰ء میں جب شاہ فیصل ایوارڈ کا اعلان مولانا کے لئے ہوا تو حضرت شیخ نے مدینہ سے مبارک باد بھیجی، جس کا مقصد مولانا کو یہ ایوارڈ قبول کرنے پر آمادہ کرنا تھا۔

حضرت مولانا کی کتاب ''نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں'' (سفر امریکہ کی تقریروں کا مجموعہ) طبع ہوکر آئی تو حضرت شیخ نے اسے پڑھوا کر سنا اور فوراً مولانا سے اپنے مکتوب میں اس کے عربی اور انگریزی ترجمہ کا تقاضا کیا، اور خود اس کتاب کے دو ہزار نسخے خرید کر تقسیم کرائے، اس کے علاوہ مولانا کی متعدد تصنیفات حضرت شیخ نے سنیں اور پڑھیں اور مولانا کو مبارک باد دی، ان میں ''تکملہ نزہۃ الخواطر، ارکانِ اربعہ، تاریخ دعوت وعزیمت'' وغیرہ سرفہرست ہیں، مئی ۱۹۸۲ء میں شیخ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا۔

❐ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی صاحبؒ:

حضرت شیخ الحدیث کے بعد مولانا کو مشائخ عصر میں سب سے زیادہ ذہنی مناسبت بھوپال کے حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی سے تھی، جو ۱۹۳۶ء سے چلی آرہی تھی، بھوپال کے تبلیغی اجتماعات میں ہر سال حاضری کے موقع پر حضرت مولانا شاہ صاحب کی خدمت میں جایا کرتے تھے، شاہ صاحب کے دل میں مولانا کے لئے بڑا احترام اور محبت تھی، تعلق اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ شاہ صاحب مولانا کو لینے کے لئے اسٹیشن تشریف لے جاتے تھے، ایک بار ٹرین لیٹ ہونے کی وجہ سے شاہ صاحب آدھی سے زیادہ رات اسٹیشن ہی پر گذارنی پڑی، مولانا نے واپسی کے بعد ایک معذرت نامہ تحریر فرمایا، جس کے جواب میں شاہ صاحب نے لکھا:

''اس عاجز کو جو روحی آرام اس شب میں حاصل ہوا تھا، جس رات کو حضرت کے استقبال میں آرام کیا تھا اسٹیشن پر، ایسی خوشی اور فرحت کی کوئی رات مجھ کو اپنی زندگی میں یاد نہیں ہے، جسمی کوفت بہت قلیل اور روحی فرحت بہت کثیر، فرحت روحی نے جسمی تکلیف کو رفع کر دیا''۔ (کاروانِ ادب ۱۷۷، اپریل ۱۹۹۷ء)

حضرت شاہ مجددی صاحبؒ کی مجلس کی قیمتی باتیں سن کر مولانا کے دل میں ان ملفوظات کو جمع کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، مولانا نے یہ کام مکمل کیا اور مجموعہ ''صحبتے با اہل دل'' کے نام سے طبع ہوا، مولانا نے اس میں صاحب ملفوظات کا تفصیلی تعارف بھی کرا دیا ہے۔

❐ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ:

حضرت شاہ مجددی صاحبؒ کے بعد مولانا کو سب سے گہرا ربط اور عقیدت حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ سے رہی، جو حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے اجل خلفاء میں تھے، فروری ۱۹۵۴ء میں مولانا کا حضرت سے باضابطہ تعلق شروع ہوا، مولانا ایک سفر میں فتح پور تشریف لے گئے، حضرت فتح پوریؒ نے خصوصی شفقت فرمائی، پھر جب حضرت کا قیام گورکھپور میں ہوا تو مولانا حاضر خدمت ہوئے، وہاں بھی شفقت ومحبت کا عجیب عالم تھا، مولانا بے حد متأثر ہوئے اور واپس آ کر ایک مکتوب میں حضرت کی شفقت اور ذرہ نوازی کا ذکر کرتے ہوئے یہ مصرعہ بھی لکھ دیا کہ:

ع: کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

حضرت فتح پوریؒ نے اس کا جو جواب دیا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ تحریر فرمایا:

''اس کا صحیح مصداق تو یہ تھا کہ میں پڑھتا؛ کیوں کہ ایک بادشاہ نے کسی دہقان کے یہاں نزول فرمایا تھا، اس پر اس نے یہ کہا تھا، تو آپ کی مثال شاہوں کی سی ہے کہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نزول فرماتے رہتے ہیں، چناں چہ ایک دہقان کے یہاں بھی نزول فرما کر اس کو شرف بخشا، اسی لئے اگر میں کہوں تو حق بجانب ہوں''

ع: کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

(پرانے چراغ ۱/۱۶۸)

کچھ عرصہ بعد حضرت فتح پوری الٰہ آباد منتقل ہوئے تو اس وقت بھی مولانا حاضر ہوئے، واپس آ کر ایک مکتوب لکھا، جس میں حضرت کی شفقت پر گہرا تأثر ظاہر کیا، حضرت نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد و رفت فرماتے ہیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے''۔ (پرانے چراغ ۱/۱۷۱)

جو ۱۹۶۴ء میں مولانا الٰہ آباد میں دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں تشریف لے گئے، الٰہ آباد اسٹیشن پر پہنچے، تو حضرت فتح پوریؒ کو استقبال کے لئے موجود پایا، یہ غایت محبت تھی، حضرت کی قلبی شفقت و تعلق کا مکمل ظہور اس وقت ہوا جب مولانا ۱۹۶۷ء میں سیتاپور میں آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں مقیم تھے، اس وقت حضرت بار بار خطوط و پیغامات کے ذریعہ حاصل معلوم کراتے اور فکر مندی کا اظہار کرتے، پھر جب فائدہ نہ ہوا تو حضرت ہی کے اشارے پر مولانا نے لکھنؤ واپس آ کر ہومیو پیتھک علاج شروع کیا، جس سے کافی افاقہ ہوا، اس کے بعد بار ہا ملاقاتیں ہوئیں اور ہر بار حضرت کی شفقت و محبت کا ظہور ہوتا رہا۔

❐ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ:

مولانا گیلانی سے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا تعلق اصلاص ۱۹۴۱ء سے شروع ہوا، جب حضرت مولانا کو اپنی کسی علمی ضرورت سے مولانا گیلانی کے ایک مقالہ سے (جو جمع و ترتیب قرآن پر تحریر تھا) استفادہ کی ضرورت پیش آئی، مولانا گیلانی کی تصنیف ''النبی الخاتم'' مولانا علی میاںؒ نے بہت متأثر ہو کر پڑھی اور بار بار یہ فرمایا کہ: ''میں نے اپنی ساری عمر میں سیرتِ نبوی میں ''رحمۃ للعالمین'' (مصنفہ: قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ) اور ''النبی الخاتم''

سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی‘‘۔ (پرانے چراغ ۱/۶۷)

مولانا گیلانی سے مل کر حضرت مولانا کو ہمیشہ عزیزانہ قرابت اور ذوقی وعلمی مناسبت کا احساس ہوا، خود مولانا کی تصنیفات مولانا گیلانی نے بڑے ذوق وشوق سے پڑھیں، خصوصاً ’’مذکرات سائح فی الشرق العربی‘‘ (شرق اوسط کی ڈائری) سے بہت متأثر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے انتقال کے بعد ندوۃ العلماء میں سید صاحب سے متعلق ایک سنجیدہ اور علمی اجتماع کا انعقاد طے پایا، جس میں مولانا علی میاںؒ نے مولانا گیلانی کے نام ایک مکتوب میں تشریف آوری کی درخواست کی، اور یہ بھی لکھا کہ خواہ مجھے خود حاضر ہونے پڑے؛ لیکن یہ زحمت آپ کو نیازمندوں کی خاطر برداشت کرنی پڑے گی۔ مولانا گیلانیؒ نے ایک مفصل مکتوب اس کے جواب میں لکھا جس کا ایک اقتباس یہ ہے:

> ’’آپ نے اپنے اس نوازش نامہ میں اس فقیر کے متعلق جن غیر استحقاقی الفاظ کا استعمال فرمایا ہے، ان کو پڑھ کر بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، بہر حال آپ جیسے سعید قلوب کے حسن ظن کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتا ہوں‘‘۔ (پرانے چراغ ۱/۷۹-۸۰ مختصراً)

اس کے بعد مولانا گیلانی کا تعلق خاطر مولانا سے بڑھتا گیا، مولانا نے تحریر فرمایا کہ:

> ’’واقعہ یہ ہے کہ مجھے بھی اُن سے جو فکری مناسبت اور قلبی تعلق محسوس ہوتا تھا، وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے اپنے ایک شفیق استاذ اور عزیز بزرگ سے ہوتا ہے‘‘۔ (پرانے چراغ ۱/۸۲)

ایک مکتوب میں مولانا گیلانیؒ نے حضرت مولانا علی میاں کو ان ہستیوں میں بھی شامل فرمایا ہے جن کی محبت واخلاص کو وہ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اس سے اس تعلق کی گہرائی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا گیلانی نے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں یہ نظریہ قائم کرلیا تھا کہ صرف ظاہری شکل وصورت پر کسی شخص کے قحِ باطن یا اس کے بے دین ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے، نیز یہ کہ اس کے قلب واندرون کی اسلامیت کی قدر کرتے ہوئے اس کے ظاہر کی

اصلاح کی کوشش کی جائے، حضرت مولانا علی میاںؒ نے اپنے دمشق کے سفر ۱۹۵۹ء میں یہی دو متضاد پہلو وہاں کے مسلم نوجوانوں اور اخوانی کارکنوں میں محسوس کئے، اس موقع پر مولانا کو مولانا گیلانیؒ کا یہ نظریہ معتدل معلوم ہوا اور اپنے ایک خط میں یہ تأثر مولانا گیلانی کو تحریر بھی کر دیا، اس کے جواب میں مولانا گیلانیؒ نے تحریر فرمایا کہ:

''بڑی مسرت اس بات سے بھی ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی پود کے متعلق آپ پہلے آدمی ہیں، جن کے قلم سے میری آنکھوں نے وہی لکھا ہوا پایا جس کا برسوں سے انتظار کرتا رہا، ممکن ہے یہی نقطۂ نظر دوسرے اربابِ فکر و بصیرت کا بھی ہو؛ لیکن جن جچے تلے الفاظ میں اپنے احساسات کا اس سلسلہ میں آپ نے اظہار فرمایا ہے، خاکسار تو نکتہ چینوں سے اتنی جرأت بھی نہیں کر سکتا''۔ (پرانے چراغ ۱/۸۸-۸۹)

مولانا گیلانی کو تاریخ اسلامی مراکز اور تاریخ اسلام سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، بلادِ عربیہ کی سیاحت کا بڑا ارمان تھا، حضرت مولانا علی میاںؒ کو دمشق یونیورسٹی مآں ۱۹۵۶ء میں استاذ زائر (Visiting Professor) کی حیثیت سے مدعو کیا گیا، تو مولانا گیلانی نے ایک مکتوب مولانا کو لکھا، جس میں مولانا گیلانی کی محبت و بے نفسی اور خلوص اور اخلاقی بلندی کا عکس نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا گیلانی نے لکھا کہ:

''اخبار ''الجمعیۃ'' اسی کے بعد ''مدینہ'' میں بھی اس تاریخی امتیاز کی خبر پڑھی، جو صدیوں کے بعد ہندوستان کو حاصل ہوا، علامہ صفی الدین بدایونی کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں، جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہنچانے کا موقع ملا؛ بلکہ صفی ہندی تو خود گئے تھے اور آپ کو تو وہاں کی حکومت اور جامعہ نے طلب کیا ہے۔ وشتان بینھما ، یہ امتیاز آپ کی شخصیت تک ہی محدود نہیں ہے؛ بلکہ سارے ہندی علماء کے لئے سرمایۂ افتخار ہے: **یا لیت کثر اللّٰہ امثالکم فینا**''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۴۲۱-۴۲۲ مختصراً)

اسی سفر میں مولانا نے دمشق سے ایک مکتوب مولانا گیلانی کو لکھا، تو اس کے جواب میں مولانا گیلانی نے بڑا وجد انگیز مکتوب لکھا اور یہ بھی تحریر کیا کہ:

''واقعی آپ کا وجود مسعود اس وقت کم از کم میرے لئے سراسر رشک وغبطہ بنا ہوا ہے''۔ (پرانے چراغ ۱/۹۲)

تاریخ دعوت وعزیمت کی پہلی جلد کے مطالعہ کے بعد بھی مولانا گیلانی نے اپنے قلبی تأثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''دعوت وعزیمت کی تاریخ ملی ہے، اپنی گم گشتہ چیز ہاتھ آئی ہے، خدا ہی جانتا ہے کتنی دفعہ اس کے مطالعہ سے استفادہ کرتا رہوں گا، پڑھ رہا ہوں اور جی سیر نہیں ہوتا، خدا ہی جانتا ہے کہ میرے کتنے خوابوں کی تعبیر آپ کے ذریعہ پوری ہوگی''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۴۱۵)

مولانا گیلانی سے حضرت مولانا علی میاںؒ کا تعلق صرف ذہنی وعلمی ہی نہیں تھا؛ بلکہ شخصی اور قلبی بھی تھا، اس لئے مولانا گیلانی کے سانحۂ ارتحال پر مولانا نے تحریر فرمایا:

''بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے، وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے، والغیب عند اللہ تصنیف وتالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کردیا ہے، وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے، اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور تنظیمیں کرتی ہیں، ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو''۔ (پرانے چراغ ۱/۹۴)

❑ امام اہل سنت مولانا مولانا عبدالشکور فاروقیؒ:

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کا مولانا علی میاںؒ کے خاندان سے بڑا قدیم اور گہرا ربط تھا، مولانا نے ان کی زیارت پہلی بار ۱۹۲۷ء میں اپنے استاذ خواجہ عبدالحئ فاروقی کے ساتھ کی اور بہت متأثر ہوئے، امام اہل سنت کے مواعظ نے لکھنؤ اور اطراف میں اصلاح وانقلاب کا بے مثال کام کیا، مولانا ان کے مواعظ کی تاثیر، دل پذیری، سادہ گفتگو، اندرونی جذب اور دلی تڑپ سے بے حد متأثر ہوئے، مولانا کے بقول کم سے کم شہر لکھنؤ میں

حضرت سید احمد شہید کے درۂ ۱۲۳۴ھ کے بعد ایسی اصلاحی اور انقلابی لہر نہیں آئی، مدحِ صحابہ کی تحریک جب امام اہل سنت نے شروع کی، تب بھی مولانا نے ان کا سوزِ دروں، جذبِ کامل اور استغراق دیکھا اور گہرا اثر لیا، مولانا کو امام اہل سنت کی ہمراہی میں دوبار سفر کا شرف حاصل ہوا۔ دہلی کے ایک سفر میں امام اہل سنت کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا اور حضرت مولانا ورفقاء کا تھرڈ کلاس میں تھا، امام اہل سنت مولانا کے ساتھ تھرڈ کلاس میں بیٹھے اور اصرار کے باوجود فرسٹ کلاس میں جانے پر راضی نہ ہوئے اور ہر بار فرمایا: ''جہاں تم ہو وہاں میں ہوں'' پوری شب بے آرامی میں گذری، لیٹنے کا موقع بمشکل ملا؛ لیکن پھر بھی وہ خوش رہے اور کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے، اس کے بعد مولانا کی ان سے بارہا ملاقاتیں ہوئیں اور ہر موقع پر ان کی شفقتیں محسوس ہوئیں۔ (پرانے چراغ حصہ دوم)

❑ حضرت مولانا شاہ حلیم عطا سلونیؒ:

شاہ حلیم عطا صاحب کو قریب سے دیکھنے کا اصل موقع مولانا کو ۱۹۳۱ء میں اس وقت ملا جب مولانا اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ حسنیؒ کے ہمراہ پہلی بار ''سلون'' تشریف لے گئے، اس کے بعد شاہ صاحب کی خصوصی توجہ مولانا پر شروع ہوئی، لکھنؤ اُن کی کئی بار آمد ہوئی اور ہر مرتبہ مولانا ان کے وسعت مطالعہ، ذوقِ لطیف اور پاکیزگی سے متأثر ہوئے، شاہ صاحب ہی کے مشورہ پر مولانا نے امام ابن جوزی، ابن رجب، ابن عبدالہادی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ وابن قیم کی بعض اہم کتابوں سے استفادہ کیا، شاہ صاحب کو ندوۃ العلماء میں لانے میں مثالی کردار مولانا ہی کا ہے، اپنے برادر بزرگ ناظم ندوۃ العلماء ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے مشورہ سے مولانا نے شاہ صاحب سے ندوۃ العلماء میں تدریسی ذمہ داریاں قبول کرنے کی اصرار کے ساتھ گذارش کی، چناں چہ شاہ صاحب ۱۹۳۹ء میں تشریف لائے اور حدیث کے اسباق پڑھانے شروع کئے، شاہ صاحب سے ندوۃ العلماء کے اساتذہ نے بھی

کافی استفادہ کیا، خود مولانا نے بہت سے موقعوں پر شاہ صاحب سے علمی فائدہ اٹھایا، اپنی کتابوں کی ترتیب کے دوران بھی ہدایتیں اور مشورے لئے، شاہ صاحب تاریخ وادب کا بھی صحیح مذاق رکھتے تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

''مختارات کی تالیف کے زمانہ میں مجھے ان کی لطافت ذوق اور حسن انتخاب کا تجربہ ہوا، مثال کے طور پر مجھے مقاماتِ بدیع الزماں میں سے ایک مقالہ کا انتخاب کرنا تھا، جو بدیع الزماں کی بہترین خصوصیات کی نمائندگی کرتا ہو اور طلبہ کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید، شاہ صاحب نے برجستہ کہا کہ ''المقامۃ المضیریۃ'' انتخاب کیجئے، بعد میں دیکھا تو اس سے زیادہ جاندار، لطیف وبلیغ نثر کا نمونہ نہ صرف مقاماتِ بدیع ہی میں نہیں ملتا؛ بلکہ اس عہد کی تحریروں میں بھی اس کا خاص امتیاز ہے''۔ (پرانے چراغ ۱/۲۶۷)

شاہ صاحب تا زندگی مولانا کے ساتھ شفقت وتعلق خاطر کا معاملہ کرتے رہے۔

❑ مولانا حکیم سید مثنیٰ حسن امروہوی ندویؒ:

حکیم صاحب سے مولانا کا گہرا تعلق اس وقت شروع ہوا، جب ۱۹۳۹ء میں ''سیرتِ سید احمد شہید'' پڑھ کر حکیم صاحب نے ایک بہت ہی محبت آمیز خط لکھا، اور مصنف کو مبارک باد بھی دی، کچھ خامیوں پر گرفت بھی کی، جس کا اعتراف دوسرے ایڈیشن کے مقدمہ میں ہے، اس کے بعد مولانا نے امروہہ جا کر حکیم صاحب سے ملاقات کی، حکیم صاحب نے مولانا کی آمد پر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔

حکیم صاحب اردو وعربی دونوں کے بلند؛ لیکن گم نام ادباء میں تھے، اسی لئے مولانا اپنی ساری تصنیفات ورسائل حکیم صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے اور ان کے تبصروں سے بہت فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ حکیم صاحب ''**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**'' کے بہت مداح تھے، خصوصاً اس کے مضمون ''**محمد رسول اللّٰہ روح العالم العربی**'' کو کتاب کا سب سے زیادہ جاندار حصہ مانتے تھے، جو ان کی ژرف نگاہی

اور نکتہ شناسی کی دلیل ہے، ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ مولانا حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ کی سوانح پر کام کریں، اکثر فرماتے تھے کہ تمہارے ذمہ یہ قرض ہے، اس کو ادا کرنا ہے، اسی کے پیش نظر مولانا نے بہت بعد میں حکیم صاحب کی وفات کے بعد ''المرتضیٰ'' مرتب فرمائی جو اپنے موضوع پر بے انتہاء جامع تصنیف ہے۔ (پرانے چراغ حصہ اول)

❑ مولانا عبدالباری ندویؒ:

مولانا عبدالباری ندویؒ حضرت مولانا علی میاںؒ کے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے خاص دوستوں میں تھے، لکھنؤ میں جب مولانا مدنیؒ کی مستقل آمد ورفت شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب کے مکان پر قیام ہونے لگا، تو ان سے ملاقات کے لئے مولانا عبدالباری صاحب کی آمد ورفت بڑھی اور یہیں سے مولانا علی میاںؒ کا تعلق ان سے شروع ہوا مولانا نے ان کی کتاب ''مذہب وعقلیات'' سے بڑا فائدہ اٹھایا اور اسے اپنی محسن کتابوں میں شمار کیا ہے، اور مولانا ہی کے اشارہ پر اس کا عربی ترجمہ ''الدین والعقل'' مولانا سید واضح رشید ندوی نے کیا ہے، اس وقت مولانا عبدالباری صاحب کا قیام جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں بطور استاذ تھا، گرمیوں میں لکھنؤ آتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا علی میاںؒ ان کے درسِ قرآن میں کچھ دنوں شریک ہوئے اور ان کے حکیمانہ اشاروں سے مستفید بھی ہوئے، پھر مولانا علی میاںؒ نے اپنی تدریس کے زمانہ میں بھی ندوۃ العلماء کے اونچے درجات کے طلبہ کو اُن کے درسِ قرآن سے استفادہ کی ترغیب دی اور خود بارہا ساتھ گئے اور فائدہ اٹھایا، ۱۹۳۹ء میں سیرتِ سید احمد شہید کے مطالعہ کے بعد مولانا عبدالباری صاحب مرحوم نے ایک مکتوب میں مولانا کو لکھا کہ:

> ''سید صاحب رحمہ اللہ کے حالات میں آپ کی کتاب سفر میں ختم کی؛ بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ سفر کاملین ایمان کی مجلس وصحبت میں تھا، ایمان واسلام ان ہی بزرگوں کا تھا، بابِ

چہارم پڑھ کر تو یہ سنگ دل بھی اپنی آنکھوں کو خشک نہ رکھ سکا، جو ہمیشہ تری کو ترسا کرتی ہیں''۔ (پرانے چراغ ۲/۱۲۴)

اس کے بعد ۱۹۶۸ء میں دوسری کتاب ''صحبتے با اہل دل'' پڑھ کر بھی بہت متأثر ہوئے، مولانا کے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ انہیں عالم عربی کو اصلاً اپنی دعوت کا موضوع اور اپنی صلاحیتوں کی جولان گاہ بنالینی چاہئے، وہ مولانا کو ہندوستان میں (Misfit) کہا کرتے تھے، ندوۃ العلماء کے معاملات میں ان کا نقطۂ نظر مولانا سے بار بار مختلف رہا؛ لیکن آخری ایام میں شفقت ومحبت کا بے حد غلبہ رہا، جنوری ۱۹۷۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

بلند پایہ مشاہیر اور اہل کمال

❑ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ:

حضرت مولانا نے نواب صاحب کو پہلی بار ۱۹۲۵ء میں دس سال کی عمر میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں دیکھا، اس کے بعد کئی بار زیارت وملاقات ہوئی، مولانا ان کے حسن وجمال، رکھ رکھاؤ، وقار ووجاہت اور جوش خطابت وتاریخ نگاری سے بے حد متأثر ہوئے، پھر ان کی کتاب ''علماء سلف'' سے بہت استفادہ کیا اور اسے اپنی محسن کتابوں میں شمار کیا، اس کتاب نے مولانا کے اندر علم کا شوق اور طلب پیدا کی، مولانا نے نواب صاحب کو ہندوستان کے آخری فارسی داں ادیبوں میں شمار کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''میں نے ان جیسا متضاد صفات کا جامع اور متنوع شخصیت کا حامل نہیں دیکھا''۔

(پرانے چراغ ۲/۲۷ مختصراً)

شروع ہی سے نواب صاحب کی شفقتیں مولانا پر رہیں، ۱۹۲۶ء میں علی گڈھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جبلی کے موقع پر مولانا علی گڈھ تشریف لے گئے، تو نواب صاحب کے یہاں قیام نہیں کیا، نواب صاحب کو علم ہوا تو غصہ کا اظہار کیا اور فوراً اپنے گھر پر بلالیا، یہ ان

کے غایت تعلق کی بات تھی، پٹنہ میں ایک کانفرنس کے موقع پر ''خدابخش لائبریری'' کی زیارت مولانا نے نواب صاحب کے ساتھ کی، اسی دوران عصر کا وقت آیا تو نواب صاحب نے مختلف اہل فضل وکمال کی موجودگی میں مولانا ہی کو امامت کے لئے فرمایا، اُن کا تعلق اس ناطے سے بھی مولانا سے گہرا تھا کہ وہ مولانا کے والد ماجد مولانا سید عبدالحیٔ رحمہ اللہ کے رفیق اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاسیس میں شریک تھے، جب بھی مولانا کو دیکھتے تو سینہ سے لگا لیتے، اور اولاد جیسا سلوک کرتے، مجلّہ ''الندوہ'' کی ادارت کے زمانہ میں مولانا نے ہندوستان کے اہل علم وقلم حضرات سے ان کی محسن کتابوں کے بارے میں مضامین کا مطالبہ شروع کیا تھا، اس موقع پر مولانا نے سب سے پہلے نواب صاحب سے اس سلسلہ کے افتتاح کی فرمائش کی، جو نواب صاحب نے بخوشی قبول کی اور ایک وقیع مقالہ تحریر فرمایا جو طبع ہوا۔

❑ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ:

مولانا آزاد کی ذکاوت وذہانت، غیر معمولی قوتِ اخذ، جوشِ خطابت وکتابت، حافظہ وخود اعتمادی اور خود داری کا شہرہ حضرت مولانا علی میاںؒ نے اپنے بڑوں خصوصاً علامہ سید سلیمان ندویؒ سے بارہا سنا تھا، پہلی بار انہیں لکھنؤ کے کسی سیاسی جلسہ میں دیکھا اور ان کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ ۱۹۳۴ء میں مولانا نے ندوۃ العلماء میں تدریس کے دوران مولانا آزاد کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' بڑے ذوق سے پڑھی اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا، اس کے کچھ عرصہ بعد مولانا آزاد لکھنؤ آئے اور وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر مقیم ہوئے، مولانا ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، اپنا تعارف کرایا، تو انہوں نے پہچان لیا، ''سیرتِ سید احمد شہید'' اس وقت زیر ترتیب تھی، مولانا نے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی جو مولانا آزاد نے منظور کی اور وعدہ کرلیا۔ (مقدمہ تو مولانا آزاد مصروفیت کی وجہ سے نہ لکھ سکے اور کتاب علامہ سید سلیمان ندویؒ کے وقیع مقدمہ کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں طبع ہوکر آئی) اسی دوران مولانا نے ان

کی تفسیر پر اپنے تأثرات اور اس کے بعض مضامین کو عربی میں منتقل کرنے کی اجازت چاہی، جو انہوں نے بخوشی دے دی، اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں اور مولانا آزاد دیر تک شفقت سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ ایک مجلس میں مولانا آزاد نے یہ پوچھا کہ آپ کون سے مضامین پڑھتے ہیں، مولانا نے جواب دیا، پھر کئی سال کے بعد ملاقات میں اُن مضامین کا تذکرہ مولانا آزاد نے کیا، حضرت مولانا کو مولانا آزادؒ کی ایسی چھوٹی جزئیات یاد رکھنے پر حیرت ہوئی، ۱۹۵۱ء میں مولانا کے قیام مصر کے دوران مولانا آزادؒ اپنے یورپ کے ایک سفر میں قاہرہ سے گذرے تو ایئرپورٹ پر اُن کے استقبال میں ہندوستانی سفارت خانہ کی طرف سے ایک تقریب رکھی گئی، اس میں مولانا علی میاںؒ کو بھی مدعو کیا گیا، موالانا آزاد تشریف لائے اور آخر تک روئے سخن مولانا ہی کی طرف رہا، گفتگو تمام تر علمی تھی، اس دوران سفارت خانہ کے ذمہ داران بار بار مولانا کو متوجہ کرتے رہے کہ سب سے باتیں کی جائیں، وقت کی کمی کی طرف بھی توجہ دلاتے رہے؛ لیکن مولانا آزادؒ بدستور مولانا اور ان کے احباب ہی کی طرف متوجہ رہے، یہ غایت تعلق کی دلیل ہے۔

زمانۂ وزارت میں مولانا آزاد سے مولانا کی کئی بار ملاقات ہوئی، ایک بار شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی دعوت پر مولانا دہلی گئے؛ تاکہ وہ مولانا آزاد کو اُن کی موجودگی میں ''نزہۃ الخواطر'' کی بقیہ جلدوں کی طباعت کی طرف توجہ دلائیں۔ جمعیۃ علماء کے اجلاس میں یہ موقع آیا، حضرت مدنیؒ نے ''نزہۃ الخواطر'' کا تذکرہ مولانا آزاد سے کیا، مولانا آزاد نے اپنی دلچسپی اور واقفیت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اسے ضرور چھپنا چاہئے، پھر مولانا آزاد ہی کی یاددہانی اور فرمانے پر دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے بقیہ جلدیں بھی طبع کیں۔

ایک بار مولانا علی میاںؒ ندوۃ العلماء کے کسی کام سے مولانا آزاد سے ملے، انہوں نے بڑی دلچسپی لی، کام کی تکمیل کردی اور مفید مشورے دئے۔ (پرانے چراغ حصہ دوم)

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم:

ڈاکٹر ذاکر حسین کو مولانا نے پہلی بار نومبر ۱۹۲۶ء میں ندوہ کے سالانہ اجلاس میں کانپور میں دیکھا، قریب سے دیکھنے کا موقع ۱۹۳۹ء میں اس وقت آیا جب مولانا نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ کرنال و پانی پت کے سفر سے واپسی پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مہمان خانہ میں قیام کیا، اس موقع پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ضیافت، شیریں گفتاری، ظرافت و شرافت اور اعلیٰ اخلاق کا نقش مولانا کے دل و دماغ پر مرتسم ہوگیا۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا نے اپنے استاذ خواجہ عبدالحئ فاروقی ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر جامعہ کے اساتذہ، طلبہ اور شہر کے اہل ذوق کے ایک منتخب مجمع میں ''مذہب وتمدن'' کے عنوان سے ایک وقیع مقالہ پیش کیا، ڈاکٹر صاحب اس جلسے میں اول سے آخر تک شریک رہے، طویل مقالہ سنا اور پھر مولانا کی بڑی عزت افزائی کی، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے مولانا کا ربط وضبط بڑھتا گیا۔ ۱۹۴۱ء ہی میں مولانا کا رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کے پاس آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، ۱۹۴۴ء کے اوائل سے ڈاکٹر صاحب نے بھی مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دینی شروع کی، اور ہر جمعہ کو فجر کی نماز میں مرکز حاضری اور معمولات میں شرکت کا التزام کرنے لگے۔ میوات کے اہم جلسوں میں بھی جانا شروع کیا، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جانے کے لئے حضرت مولانا ہی -اگر موجود ہوتے- رفاقت کے لئے منتخب کئے جاتے، ڈاکٹر صاحب کے دل میں اسی زمانے میں ایک نمونہ کی اسلامی بستی اور مرکز کے قیام کی دھن سوار تھی، اس مقصد کی تکمیل کے لئے ان کی نظر انتخاب میوات کے قصبہ نوح ضلع گوڑگاواں پر پڑی، جہاں وہ بارہا تبلیغی جدوجہد کی خاطر خواہ اثرات بچشم خود جاکر دیکھ چکے تھے، اس عظیم کام کی نگرانی کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جماعت تبلیغ کے ذمہ داران شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس صاحبؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ اور مولانا

احتشام الحسن کاندھلویؒ وغیرہ کے مشورہ سے مولانا کا انتخاب کیا، اور ایک مکتوب لکھا کہ:

''اولین فرصت میں اس باب میں کچھ کام کر ڈالئے، اس نیک کام کو انجام دینے کی سعادت آپ ہی سے مخصوص معلوم ہوتی ہے''۔ (پرانے چراغ ۲/۶۹)

لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر یہ تجویز ملتوی ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے مولانا کو اس کے التواء کی اطلاع دی۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے جامعہ ملیہ کا جشن سیمیں (سلور جبلی) منانے کا انتظام کیا، یہ بہت کامیاب جشن تھا، بڑی قدآور شخصیات اس میں شریک تھیں، ڈاکٹر صاحب نے جو خطبہ استقبالیہ پڑھا وہ اردو ادب وانشاء کا بہت اچھا نمونہ اور اُن کے سوزِ دروں اور دل کی تڑپ کا ثبوت ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس جشن میں مولانا کو بھی شریک ہونے اور مقالہ پڑھنے کی دعوت دی، مولانا نے اپنا مقالہ ''عہدِ نبوی کا نظام تعلیم'' کے عنوان سے پیش کیا، پھر بعد میں اس مقالہ پر ڈاکٹر صاحب سے پیش لفظ لکھنے کی درخواست کی، ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں لکھا:

''آپ کا مقالہ بہت ہی اچھا تھا، اس پر کسی پیش لفظ کی ضرورت سچ پوچھئے تو ہے ہی نہیں، آپ میری عزت افزائی چاہتے ہیں تو میں ضرور پیش لفظ لکھ دوں گا، اس لئے نہیں کہ اس سے لوگ مقالہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوں گے؛ بلکہ اس لئے کہ مجھے آپ کے ساتھ شریک ہونے کا شرف حاصل ہوجائے گا''۔ (پرانے چراغ ۲/۷۵-۷۶ مختصراً)

لیکن پھر چند وجوہ سے یہ پیش لفظ نہیں لکھا جاسکا، ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر منتخب ہوئے، اس زمانہ میں جب بھی مولانا علی گڈھ تشریف لے گئے، ڈاکٹر صاحب نے بڑی محبت کا معاملہ کیا اور ناشتہ پر مدعو کیا، پھر ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر صاحب صوبہ بہار کے گورنر منتخب ہوئے، اس دور میں بھی مولانا نے اپنے سفر پٹنہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا وقت لیا، وقت مقررہ سے کافی دیر سے پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کو منتظر پایا، ڈاکٹر صاحب بڑے پرتپاک انداز میں ملے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

''ان کے پاس بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ایک شہباز کو قفس زریں میں محبوس کر دیا گیا ہے''۔ (پرانے چراغ ۸۰/۲)

اسی زمانہ میں مولانا اپنی تازہ تصنیف ''تذکرۂ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی'' ڈاکٹر صاحب کو بھیجی، تو انہوں نے اس کے مطالعہ پر اپنے گہرے تأثر کا اظہار اس طرح کیا کہ:

''تذکرہ جس وقت ملا اسی وقت پڑھنا شروع کر دیا اور جب تک ختم نہ کر دیا، ہاتھ سے الگ نہ کیا، عشق و مستی اور اتباعِ سنت کا ایسا مجموعہ کہاں دیکھنے کو ملتا ہے، خدا کرے آپ اچھی طرح ہوں، اور آپ کے قلم کے فیضان اور آپ کی زندگی کے نمونہ سے ایک پراگندہ حال امت کو ذہنی و روحانی جمعیت خاطر نصیب ہو، میں اندھا ہوں، ان چیزوں کو کیا دیکھ سکتا ہوں، مگر اٹکل سے ایسا لگتا ہے کہ مشیت کو آپ سے یہ کام لینا منظور ہے''۔

(پرانے چراغ ۸۰/۲-۸۱ مختصراً)

اس کے بعد سے مولانا نے اپنی ہر اہم طبع شدہ چیز ڈاکٹر صاحب کو بھیجنی شروع کی، تاریخ دعوت وعزیمت کے تیسرے حصہ کو (جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ بہاری سے متعلق ہے) پڑھ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے مکتوب میں مولانا کو بہت سراہا۔ ''سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ'' پڑھ کر انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

''سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کا جو نسخہ آپ نے از راہِ ذرہ نوازی بھیجا تھا وہ ابھی کل پڑھ کر ختم کیا، حضرت رائے پوری کا ذکر اور آپ کے قلم سے، اس کتاب کا مطالعہ ایک گراں قدر تعلیمی اور تربیتی تجربہ ہے، جس سے ایمان تازہ ہوتا ہے اور صالح زندگی کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے، آپ کے قلم سے اس زمانہ میں جو تحریریں نکلی ہیں ان سب کا یہی حال ہے''۔ (پرانے چراغ ۸۲/۲-۸۳)

۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحب دارالمصنفین کے جشن طلائی (گولڈن جبلی) میں شریک ہوئے، اس وقت وہ نائب صدر جمہوریہ ہند تھے، انہیں کا انتخاب جشن کی صدارت کے لئے

ہوا، اس موقع پر مولانا سے ان کی کئی ملاقاتیں اور مجلسیں رہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر صاحب صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے، اس زمانہ میں مولانا کی ان سے ملاقات نہیں ہوئی؛ البتہ مولانا نے اس دور کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ:

''اس میں شبہ نہیں کہ اس منصب کے لئے کوئی آدمی ڈاکٹر صاحب سے زیادہ سچا نہیں، ان کی خوش قسمتی نہ ہو؛ لیکن ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ایک ایسا سجنے والا صدر جمہوریہ ملا جو علمی، دماغی، بیانی اور جسمانی ہر لحاظ سے اس کے لئے نہ صرف موزوں؛ بلکہ اس کا وقار بڑھانے والا تھا''۔ (پرانے چراغ ۸۵/۲)

۳؍مئی ۱۹۶۹ء کو ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

❐ علامہ عبدالعزیز میمنؒ:

حضرت مولانا علی میاںؒ کا تعلق ۱۹۲۶ء سے ہی علامہ عبدالعزیز میمن سے ہوگیا تھا، اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ حسنیؒ کے واسطہ سے یہ تعلق شروع ہوا، مولانا علامہ کے علم وفضل کے بے حد معتقد رہے، براہِ راست علمی تعارف ان کی کتاب ''ابو العلاء وما الیہ'' کے ذریعہ ہوا، مولانا نے یہ کتاب پڑھی اور علامہ کی تحقیق وکمال کے قائل ہوگئے۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں اپنے سفر علی گڈھ میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تازہ تالیف ''مختارات'' پیش کی، مولانا نے اسی وقت کتاب کا مقدمہ دیکھا اور فرمایا: ''مولوی صاحب آپ عربی بہت خوب صورت لکھتے ہیں''۔ یہ ایک بلند پایہ اور مسلم الثبوت ادیب کا اعتراف تھا، اسی موقع پر مولانا نے ان سے محسن کتابوں پر مضمون لکھنے کی درخواست کی جو انہوں نے قبول کی اور ایک وقیع، پرمغز اور معلومات افزا مضمون لکھوایا جو طبع ہوا۔

تقسیم ہند کے بعد علامہ پاکستان منتقل ہوگئے، آخری عمر میں انہوں نے مولانا کو یہ پیغام بھجوایا جس میں یہ ذکر تھا کہ وہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کے لئے ایک خطیر رقم دینا چاہتے ہیں، اور ان کی خواہش یہ ہے کہ کوئی ایسا نظم ہوجائے جس سے وہ رقم محفوظ ہوجائے

اوراس سے مستقل فائدہ اٹھایا جاتا رہے، مولانا نے اس کے جواب میں لکھا کہ اس کی سب سے زیادہ موزوں شکل یہ ہے کہ اس سے وہ اہم اور جدید کتابیں خریدی جائیں جو کتب خانہ میں نہیں ہیں، اور علامہ کے نام کا ایک گوشہ قائم کر دیا جائے جس میں یہ کتابیں رہیں، اس تجویز کو علامہ نے پسند کیا، رقم پیش کی اور اسی پر عمل بھی ہوا۔ جولائی ۱۹۷۸ء میں کراچی مآں مولانا کی علامہ سے آخری ملاقات ہوئی، پھر نومبر ۱۹۷۸ء میں علامہ اس درفانی سے دارِ بقا کو رحلت کر گئے۔ (پرانے چراغ دوم)

نامور ادباء وشعراء

❐ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ:

مولانا دریا آبادی سے مولانا کی پہلی باضابطہ ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہوئی، تعارف ہوا تو مولانا دریا آبادی نے بڑی شفقت فرمائی، یہ تعلق حکیم عبدالقوی دریا آبادی (جو مولانا دریا آبادی کے برادرزادے اور مولانا علی میاںؒ کے رفیق تھے) کے ذریعہ سے مضبوط تر ہوتا گیا، سب سے پہلے جو تحریر مولانا دریا آبادی کی مولانا نے پڑھی وہ ایک خطبۂ استقبالیہ تھا جو ''خلافت کانفرنس'' لکھنؤ کے لئے لکھا گیا تھا، اس خطبہ پر ادبی رنگ غالب تھا، مولانا نے یہ خطبہ بڑے لطف وذوق سے پڑھا اور مولانا دریا آبادی کے قلم اور زورِ بیاں سے بے حد متأثر ہوئے۔

اسی زمانہ میں مولانا کے برادر بزرگ جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اور مولانا دریا آبادی کا حضرت مدنیؒ سے بیعت واسترشاد کا تعلق قائم ہوا اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے گھر پر حضرت مدنیؒ کا ہر سفر میں قیام ہونے لگا، چناں چہ مولانا دریا آبادی کی اب بار بار زیارت ہونے لگی۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا دریا آبادی نے سفر حج کیا اور پھر اپنا منفرد اور اچھوتا سفر نامہ تحریر کیا، مولانا علی میاںؒ نے اسے بڑے شغف وانہماک سے پڑھا اور بڑا گہرا اثر لیا، مولانا

دریا آبادی کے ''سچ'' کا بھی مولانا پابندی سے مطالعہ کرتے رہے اور فائدہ اٹھاتے رہے۔

ندوۃ العلماء میں تفسیر قرآن کی تدریس کے دوران مولانا کو جو اشکالات یا حل طلب مسائل پیش آئے، ان کے حل کے لئے وہ بارہا مولانا دریا آبادی کی خدمت میں گئے، مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا اور ہر موقع پر مولانا دریا آبادی کی صلاحیت اور محبت، انضباطِ کار وتنظیم اوقات اور حمیت اسلامی سے بے حد متأثر ہوئے۔ ''ماذا خسر العالم'' کی ترتیب کے دوران انگریزی مصادر ومراجع کی مشکل عبارتوں کے فہم میں بھی مولانا نے اُن سے مدد لی، مولانا دریا آبادی کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ جب بھی انہیں مولانا کے کام کی کوئی چیز ملتی، اسے مولانا کے پاس ضرور بھجواتے، مولانا کے نام اُن کے مراسلات کی تعداد ۵۳/ ہے، اور ان مراسلات میں معلومات کا ایک خزانہ ہے۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی اسلامک کلوکیم منعقد ہوا، جس میں مولانا علی میاںؒ نہ جاسکے، مولانا دریا آبادی شریک ہوئے، اس موقع پر لاہور سے انہوں نے ایک خط مولانا کو لکھا:

> ''کیا کہوں کہ آپ کے نہ آنے کا یہاں پہنچ کر اور یہاں کا رنگ دیکھ کر کس درجہ افسوس مجھے ہورہا ہے، بہترین زمین یہاں آپ کے لئے تیار تھی، وہاں کا کام دوسرے حضرات کرسکتے تھے، مگر یہاں کے لئے بجز آپ کے اور کوئی ہندوستانی میری نظر میں نہیں''۔
>
> (پرانے چراغ ۲/۱۵۹-۱۶۰ مختصراً)

مولانا دریا آبادی دوبار رائے بریلی میں مولانا کے دولت کدہ پر ان کا کتب خانہ دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے، دارالمصنفین کے جلسوں میں شرکت کے لئے اعظم گڈھ کے اسفار میں اکثر مولانا کی رفاقت رہتی تھی، مولانا دریا آبادی نے اپنی کتاب ''معاصرین'' میں مولانا کا جس انداز میں تعارف کرایا ہے، وہ اپنی انفرادیت، برجستگی، جامعیت اور ادبیت کے لحاظ سے شاہکار ہے، جس میں مولانا دریا آبادی نے مولانا کے لئے اپنی نماز

جنازہ پڑھانے کی بھی وصیت کی، اور اسی کے مطابق عمل بھی ہوا۔

مولانا علی میاںؒ سے ان کے غایت تعلق کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ مولانا نے ان کے بعض ایسے معاملوں میں دخل دیا جس میں انہیں اپنے عزیزوں اور خوردوں سے شکوہ تھا اور مقاطعہ کی نوبت آ گئی تھی، مولانا دریا آبادی نے ایثار سے کام لیتے ہوئے مولانا علی میاںؒ کی بات مان لی اور نزاع ختم ہوگیا، قادیانیت کے مسئلہ میں بھی مولانا دریا آبادی کے موقف پر نظر ثانی کرنے کا مولانا علی میاںؒ نے مشورہ دیا، جس سے انہوں نے اتفاق تو نہیں کیا؛ لیکن ان کا تعلق وفات ۱۹۷۷ء تک باقی رہا اور شفقت فرماتے رہے۔

❐ پروفیسر رشید احمد صدیقیؒ:

رشید صاحب کو پہلی بار مولانا نے ۱۹۳۶ء میں اپنے سفر علی گڈھ کے موقع پر دیکھا، اصل تعلق تو اس وقت شروع ہوا جب مولانا نے ۱۹۵۵ء میں کسی ذریعہ سے شہرۂ آفاق کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' رشید صاحب کے پاس بھیجی، رشید صاحب نے اس کے جواب میں ایک مکتوب تحریر فرمایا کہ:

> ''سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم کی تصانیف کے بعد آپ کی اس کتاب پر پہلی مرتبہ نظر پڑی جو میری نظر میں اردو کی مذہبی اور علمی تصانیف میں اعلیٰ پایہ رکھتی ہے''۔
>
> (پرانے چراغ ۲/۲۷۲ مختصراً)

پھر مولانا نے اپنی کتاب ''تذکرۂ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی'' بھیجی، اس کے مطالعہ سے رشید صاحب بے حد متأثر ہوئے۔ ''کاروانِ مدینہ'' کے مطالعہ کے بعد انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا:

> ''کاروانِ مدینہ کا ایک نسخہ ۳-۴ دن ہوئے موصول ہوا تھا، خوش اور شکر گذار ہوا، پڑھتا گیا اور رائے قائم کرتا گیا کہ یہ تقریر سب سے اچھی ہوگی، دوسری کا مطالعہ کیا تو معلوم

ہوا کہ یہ پچھلی سے اونچی ہے، تیسری پڑھی تو محسوس ہوا کہ یہ دونوں سے بہتر ہے، اس طرح خوب سے خوب تر تک سفر کرتا چلا گیا، آپ کے لئے ذہن میں تحسین کا جو دفتر کھلا وہ فی الحال قابو میں نہیں آتا کہ لکھ کر آپ تک پہنچاؤں، کتنے محدود صفحات میں آپ نے بصائر و معارف کا کیسا گراں بہا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، پھر آپ کا جامع فکر انگیز اور دل نشین لب ولہجہ و پیرایۂ بیان، اس مختصر مطالعہ سے کتنی اور کیسی اچھی اور فکر انگیز باتیں ذہن میں پیدا ہوتی ہیں، ارو زندگی و ذمہ داری کے کیسے کیسے نئے افق سامنے آتے ہیں''۔ (پرانے چراغ ۲/۱۷۴-۱۷۵ مختصراً)

اس کے بعد علی گڈھ کے سفر میں ہر بار مولانا کی ایک طویل مجلس رشید صاحب کے ساتھ ہوا کرتی تھی، جس میں مولانا رشید صاحب کے دردمند دل اور حساس و بیدار ضمیر سے بے حد متأثر ہوتے۔

مسلم مجلس مشاورت کے ایک مؤقر وفد کے ساتھ مولانا نے ۱۹۶۶ء میں ریاست میسور کا ایک کامیاب دورہ کیا تھا، اس کی روداد ''بارہ دن ریاست میسور میں'' کے عنوان سے ''ندائے ملت'' میں طبع ہوئی، رشید صاحب نے اسے پڑھا اور بہت پسند کیا، اس موقع پر اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''کچھ دن ہوئے ''ندائے ملت'' میں آپ کے دورۂ دکن کی روداد نظر سے گذری تھی، جو آپ اور آپ کے رفقاء نے مجلس مشاورت کو متعارف کرانے کے لئے کیا تھا، وفد کا خیر مقدم جس خلوص اور گرم جوشی سے کیا گیا وہ غیر متوقع نہ تھا؛ لیکن مجھے تو مصحفی کا وہ شعر یاد آرہا ہے:

ع: کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

جو آپ نے اس سلسلہ میں لکھا تھا، جس مہم اور مقصد کے پیش نظر یہ شعر آپ کے ذہن میں آیا اس سے معلوم نہیں کتنا اضافہ اس لطف وعقیدت میں ہوا جو آپ کی طرف سے میرے دل میں ہے۔ دین، مذہب، سیاست اور معلوم نہیں کتنے اور مسائل مہمہ سے دوچار رہ کر زادِ سفر کی ایسی شگوفہ زائی کتنی دل آویز معلوم ہوئی، شعر وادب کی اس شگفتگی کو تو میں آدمی کی شرافت، شجاعت اور شائستگی پر محمول کرتا ہوں، اچھا اور بڑا آدمی بجائے خود اچھا شعر ہوتا

ہے''۔ (پرانے چراغ ۲/۱۷۹-۱۸۰ مختصراً)

اسی موقع پر مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار پر ہوئے حملوں کے احتجاج میں لکھنؤ سے سب سے پہلی آواز اٹھی، جس میں مولانا اور ان کے احباب کا اہم رول تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رشید صاحب نے اپنے اسی مکتوب کے آخر میں تحریر فرمایا:

''مسلم یونیورسٹی جن منازل سے گذرتی ہوئی جہاں پہنچی ہے، اس سے کتنے نئے اور پرانے غم تازہ ہوگئے، ایسا معلوم ہونے لگا ہے جیسے مسلمانوں کے لئے تمام دنیا میں کہیں امان ہے نہ انصاف، اللہ تعالیٰ ان غریب اور غیور مسلمانوں کو اس آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے، جن کے بارے میں بشارت دی گئی ہے کہ اسلام کو انہیں سے سہارا تسکین اور طاقت ملے گی، خدا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو یہ افتخار بخشے، آپ صاحبان کے بارے میں میرا یہی خیال ہے''۔ (پرانے چراغ ۲/۱۸۰)

رشید صاحب کو مولانا کی تمام تصانیف میں مولانا کا سفر نامہ ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' سب سے زیادہ پسند آیا، انہوں نے اس کے مطالعہ کا اوروں کو بھی مشورہ دیا اور اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ:

''دعا ہے کہ آپ اس پایہ کی تصنیف سے ہمارے ولولوں کو آنے والے اچھے دنوں کی بشارت سے تازہ کار رکھیں گے اور تقویت پہنچاتے رہیں گے، آپ کی تصانیف میں انشاء پردازی کا جو حسن، جامعیت اور موافق احوال ہونے کی صفت پائی جاتی ہے اس کا اعتراف مجھ سے بہتر لوگ کر چکے ہیں''۔ (پرانے چراغ ۲/۱۸۲ مختصراً)

یہ کتاب انہیں اتنی پسند آئی کہ چند ہی دنوں بعد دوسرے مکتوب میں لکھا:

''آپ کی یہ تصنیف اس طرح کی تصانیف سے جو دوسروں نے اب تک پیش کی ہیں، نمایاں طور پر ممتاز ہے، اسلوب اور اظہار مطالب کے اعتبار سے جتنی سنجیدہ اور مؤثر ہے، اتنا ہی دلکش بھی ہے، جن موضوع و مسائل پر آپ نے بحث کی ہے اس کی سطح اور انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے قدیم کو جدید میں جس خوبصورتی سے ڈھالا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے، کتاب کے تعارف میں جو باتیں ٹائٹل پیج پر درج ہیں، ان سے کچھ زیادہ ہی

صفات سے یہ کتاب متصف ہے، ایسا امتیاز کم تصانیف میں ملے گا، یہ خیال دل میں آنے لگتا ہے کہ اگر آپ برابر ایسے سفر پر رہیں تو مسلمانوں اور ملت پر بڑا احسان ہوگا''۔

(پرانے چراغ ۲/۱۸۳-۱۸۴ مختصراً)

۱۹۷۵ء میں پرانے چراغ کا پہلا حصہ پڑھ کر رشید صاحب نے اسے مولانا کی اول درجہ کی تصنیف قرار دیا، ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی منعقدہ ۱۹۷۵ء میں رشید صاحب شریک نہ ہو سکے، مولانا کا خطبۂ استقبالیہ انہوں نے بعد میں پڑھا تو اس کے بارے میں تحریر فرمایا:

''آپ کا خطبۂ استقبالیہ اس تقریب کا سب سے قیمتی اور دل کش تحفہ ہے، ''برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنی را'' اس کی خوبیاں خلاف توقع نہیں؛ بلکہ پورے طور پر متوقع تھیں؛ اس لئے کہ خطبہ آپ سے منسوب تھا''۔ (پرانے چراغ ۲/۱۸۷)

مولانا کی کتاب ''روائع اقبال'' کا ترجمہ ''نقوشِ اقبال'' کے نام سے منظر عام پر آیا تو رشید صاحب نے اس پر ایک بڑا ہی وقیع مقدمہ لکھا، اس کے آخر میں پورے کلامِ اقبال کے عربی ترجمہ کا مطالبہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی تحریر فرمایا:

''سید صاحب کو دین سے جو شغف ہے، عربی زبان وادب کے جیسے مزاج داں ہیں ممالک عربیہ اسلامیہ میں ان کا جیسا اعتبار ہے، اقبال سے جیسی عقیدت اور ان کے کلام میں جو درک وبصیرت ہے، ان کا تقاضا ہے کہ موصوف اس منصب کی ذمہ داری قبول فرمائیں، یہ ایسا کام ہے جو ہر روز ہر شخص کے سپرد نہیں کیا جا سکتا''۔ (نقوشِ اقبال ۲۶ طبع ششم)

ان تفصیلات سے رشید صاحب کے مولانا سے غایتِ تعلق وتأثر کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

❐ ماہر القادری صاحب:

ماہر صاحب سے مولانا کا تعارف ان کے ماہنامہ ''فاران'' کے ذریعہ ہوا، ۱۹۵۶ء میں انہوں نے فاران کا ''سیرت نمبر'' نکالنے کا فیصلہ کیا، تو مولانا سے مضمون کی فرمائش کی، مولانا نے ایک مضمون ''سیرتِ محمدی دعاؤں کے آئینہ میں'' کے عنوان سے سفر کی حالت میں قلم برداشتہ لکھوا دیا، یہ مضمون فاران میں شائع ہوا، اس کے بعد کئی بار مستقل کتابچہ کی شکل

میں شائع ہوا، اور اتنا مقبول ہوا کہ اس کا عربی ترجمہ بھی قاہرہ سے طبع ہوا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

میرا خیال ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چھپے گا اور اس سے کسی بندۂ خدا کو فائدہ پہنچے گا اور اس کو دعا کی توفیق ہوگی اس میں ماہر صاحب کا ضرور حصہ ہوگا''۔ (پرانے چراغ ۲/۲۰۴ مختصراً)

۱۹۵۶ء میں مولانا دمشق کے ایک سفر سے واپسی میں کراچی میں ٹھہرے، تو ماہر صاحب سے پہلی بار ملاقات ہوئی، دیر تک نشست رہی، اس کے بعد بمبئی میں ایک جلسہ میں ماہر صاحب سے اچانک ملاقات ہوگئی، انہوں نے اپنا کلام سنایا ان کی مشہور نعت جس کا یہ شعر بہت مؤثر ہے:

اے نام محمد! صل علیٰ ماہر کے لئے تو سب کچھ ہے
ہونٹوں میں تبسم در آیا آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے

مولانا کو بہت پسند تھی۔

ماہر صاحب فاران مولانا کے پاس مستقل بھیجا کرتے تھے، مولانا کو ان کے تبصروں اور تنقیدوں سے بڑی دلچسپی تھی، خود مولانا کی بعض عربی کتابوں کے اردو ترجموں پر انہوں نے ناقدانہ تبصرے کئے، جن سے مولانا نے فائدہ اٹھایا، نقوشِ اقبال کو ماہر صاحب نے بے حد پسند کیا اور بہت مؤثر اور اچھا تبصرہ کیا۔ ۱۹۶۹ء میں لندن میں مولانا کی ملاقات ماہر صاحب سے ہوگئی، دیر تک علمی وادبی مجلس رہی، دورانِ مجلس ماہر صاحب نے بعض اردو محاورات کے بارے میں مولانا کی رائے معلوم کی جو اس بات کی دلیل تھی کہ وہ مولانا کے ادبی پایہ بلند کے معترف ہیں، مولانا اپنی تمام تصنیفات انہیں ضرور بھیجتے تھے، مولانا کے بقول ماہر صاحب ان گنے چنے ادباء میں سے تھے جو پوری کتاب پڑھ کر ناقدانہ ومبصرانہ تبصرہ کرتے ہیں اور حق ادا کرتے ہیں، پرانے چراغ کے پہلے حصہ کو پڑھ کر ماہر صاحب نے مولانا کو لکھا کہ:

''پرانے چراغ نے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشا، خاصا حصہ پڑھ ڈالا، آپ کی

تحریروں میں اخلاص اور ادبیت کی کوئی حد و نہایت نہیں''۔ (پرانے چراغ ۲/۲۰۹)

ان کے بعض نظریات اور بعض تنقیدی آراء سے اختلاف کے باوجود مولانا ان کے خلوص، ادبیت اور حمیت وحمایت حق کے جذبہ سے بے حد متأثر رہے۔ خود ماہر صاحب تا زندگی مولانا کی خدمات کے معترف، قائل اور مدح سرا رہے۔

❐ جگر مرادآبادی مرحوم:

جگر صاحب کے کلام سے مولانا بہت پہلے سے واقف ومتأثر تھے، ملاقات تقسیم ہند کے بعد ہوئی، پہلی ملاقات میں جگر صاحب مولانا سے بے حد احترام وتواضع سے ملے، اور اپنا کچھ کلام بھی سنایا، اس کے بعد ملاقاتیں اور مجلسیں بڑھتی گئیں۔ ۲۶/اگست ۱۹۴۸ء کو مولانا نے ندوۃ العلماء کی ایک کانفرنس میں اپنا ایک مؤثر مقالہ پڑھ کر سنایا، جس میں حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور خطرات کی نشان دہی تھی (یہ مقالہ نشانِ راہ کے عنوان سے طبع ہو چکا تھا) اس کانفرنس میں جگر صاحب بھی شریک تھے، انہیں یہ مقالہ اتنا پسند آیا کہ دوسری نشست میں اسے دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی۔

اس کے بعد جگر صاحب سے مولانا کے تعلقات مستحکم ہوتے گئے، وہ جب لکھنؤ آتے ضرور ملاقات کرتے، مولانا ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتے اور وہ بڑی خوش دلی سے سنایا کرتے۔ مولانا نے لکھا ہے:

> ''مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ جگر صاحب کچھ سنانے کی فرمائش سے آشفتہ مزاج ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے سرکاری افسروں اور مقتدر لوگوں کو یہ تلخ تجربہ ہو چکا ہے، میں سادگی سے ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا اور وہ پیشانی پر ایک شکن لائے بغیر بڑی خوش دلی کے ساتھ اپنی کوئی غزل سناتے، میرا شوق ہل من مزید کہتا اور وہ لبیک کہتے''۔
>
> (پرانے چراغ ۱/۳۶۷)

مولانا جگر صاحب کے خیالات کی جدت، فکر کی بلندی اور طبیعت کی خودداری، عزت

نفس، رسم وآئین، کہن سے انحراف، بے لوثی و بے غرضی اور شرافت سے بے حد متأثر تھے، یوں تو ان کا پورا کلام مولانا کو پسند تھا؛ لیکن ان کی چار غزلیں مولانا کو بے حد پسند تھیں، اور وہ انہیں بار بار سنتے تھے۔ ایک تو وہ غزل جس میں جگر صاحب نے کہا ہے:

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں
کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے

دوسری وہ غزل جس کا ایک شعر یہ ہے:

جب تک کہ غم انسان سے جگر انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دنیا لیکن جنت سے جہنم دور نہیں

تیسری غزل اس طرح شروع ہوتی ہے:

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں ایک نشیمن

چوتھی غزل کے دو شعر بھی دیکھئے:

وہ سبزہ ننگ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے
وہ گل ہے زخم بہاراں جو مسکرا نہ سکے

گھٹے تو بس اِک مشت خاک ہے ورنہ
بڑھے تو وسعت کونین میں سما نہ سکے

مولانا کے ادبی اور شعری پاکیزہ ولطیف مذاق کا اندازہ ان شعروں کے انتخاب سے ہوسکتا ہے۔ جگر صاحب مولانا سے بڑے احترام کا معاملہ کرتے تھے، بارہا ندوہ کے لئے رقم پیش کی، ایک دو بار بڑے اصرار سے مولانا کو بھی ہدیہ پیش کیا، انداز یہ ہوتا تھا کہ اگر ذرا بھی پس وپیش کی تو دل شکنی کا خطرہ ہوتا اور قبول کر لی تو گیا بہت بڑا احسان کر دیا، یہ ان کے دل کے ایمان اور اہل ایمان سے ان کے بے پایاں تعلق کی دلیل تھی۔

محترم علماء، معاصرین اور احباب

❐ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ:

۱۹۴۱ء کے بعد اپنے کسی تبلیغی سفر کے موقع پر حضرت مولانا علی میاںؒ کا پرتاب گڈھ جانا ہوا، اس سفر میں پہلی بار حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے ملاقات ہوئی، ان کا وعظ بھی سنا اور جذبۂ اصلاح واخلاص سے بے حد متأثر ہوئے، اس کے بعد کوئی بار ملاقاتیں ہوئیں، پھر جب حضرت الٰہ آباد منتقل ہو گئے تو مولانا نے وہاں کا سفر شروع کیا، مولانا کے بقول ان کا الٰہ آباد کا سفر صرف حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے اور استفادہ کی غرض سے ہوتا تھا، حضرت اس دوران خود کئی بار لکھنؤ اور رائے بریلی تشریف لائے اور ندوۃ العلماء میں کئی روز قیام فرمایا۔

حضرت کے انتقال سے کچھ ہی دنوں قبل مولانا اپنے رفقاء کے ساتھ الٰہ آباد ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، حضرت اپنی علالت اور سخت کمزوری کی وجہ سے صاحب فراش تھے؛ لیکن مولانا سے ملاقات کے لئے چارپائی سے بصد اصرار اٹھے اور فرش پر کافی دیر تک بیٹھے رہے اور بے انتہاء شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا، مولانا حضرت کی بے انتہا سادگی، تواضع، شفقت بزرگانہ اور بلند پایہ عارفانہ کلام کے دل سے قائل تھے، حضرت کے مجموعۂ اشعار ''عرفانِ محبت'' پر مولانا کا مقدمہ پڑھنے کی چیز ہے، مولانا سے حضرت کے غایت تعلق وشفقت کا اندازہ ان کے اس جملہ سے ہوتا ہے:

> ''اور چوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، اس لئے اللہ نے ان کو علم کے پردے میں چھپا رکھا ہے، اگر وہ اپنے آپ کو ظاہر کردیں تو دوسرے پیروں کو مرید نہ ملیں''۔ (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکابر ومشاہیر امت کی نظر میں ۲۲۶)

❐ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ:

مفتی صاحب سے مولانا کا براہِ راست تعلق ۱۹۴۰ء کے بعد سے شروع ہوا، حضرت

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تبلیغی تحریک سے دہلی کے بہت سے علماء کو روشناس کرانے میں مولانا علی میاںؒ کا بڑا اہم کردار رہا ہے، مفتی صاحب کو بھی مولانا نے مرکز نظام الدین تشریف لانے پر آمادہ کیا، مولانا کا تعلق اس کے بعد مفتی صاحب سے بڑھتا گیا، بارہا ندوۃ المصنفین میں تشریف لے گئے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے انتقال کے بعد ندوۃ العلماء میں سید صاحب کی یاد میں ایک علمی اجتماع ۱۹۵۴ء میں منعقد ہوا، جس میں مفتی صاحب بھی تشریف لائے اور بڑا مؤثر خطاب فرمایا، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے جلسوں میں بھی مفتی صاحب سے بارہا ملاقاتیں اور صحبتیں رہیں، اصل رفاقت اور ہم سفری ۱۹۶۴ء کے بعد ہوئی، راوڑکیلا، جمشید پور، رانچی اور کلکتہ کے فسادات کے بعد جب دردمند مسلمانوں کے دلوں کو ناقابل بیان صدمہ پہنچا، اور اس سلسلہ میں منظّم و متحد جدوجہد کی آواز ڈاکٹر سید محمود مرحوم نے اٹھائی اور علماء کرام (جن میں حضرت مولانا علی میاںؒ اور مفتی صاحبؒ بھی سرفہرست تھے) کے ساتھ مل کر ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت قائم کی، جس کی تفصیلات آگے آئیں گی، پھر اس کے بعد مشاورت کا پہلا کامیاب دورہ بہار واڑیسہ کا ہوا، جس میں مفتی صاحب مولانا کے ہمراہ شریک رہے۔ دسمبر ۱۹۶۴ء میں دوسرا دورہ گجرات کا ہوا، مولانا نے احمد آباد میں خطاب کیا، مولانا کی تقریر پر پنڈت سندرلال نے سخت تنقید اور احتجاج کیا، مفتی صاحب سے ضبط نہ ہوسکا، انہوں نے فرمایا: ''پنڈت جی! مولانا نے آخر کیا بے جا بات کہی، آپ اتنے گرم کیوں ہیں''؟ یہ مفتی صاحب کی دینی حمیت اور اخلاقی جرأت کی دلیل تھی۔

ڈاکٹر سید محمود کے استعفا کے بعد مشاورت کی صدارت کے لئے باتفاق رائے مفتی صاحب ہی کا انتخاب ہوا، اور مفتی صاحب نے اپنی ذہانت اور ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت سے مشاورت میں جان ڈالنے کی کوشش کی، مگر حالات اتنے ابتر ہو چکے تھے کہ اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی مفتی صاحب کو نہ مل سکی۔

مفتی صاحب نے مولانا سے کئی بار یہ مطالبہ کیا کہ اپنی کوئی تصنیف ندوۃ المصنفین کو برائے اشاعت دیں، ۱۹۷۰ء کے آغاز میں مولانا نے اپنی تصنیف ''حیاتِ عبدالحئ'' دی، جو نومبر ۱۹۷۰ء ہی میں طبع ہوئی، ۱۹۷۸ء میں مفتی صاحب مولانا کی دعوت پر رائے بریلی تشریف لائے اور واپسی پر اپنے ایک مکتوب میں بڑی خوشی اور محبت کا اظہار کیا۔ مشاورت کے تمام دوروں میں مولانا ہر موقع پر علمی و دینی وطبعی مناسبت کی وجہ سے مفتی صاحب کے ساتھ ہی قیام چاہتے تھے اور مفتی صاحب کی خوش آوازی کی وجہ سے جہری نمازوں میں خصوصاً انہیں کی اقتداء کی خواہش کرتے تھے، مولانا تازندگی ان کے تعمیری وایجابی نقطۂ نظر، دوراندیشی اور بصیرت کے معترف رہے۔

❐ حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ:

مولانا منت اللہ صاحب سے مولانا کا تعلق کافی قدیم ہے؛ البتہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے جلسوں میں زیادہ ربط بڑھا، اکثر موقعوں پر اتفاقِ رائے بھی مناسبت کی دلیل تھی، مولانا منت اللہ صاحب کا مولانا سے گہرا اور اٹوٹ تعلق اس وقت شروع ہوا جب مولانا منت اللہ صاحب کی توجہ ومحنت سے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ (جس کی تفصیلات آگے آئیں گی) کا قیام ہوا، پھر ۱۹۸۳ء میں انہیں کے اصرار پر مولانا صدر بورڈ منتخب ہوئے، اور مختلف اسفار، جلسوں، تقریروں، وزیراعظم ودیگر وزراء واعیان سے ملاقاتوں میں ان کا ہر دم ساتھ رہا اور ہر موقع پر ان کے ذہنی ومزاجی توازن، اخلاص، احساس ذمہ داری، ملت سے ربط محکم اور غیرت وجرأت کے نمونے سامنے آئے، جن سے مولانا بے حد متأثر ہوئے۔

❐ حضرت مولانا مسعود عالم صاحب ندویؒ:

مولانا مسعود عالم ندوی سے مولانا کا ربط ۱۹۲۹ء میں دورانِ تعلیم شروع ہوا، ان کے

عربی ذوق کا اس وقت ندوۃ العلماء میں شہرہ تھا، عربی رسائل وجرائد کا مطالعہ کرنے کے لئے مولانا کئی بار ان کی قیام گاہ گئے، اس طرح یہ تعلق بڑھتا گیا، پھر ندوۃ العلماء میں تدریس کے زمانہ میں بھی ان دونوں رفقاء کا اجتماع رہا۔ ۱۹۳۲ء میں عربی پرچہ ''الضیاء'' نکلنا شروع ہوا، تو دونوں نے مل کر اس کے معیار کو بلند تر اور مقبول بنانے کی ساتھ ساتھ کوشش کی۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوۃ العلماء سے علیحدہ ہوئے، مگر ربط برابر باقی رہا، اور بہت سی باتوں میں وہ مولانا کے ہم خیال بھی رہے، ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودی لکھنؤ آئے اور مولانا علی میاںؒ کے سامنے ایک عربی رسالہ کی تجویز رکھی اور ادارت کی ذمہ داری قبول کرنے کی دعوت دی، مولانا نے بلاتکلف مولانا مسعود عالم صاحب کا نام لے کر انہیں اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں قرار دیا، چناں چہ خط وکتابت کے ذریعہ سے مولانا انہیں یہ ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کرلیا، پرچہ تو جاری نہ ہوسکا؛ لیکن ۱۹۴۲ء میں مولانا مسعود عالم صاحب جماعت اسلامی کی عربی نشر واشاعت کے شعبہ کے ذمہ دار بن کر جالندھر گئے، اور ''دار العروبة للدعوة الإسلامية'' قیام کیا، جماعت اسلامی کے تئیں وہ شروع سے مخلص تھے اور جماعت کے استحکام وترقی میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔

بعض نظریات میں اختلاف اور فکر ومسلک میں کچھ تفاوت کے باوجود مولانا مسعود عالم صاحب کا تعلق مولانا سے بڑا گہرا رہا اور محبت میں کبھی کمی نہ آئی، جماعت اسلامی کی مجلسوں میں جب بھی ذکر آیا، انہوں نے مولانا سے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ سے محبت وقربت کا ایسی جرأت وصفائی کے ساتھ بلند الفاظ میں اظہار کیا جس سے دوسروں کو حیرت واستعجاب بھی ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں مولانا مسعود عالم صاحب اسیر زنداں ہوئے، چار ماہ کے بعد رہا ہوئے، تو مولانا علی میاںؒ نے مسرت وتہنیت کا ایک خط لکھا، جس کا مولانا مسعود عالم صاحب نے بڑا اچھا جواب دیا، لکھا:

''آپ کے عنایت نامے رہائی کے بعد نظر سے گذرے، محبت واخلاص کے نقوش اور گہرے ہوگئے، اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا کرے، مجھ فقیر کے لئے یہ بس ہے کہ ایک پاکباز نوجوان سید کے دامن الفت سے وابستہ رہے''۔

(پرانے چراغ ۱/۳۵۳-۳۵۴)

مولانا مسعود عالم ندویؒ کا یہ امتیاز تھا کہ وہ لادینی رجحان اور دین وعقیدہ کی گمراہی کو کبھی برداشت نہیں کرسکے، مولانا علی میاںؒ نے مختارات میں مصری ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین (جو اپنی لادینیت کے باوجود اچھے ادباء میں شامل ہیں) کے ایک ادبی انتخاب کو جگہ دی، اس پر مسعود صاحب نے لکھا کہ:

''طٰہٰ حسین کی شمولیت پر بھی مجھے اعتراض ہے، آپ کہیں گے ادب میں دین کیوں؟ سو اول تو طٰہٰ حسین ہر معنی میں بے ادب ہے اور دوسرے اب کچھ تعصب بھی پیدا ہوتا جارہا ہے''۔ (پرانے چراغ ۱/۳۳۵)

مسعود صاحب سے غایت تعلق ہی کی بات تو ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو مولانا کے پاس بھی بہت سے تعزیت نامے آئے۔

❐ مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ:

شاہ معین الدین صاحب مولانا مرحوم سے عمر میں بڑے تھے، مگر جو موانست ومحبت انہیں مولانا سے تھی وہ بہت کم لوگوں سے رہی ہوگی، خود مولانا کو بھی ان سے بڑا انس اور تعلق تھا، شاہ صاحب اردو کے ممتاز ترین ادباء میں تھے، مولانا علی میاںؒ نے دینی تعلیمی کونسل کے ایک جلسہ میں گورکھپور میں خطاب کیا، جس میں خواص کو موضوع بنایا تھا، یہ خطاب جب شاہ صاحب نے پڑھا تو بے حد متأثر ہوئے اور اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا، جس سے ان کے غایت تعلق کا پتہ چلتا ہے:

''مجھے نہ صرف آپ سے ملاقات؛ بلکہ ان لبوں اور ہاتھوں کے استلام کا اشتیاق

ہے جن سے خواص کو خطاب کیا گیا ہے، یہ تقریر تو دیوبند کی تقریر سے بھی بڑھ گئی اور تاریخ میں زندہ رہنے کے قابل ہے، کس خوبصورتی سے کیسے کیسے حقائق ظاہر کئے گئے"۔ (پرانے چراغ ۱/۴۵۱)

❑ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ:

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائیؒ مولانا مرحوم کے رفیق درس تھے، پھر ندوہ کی تدریس اور ترقی، الندوہ کی ادارت وذمہ داری، ادارۂ تعلیمات اسلام کے قیام وانتظام، خدمت قرآن، عربی زبان کی تعلیم واشاعت، مجلّہ تعمیر کی ادارت وترتیب میں یہ دونوں رفقاء ایک دوسرے کے معاون اور شریک رہے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے انتقال کے بعد دارالمصنفین میں قیام، ماہنامہ "معارف" کی ادارت اور رفقاء دارالمصنفین کی رہنمائی وترتیب کے لئے پورے دبستان شبلی اور بزم سلیمانی میں مولانا عبدالسلام قدوائی ہی اہل تھے اور انہیں کا انتخاب ہوا، اس میں مولانا علی میاںؒ کا اصرار شامل رہا، جسے انہوں نے قبول کیا، مولانا ان کی شرافت نفس، انسان دوستی، بے آزاری اور ہمدردی کی انسانی واخلاقی صفات سے غایت درجہ متأثر تھے ان کے ایک احسان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ:

"میں ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا کہ طالب علمی سے فراغت کے بعد ایک زمانہ میں جب تصوف کی بعض کتابوں کے مطالعہ سے مجھ پر زبان وادب کی بے حقیقتی کا غلبہ ہوا، اور طبیعت ادب وانشاء سے اچاٹ؛ بلکہ بیزار ہونے لگی اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی ساری دلچسپیوں اور توجہات کو مقاصد اور دینی علوم کے دائرہ میں محدود کروں گا، اسی زمانہ میں اپنے وطن رائے بریلی جاتے ہوئے لکھنؤ سے بچھراواں تک (جو مولانا عبدالسلام قدوائیؒ کا وطن ہے) میرا ان کے ساتھ ہوگیا، میرے اس رجحان سے وہ واقف تھے، سارے راستے وہ مجھے اس سے باز رکھنے اور دینی مقاصد اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے زبان وادب کی اہمیت کی ضرورت کو میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے رہے، انہوں نے ہوش یار کیا کہ میں خدا کی بخشی ہوئی اس صلاحیت کو ضائع اور اس کی ناقدری نہ کروں جس سے میں دین کی خدمت

میں بڑا کام لے سکتا ہوں، ان کی اس تلقین سے میرے اس خیال میں تزلزل پیدا ہوگیا اور میں اس غلطی سے بچ گیا''۔ (پرانے چراغ ۲/۲۹۵-۲۹۶ مختصراً)

❑ مولانا محمد عمران خاں ندویؒ:

مولانا محمد عمران خاں صاحب سے حضرت مولانا کا اصل ربط وتعلق اس وقت شروع ہوا، جب وہ ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ کے درس حدیث میں شرکت ورفاقت ہوئی، اس تعلیمی زمانہ میں مولانا کو ان کی صلاحیتوں، انتظامی مناسبت اور انضباط اوقات کا علم ہوا، ۱۹۳۴ء میں مولانا عمران خاں صاحب کو ندوۃ العلماء کے دفتری انتظام کا ذمہ دار نامزد کیا گیا، ندوۃ العلماء ان دنوں مالی لحاظ سے بڑا کمزور تھا، اسی کے پیش نظر فراہمیٔ مالیہ کے لئے مئی ۱۹۳۷ء میں مدراس کا ایک سفر حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ کی قیادت میں حضرت مولانا علی میاںؒ، مولانا عبدالسلام قدوائیؒ اور مولانا عمران خاں صاحبؒ کا ہوا، اس سفر کے آغاز میں مولانا عمران خاں صاحب کی تحریک سے یہ وفد بھوپال بھی گیا، اس کے بعد متعدد اسفار میں مولانا علی میاںؒ اور مولانا عمران خاں صاحبؒ کی رفاقت رہی اور سفر میں ہر موقع پر مولانا کو یہ احساس ہوا کہ مولانا عمران خاں صاحب کے ساتھ سفر میں گھر جیسا آرام ملتا ہے۔ ۱۹۳۷ء کے وسط ہی میں مولانا عمران خاں صاحب کے لئے مصر جاکر جامعہ ازہر سے استفادہ کے لئے ایک وظیفہ کی پیش کش ہوئی تھی، حضرت مولانا علی میاںؒ کی رائے یہ تھی کہ وہ اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائیں؛ لیکن مولانا عمران صاحب نے اس سلسلہ میں اپنے والد صاحب کے تردد کا ذکر کیا، چناں چہ مولانا نے بھوپال کا سفر کیا اور ان کے والد محترم کو اس موقع سے استفادہ کی اہمیت سمجھائی، جس سے ان کو شرح صدر ہوا اور مولانا عمران خاں صاحبؒ کو اجازت مل گئی۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں وہ قاہرہ گئے، وہاں سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا، مولانا نے لکھا ہے کہ:

''شاید میرے جوابات میں کچھ طویل وقفہ ہوا تھا، اس پر مولانا نے اپنے شکایتی خط میں عربی کا یہ شعر لکھا جس سے ان کے خصوصی تعلق اور مناسبت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے:

ستقطع فی الدنیا إذا ما قطعتنی

یمینک فانظر أی کف تبدل

ترجمہ: تم نے اگر ہم سے قطع تعلق کرلیا تو گویا اپنے دست راست کو اپنے سے جدا کردیا، اب سوچ لو کہ اس ہاتھ کا نعم البدل کہاں سے لاؤ گے۔

(پرانے چراغ ۲۱۶/۳)

مولانا عمران خاں صاحب واپس لوٹے، ان کے استقبال میں ندوۃ العلماء میں ایک پروگرام ہوا جس میں حضرت مولانا علی میاںؒ نے استقبالیہ خطاب کیا۔ ۱۹۴۰ء میں مولانا عمران صاحب نائب مہتمم پھر ۱۹۴۳ء میں مہتمم بنائے گئے، اور ۱۹۵۸ء تک اس منصب پر باقی رہے، اس کے بعد بھوپال منتقل ہوگئے۔ مولانا کے بقول:

''ان کا دورِ اہتمام دارالعلوم کے نظم وضبط، انضباطِ اوقات، طلبہ پر اثر اور نظم واطاعت اور جس کو ایک مختصر اور اصطلاحی لفظ ڈسپلن (Dispiline) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، نمایاں طور پر ممتاز اور کامیاب عہد تھا''۔ (پرانے چراغ ۲۱۷/۳)

۱۹۴۰ء میں مولانا علی میاںؒ مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دعوت سے بہت متأثر ہوئے، اس معاملہ میں ندوۃ العلماء کے لوگوں میں سب سے زیادہ رفاقت اور مشارکت مولانا عمران خاں صاحب کی رہی، سفر وحضر میں وہ بارہا ساتھ رہے، ۱۹۶۹ء میں ندوۃ العلماء کی اسٹرائک کے موقع پر مولانا علی میاںؒ کو بے حد صدمہ تھا، مولانا عمران صاحب مولانا کو بھوپال لے گئے اور تسلی دے کر بڑا غم ہلکا کیا۔ ۱۹۷۵ء میں ندوہ کے جشن تعلیمی کے انعقاد کے موقع پر اجلاس کے انتظامات کی عملی ذمہ داری حضرت مولانا رحمہ اللہ کی تحریک پر مولانا عمران خاں صاحب ہی کو دی گئی، جسے انہوں نے بڑی کامیابی سے انجام دیا اور جشن کے پہلے

اجلاس میں مولانا کا خطبہ استقبالیہ بھی انہوں نے ہی پڑھا، مولانا عمران صاحب کی حیات میں مولانا علی میاںؒ جب بھی بھوپال تشریف لے گئے، مولانا عمران خاں صاحب ہی کے مدعو اور مہمان رہے، حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب مجددیؒ سے تعلق وتعارف بھی انہیں کے واسطہ سے ہوا، ۱۹۸۵ء میں انہوں نے بھوپال میں علامہ سید سلیمان ندویؒ پر ایک کامیاب سیمینار منعقد کیا تو اس کی صدارت کے لئے مولانا ہی کا انتخاب کیا جو ان کی محبت وتعلق کی دلیل ہے۔

❑ مولانا محمد منظور نعمانیؒ:

مولانا محمد منظور نعمانیؒ کو مولانا نے پہلی بار امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے ادارہ دارالمبلغین میں دیکھا، پھر تعارف اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، اصل اور گہرا تعلق ۱۹۳۹ء میں ہوا جب ''سیرت سید احمد شہید'' پڑھنے کے بعد مولانا نعمانی نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ:

> ''یہاں جو وقت ڈاک کا ہوتا ہے وہی کھانے کا ہوتا ہے، آپ کی کتاب آئی تو میں اس میں اتنا مشغول ہوگیا کہ میرے لئے کھانا کھانا مشکل ہوگیا، میں اس سے بہت متأثر ہوا''۔ (پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ ۱۰ مئی ۱۹۹۷ء ص:۸)

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے ربط اور علیحدگی، پھر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ساتھ تبلیغی سرگرمیاں، مولانا رائے پوریؒ سے استرشاد، مجلس مشاورت کی تشکیل، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے جلسوں اور مختلف دعوتی اسفار میں ان دونوں رفقاء کی بڑی معیت رہی، رابطہ عالم اسلامی کے قیام کے بعد مولانا نعمانی کو بھی حضرت مولانا علی میاںؒ کے اشارہ پر رابطہ کا رکن تاسیسی بنایا گیا، اس کے بعد حجاز کے اسفار میں بھی پوری رفاقت رہی، بہت سے معاملات ومسائل میں ان کی وقیع اور حکمت آمیز آراء اور مشوروں پر مولانا نے عمل کیا اور اس کا فائدہ محسوس ہوا۔

مولانا ان کے رسوخ علم، حمیت دینی، فرق محرفہ ومنحرفہ کی پوری واقفیت اور مقابلہ اور اصابت رائے سے بہت متأثر تھے، ندوہ کے جشن تعلیمی ۱۹۷۵ء میں صدارت کے لئے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کا نام انہوں نے ہی تجویز کیا تھا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ اور مولانا نعمانیؒ کی رفاقت کی داستان بہت طویل ہے، اس پر مستقل کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

یہ چند مشاہیر اہل علم اور معاصر احباب کا ذکر جمیل ہے، معاصرین کی فہرست تو بہت طویل ہے، اس صف میں اور بھی قدآور علماء اور مفکرین ہیں، جن کا ذکر اختصار کے پیش نظر نہیں آسکا ہے، ان میں مولانا محمد اویس ندوی نگرامی، مولانا سید ابوبکر غزنوی، مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا نسیم احمد فریدیؒ، ڈاکٹر سید محمود مرحوم، ڈاکٹر محمد عبدالجلیل فریدیؒ، مولانا محمد سلیم مکی، چودھری غلام رسول مہر، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا عبدالرشید نعمانی، حکیم عبدالقوی دریاآبادی، مولانا محبّ اللہ لاری، مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی، مولانا محمد اسحٰق سندیلوی، سید صباح الدین، عبدالرحمٰن، علامہ یوسف بنوریؒ اور مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی رحمہم اللہ سرفہرست ہیں۔

ان سب سے مولانا کا بڑا گہرا ربط تھا، ان حضرات کو بھی مولانا سے بے حد تعلق ومحبت تھی، اتنے سارے اصحابِ کمال کا مولانا سے ربط خود مولانا کا امتیاز ہے، جو بہت کم افراد کو میسر آتا ہے۔

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر پرانے چراغ کے تینوں حصوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

❑❖❑

مسلمانانِ برصغیر کے مسائل اور

حضرت مولانا علی میاںؒ کی سرگرمیاں

یہ حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کی کرامت اور مقبولیت عنداللہ کا مظہر ہے کہ برصغیر خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام دینی وملی کاموں اور مسائل میں مولانا کے افکار اور آراء مشعل راہ ثابت ہوتے رہے، ہر اہم موقع پر لوگوں کی نگاہیں آپ کی طرف اٹھتی رہیں اور آپ کی رہنمائیوں سے استفادہ کیا گیا، خود مولانا نے مختلف طریقوں سے اپنے کو ان کاموں کے لئے وقف کرلیا تھا، مولانا کی ان خدمات کا احاطہ تو بڑا مشکل ہے، شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے ساتھ مولانا نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ مولانا کی زندگی کا ایک اہم باب ہے، اس کے علاوہ ہندوستان کی چار اہم تحریکیں مولانا کی ملی و دینی وقومی سرگرمیوں کی جولان گاہ رہی ہیں۔ ہم ان کا مختصراً ذکر کرتے ہیں:

مسلم مجلس مشاورت

مسلم مجلس مشاورت کے قیام کا سرا اصل میں دسمبر ۱۹۶۳ء اور فروری واپریل ۱۹۶۴ء کے کلکتہ، جمشید پور، واوڑکیلا اور رانچی کے ان خونچکاں فرقہ وارانہ فسادات سے جڑا ہوا ہے جن میں مسلمانوں کو وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا گیا اور جس کی مثال اس سے پہلے کے فسادات میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی، یہ ایک مجنونانہ کیفیت تھی جس کے جوش میں مقدس اور قریب تر رشتوں کا لحاظ بھی روا نہیں رکھا گیا، اس صورتِ حال نے ایک بار پھر مسلمانوں کو اس ملک میں اپنے مستقبل پر غور کرنے پر مجبور کردیا اور قیادت کے خلاء کے احساس کو شدت سے ابھارا، دوسری طرف انسان دوست اور شریف النفس ہندوؤں کی بھی ایک بڑی تعداد میدان

میں آ گئی، جس نے ثابت کیا کہ اس ملک کا ضمیر ابھی زندہ اور امید کی روشنی ابھی باقی ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے صورتِ حال کی سنگینی اور نزاکت اور اپنی ذمہ داریاں محسوس کرتے ہوئے اپنے رفیق قدیم مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ساتھ اس مسئلہ پر اولین توجہ مرکوز کی، اس سلسلہ میں مارچ ۱۹۶۴ء میں مولانا نے ناگپور کے ایک دیہات میں اچاریہ جی سے ملاقات کر کے ایک میمورنڈم پیش کیا، مگر ان کی طرف سے سرد مہری کا رویہ رہا، مولانا کو اس موقع پر یہ احساس شدت سے ہوا کہ اب اسی خود اعتمادی کی شان پیدا کر کے قیادت کے خلاء کو پر کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہو جانا چاہئے، دوسری طرف ملک میں انسانیت کے احترام، باہمی دوستی، امن وسکون اور اشتعال سے بچاؤ کی فضا بھی پیدا کرنی چاہئے۔

ڈاکٹر سید محمود مرحوم (جو ۱۹۵۶ء میں امور خارجہ کے وزیر بھی رہ چکے تھے اور مولانا سے گہرا ربط بھی رکھتے تھے) اس صورتِ حال سے سب سے زیادہ فکر مند تھے، ان کا خیال تھا کہ سیاسی لیڈروں کے ذہن گو مسموم ہو چکے ہیں؛ لیکن ہندوستانی عوام ابھی اس سیاسی زہر سے محفوظ ہیں، ان کا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ہے اور ان سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، ضرورت براہِ راست اُن تک پہنچنے اور اُن کے دلوں کے دروازوں پر دستک دینے کی ہے، اس عرصہ میں ڈاکٹر صاحب کا بار بار لکھنؤ جانا ہوا، خود مولانا بھی بارہا دہلی گئے، گفتگو کا یہی موضوع ہوتا تھا کہ اس صورتِ کا کس طرح مقابلہ کیا جائے؟ ڈاکٹر صاحب نے حضرت مولانا علی میاںؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی اور مولانا محمد مسلم مدیر ''دعوت'' سے ربط قائم کیا اور مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ جلد سے جلد ایک مسلم مشاورتی اجتماع بلایا جائے، جس میں راہِ عمل متعین کر کے کام کا آغاز کر دیا جائے، یہ اجتماع اگست ۱۹۶۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، شرکاء کی تعداد سو کے قریب تھی، ڈاکٹر سید محمود مرحوم کا پر مغز خطبہ بہت مؤثر ثابت ہوا، حضرت مولانا کا بھی ایک

اہم مضمون سنایا گیا، اجلاس میں کئی بحرانی لمحات (crisis) بھی آئے، بحث ومباحثہ میں اختلافِ رائے نے گرم گفتاری اور شعلہ نوائی کی شکل بھی اختیار کی اور کئی بار یہ اندیشہ بھی ہوا کہ یہ اجتماع بے نتیجہ ختم ہوجائے گا۔ اس موقع پر حضرت مولانا نے جذباتی انداز میں خطاب بھی کیا، جو مقاصد کی طرف توجہ مرکوز کرنے سے متعلق تھا، اس کا بڑا اچھا اثر پڑا؛ لیکن پھر جماعتوں کی نمائندگی کا مسئلہ سب سے زیادہ سنگین شکل اختیار کرگیا، ڈاکٹر صاحب بعض جماعتوں کے تعلق سے بڑا سخت موقف رکھتے تھے، حضرت مولانا نے اس نازک موڑ پر ڈاکٹر صاحب سے اپنے قدیم تعلق، موضوع کی اہمیت اور صورتِ حال کی نزاکت کا حوالہ دے کر؛ بلکہ پاؤں پکڑ کر اجتماع کو ناکام ہونے سے بچانے کی گذارش کی، ڈاکٹر صاحب نے بات مان لی اور خطرہ ٹل گیا، اس طرح مسلم مجلس مشاورت کے نام سے ایک وفاقی تنظیم اور نئی قیادت وجود میں آئی، ملک میں عام طور سے اس کا خیر مقدم کیا گیا اور اسے فالِ نیک سمجھا گیا۔

مجلس نے یہ طے کیا کہ اس کا ایک مؤقر وفد فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرے، ستمبر ۱۹۶۴ء میں بہار واڑیسہ کا دورہ شروع ہوا، وفد میں مولانا کی شرکت بھی ضروری سمجھی گئی، جمشید پور میں وفد کا بڑا اچھا استقبال ہوا، جلسہ عام میں مولانا کی تقریر سب سے کامیاب رہی، مولانا نے جمشید پور کی صنعتی مرکزیت کو (جس میں لوہا خاص کردار ادا کرتا ہے) موضوع بنا کر انسان کی پستی اور انسانیت کی ناکامی کا ذکر کیا، اور فرمایا کہ:

> ''اگر اس آہن خام کے زبان ہوتی جوان کارخانوں میں آکر تھوڑی سی انسانی حکمت وصنعت کی بدولت ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے اور انسانی تمدن وتہذیب کے کام میں اپنی افادیت ثابت کرتا ہے، تو وہ انسان پر اپنی برتری ثابت کرتا اور اس کی بے عنوانیوں اور لوہے کے مصنوعات کے غلط استعمال کو یاد دلا کر اس کو شرماتا اور کہتا کہ ہم کو ہمارے خالق نے اس لئے نہیں پیدا کیا تھا اور ہم پر ان کارخانوں میں اس لئے محنتیں صرف نہیں ہوئیں کہ ہم سے انسان کا جو اشرف المخلوقات ہے، گلا کاٹا جائے، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ان پڑھے

لکھے انسانوں کا قصور ہے جو ہم سے حفاظت کے بجائے ہلاکت کا، تعمیر کے بجائے تخریب کا اور تہذیب کے بجائے غارت گری کا کام لیتے ہے''۔ (پرانے چراغ ۱/۴۰۱-۴۰۲)

جمشید پور کے علاوہ متعدد علاقوں کا دورہ ہوا جو بہت کامیاب رہا، فضا سے نفرت کی گرد چھٹتی اور محبت وامن کا ماحول پیدا ہوتا نظر آیا، اور اس دورہ سے ارکانِ مجلس میں نئی امنگ، ولولہ اور حوصلہ پیدا ہوا، اس کے بعد بھی متعدد کامیاب دورے ہوتے رہے، جلس کی شاخیں جگہ جگہ قائم ہوئیں، دسمبر ۱۹۶۴ء میں ایک وفد گجرات گیا، حضرت مولانا مجلس کے اہم رکن کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے، جگہ جگہ تقریریں ہوئیں اور ان خطبات اور مجلسی گفتگو کا بڑا گہرا اثر نمایاں ہوا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی انگریزی اخبارات میں قوم پرست حلقوں کی طرف سے مجلس کے عزائم ومقاصد کے متعلق شبہات ظاہر کئے جانے لگے اور مسلمانوں میں اس کی اِس مقبولیت اور مسلمانوں کی اُس کے ساتھ گہری وابستگی اور غیر معمولی دلچسپی کو ایک نئے فتنہ کا پیش خیمہ بتایا جانے لگا۔ ڈاکٹر سید محمود مرحوم اس سے دل شکستہ ہوئے اور انہوں نے پریس کی تنقید کے جواب میں اکثر معذرت آمیز اور صفائی پیش کرنے کا انداز اختیار کیا جو کسی بھی طرح سے ان کی قائدانہ حیثیت کے شایانِ شان نہ تھا، اس موقع پر مولانا نے ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک مفصل خط لکھا، جس میں اپنے تأثر اور اس ذہنی کشمکش کا اظہار کیا جو اس وقت متعدد ارکانِ مجلس کے دماغوں میں پائی جارہی تھی، بہرحال مجلس کا کام نشیب وفراز کے ساتھ جاری رہا، مختلف جگہوں کے دورے ہوتے رہے، اس سلسلہ کا سب سے اہم اور طویل دورہ ۱۱/نومبر تا ۲۲/نومبر ۱۹۶۶ء کو ریاست میسور میں ہوا، یہ ساڑھے چار ہزار میل کا طویل دورہ تھا، جس میں تقریباً تمام اہم ارکانِ مجلس شریک تھے، وفد کا جگہ جگہ پر جوش خیر مقدم کیا گیا، ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نظارہ تحریک خلافت کے بعد پہلی بار دیکھنے میں آیا، میسور کا یہ دورہ مجلس کی شہرت اور مقبولیت کا نقطۂ عروج تھا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

''یہ ایک ایسا طویل ووسیع اور مؤثر دورہ تھا جو ہندوستان کی شاید کسی منظّم جماعت نے ماضی قریب میں نہیں کیا ہوگا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنوبی ہند کا یہ خطہ ملک کی پوری آبادی کو محبت واتحاد اور ملت اسلامیہ کو جرأت واعتماد کا پیام دینے والوں کے استقبال کے لئے امڈ آیا ہے، اس دوسرے سے اندازہ ہوا کہ اہل ملک کے ضمیر میں محبت کی کیسی چنگاری، قبول حق کی کتنی صلاحیت اور سلامت روی کا کتنا مادہ ہے، اور اگر بے لوث و بے غرض، خود آگاہ وخدا ترس خادم ملک وملت سیاسی اغراض اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہوکر اس ملک کے سیدھے سادھے باشندوں، خاموش مگر گرم جوش عوام سے براہِ راست رابطہ پیدا کریں اور ان کے دماغ سے زیادہ ان کے دل وضمیر کو خطاب کریں تو وہ کس طرح پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں، یہ پورا خطہ جو جنوبی ہند نہیں؛ بلکہ پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتا تھا، زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا اور دشت وجبل سے یہی صدا آرہی تھی:

ہم آہوان صحرا سر خود نہایت بر کف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد''

(کاروانِ زندگی ۲/۹۱-۹۲-۹۳ مختصراً)

یہ دورہ ۲۲/نومبر کو گلبرگہ کے تاریخ ساز اجلاس پر ختم ہوا، جس میں مولانا ہی کا خطاب حاصل اجلاس تھا؛ لیکن مجلس مشاورت کا مستقبل بڑا مبہم وغیر واضح نظر آتا جارہا تھا، مجلس کے ارکان کے درمیان خیالات کا انتشار واختلاف بھی نازک مسئلہ بنتا جارہا تھا، مجلس کے عناصر ترکیبی میں سے ایک اہم عنصر (جمعیۃ علماء ہند) تھوڑے ہی عرصے کے بعد بے تعلق ہوگیا تھا، صرف مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم اپنے چند رفقاء کے ساتھ شریک تھے۔

۱۹۶۷ء کے عمومی انتخابات مجلس کے لئے بڑے نامبارک ثابت ہوئے، اصلاً مجلس میں دو بنیادی خیالات کارفرما تھے، ڈاکٹر سید محمود مرحوم اور بعض دیگر حضرات کے خیال میں مجلس اس اخلاقی قیادت کے خلا کو پر کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی جو عرصہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ تھا، جب کہ دوسرے حضرات کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں میں ایسی قیادت

کا خلا ہے جو ان کے مسائل کو جرأت وقابلیت کے ساتھ پیش کر سکے اور وکالت کر سکے، مجلس کے اکثر ارکان کے ساتھ خود حضرت مولانا اسی خیال کے مؤید تھے، پہلا خیال انتخابات اور عملی سیاست سے جوڑ نہیں کھاتا تھا، دوسرا خیال انتخابات میں حصہ لینے اور مسلمانوں کو اس ملک میں مؤثر طاقت ثابت کرنے کی حقیقت وضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، یہ دو طریقۂ فکر تھے جو ۱۹۶۷ء کے انتخابات پر کھل کر سامنے آئے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی دوسرے طریقۂ فکر کے علم برداروں میں تھے، حضرت مولانا اور مجلس کے اکثر ارکان کی تائید ان کو حاصل تھی، ان حضرات کا مطالبہ انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت کا تھا، جو ڈاکٹر سید محمود صاحب نے بڑی سفارش کے بعد بادل ناخواستہ مروّت کا لحاظ کرتے ہوئے منظور کی، مجلس کی شاخوں نے انتخابات میں حصہ لیا اور پھر وہ سب پیش آیا جس سے انتخابات میں مفر نہیں۔ مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجلس کے وقار اور اس کے دفاعی ڈھانچہ کو مضبوط رکھنے کے لئے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے جو اس کی تشکیل میں شریک غالب تھا اور جس کے لئے اس وقت بھی کوئی جماعت میدان میں نہیں ہے، ڈاکٹر (سید محمود) صاحب کا طریقۂ فکر زیادہ مناسب تھا؛ لیکن اس وقت جب کہ ساری فضا انتخابات کے برقی کرنٹ سے گرم ہو رہی تھی اور اس مقصد کو ہاتھ سے دینا بڑا غیر دانشمندانہ اقدام نظر آتا تھا، یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا، خیالات کے اختلافات اور فیصلوں پر جب اس ماحول سے الگ کر کے جن میں وہ پیدا ہوئے تھے، تصنیف کے صفحات اور تاریخ کے گوشۂ عافیت میں غور کیا جائے گا تو کسی نہ کسی فریق کے ساتھ ناانصافی ضرور ہوگی''۔ (پرانے چراغ ۱/۴۲۱)

مجلس کی تجویز کے بموجب امیدواروں کی تائید ومخالفت میں پارٹیوں کے بجائے ان کی ذاتی صفات وخصوصیات کو پیش نظر رکھنے کی بات تھی، مگر سوء اتفاق ایسا نہ ہو سکا، بعض ریاستوں میں مسلمانوں نے یہ اصول نظر انداز کر دیا، خود ڈاکٹر سید محمود صاحب نے اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے حق میں تائیدی بیان دے دیا، اور بہار کے بعض ان کانگریسی

امیدواروں کی حمایت کی جن سے مسلمانوں کو شکایات تھیں، کانگریس کی سب سے زیادہ مخالفت یوپی میں ہوئی۔

اس مختلف طرز عمل نے مجلس کی صفوں میں بڑا انتشار پیدا کردیا اور مجلس کا شیرازہ بکھرتا نظر آیا، نتائج کے اعلان کے بعد مجلس کا اجلاس اپریل ۱۹۶۷ء میں دہلی میں منعقد ہوا، مجلس اس وقت موت وحیات کی کشمکش سے گذر رہی تھی اور اس کا خاتمہ قریب تر نظر آرہا تھا، ڈاکٹر صاحب نہایت بددل تھے، سب کے دل شکایتوں سے لبریز تھے؛ لیکن اللہ کا کرم ہوا، ڈاکٹر صاحب کو استعفاد ینے سے روکا گیا اور مشتعل جذبات میں سکون پیدا ہوا، اور اس طرح کے انتشار سے بچنے کے لئے یہ تجویز آئی کہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور ان کے رفقاء کو یوپی میں ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کی اجازت دی جائے، جو آئندہ انتخابات میں اسی کے نام سے حصہ لے اور یہ طے پایا کہ یہ مجلس اس وفاق کی اسی طرح رکن رہے گی جیسے مسلم لیگ وغیرہ سیاسی جماعتیں ہیں، ڈاکٹر عبدالجلیل کو اس تجویز کے مطابق عمل پر آمادہ کرنے کا کام حضرت مولانا کے ذمہ ہوا، جو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا، چناں چہ جون ۱۹۶۷ء میں مسلم مجلس قائم ہوگئی اور اس طرح سارے گلے دور ہوگئے۔

لیکن ڈاکٹر سید محمود مرحوم میں اب پہلی جیسی امنگ اور ولولہ نہیں رہا، وہ مستقل مریض بھی چل رہے تھے، چناں چہ انہوں نے مجلس کے ایک جلسہ میں ہزار ہا سفارش وگذارش کے باوجود استعفاد ے دیا اور حضرت مولانا سے صدارت کا منصب قبول رکنے کے لئے اصرار کیا، مگر مولانا اس پر راضی نہ ہوئے اور باتفاقِ رائے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو صدر منتخب کیا گیا، ۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ڈاکٹر محمود صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

۱۹۶۷ء کے بعد سے مجلس مشاورت میں وہ روح، جوش وخروش اور فعالیت باقی نہیں رہی جو اس کے تاریخ ساز دوروں اور تعمیری سرگرمیوں میں تھی، مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ نے

اپنی ذہانت اور مختلف الخیال افراد اور جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی اپنی بے مثال صلاحیت سے مجلس مشاورت کو بڑی حد تک زندہ رکھا۔ ۱۹۸۰ء میں مرادآباد کے فساد کے موقع پر مجلس کے وفد نے مرادآباد کا دورہ کیا، حضرت مولانا بھی تشریف لے گئے، مگر مجلس کے حالات اچھے نہیں تھے اور ۱۹۸۴ء میں مفتی صاحب کے انتقال کے بعد سے تو مجلس کی ساری سرگرمیاں دفن ہو کر رہ گئیں۔

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنے احساسِ دروں اور جوشِ ایمانی کے نتیجہ میں مجلس کے قیام کی آواز اٹھائی، اس کی تمام سرگرمیوں میں شریک رہے، اور ہر نازک موڑ پر اس کو بچانے اور باقی رکھنے کے لئے کوشاں رہے، مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم سے مولانا کی سرگرمیاں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

مجلس کا ڈھانچہ اب بھی قائم ہے، اقتدار کے لئے رسہ کشی بھی جاری ہے، اس وفاقی واصولی قیادت کی ضرورت اب بھی باقی ہے اور اُس کا کوئی نعم البدل بھی سامنے نہیں آسکا ہے؛ لیکن اِس کے لئے اُن قائدانہ خصوصیات کے حامل افراد کہاں سے ملیں جن میں حضرت مولانا جیسی وسعت واخلاص، بے لوثی اور استغناء اور کام کی تڑپ اور لگن ہو؟

انہیں جیسے افراد کو میدان میں آنے اور مشاورت کی ذمہ داری سنبھالنے کی ضرورت ہے، مجلس کے مقاصد اب بھی حاصل ہو سکتے اور اور اس کا تعمیری کردار اب بھی سامنے آسکتا ہے:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں پر
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

تحریکِ پیامِ انسانیت

تحریک پیامِ انسانیت خود حضرت مولانا علی میاںؒ کے دل کی گہرائیوں سے ابھری ہوئی تحریک ہے، اور عشق کے اس دردمند کے نئے انداز و پیام کا مظہر بھی ہے، بقولِ شاعر:

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

حضرت مولانا کا یہ احساس تھا کہ:

''فطری طور پر آدمی اپنے اس گھر کی بربادی نہیں دیکھ سکتا، جہاں اسے رہنا ہے اور جہاں اس کی عزیز متاع اور اُس کی زندگی کی پونجی ہے، اور جس کے بنانے اور سنوارنے پر اس کی اور اس کے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ہوئی ہیں، یہ ہر سلیم الفطرت؛ بلکہ صحیح الفطرت انسان کا خاصہ ہے کہ جس کشتی پر وہ سوار ہے اس میں وہ کسی کو سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور جس شاخ پر اس کا نشیمن ہے، عقل وہوش کے عالم میں نہ خود اس پر تیشہ چلاسکتا ہے، اور نہ کسی کو تیشہ زنی کی اجازت دے سکتا ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۲/۱۱۰)

روزمرہ کے مشاہدہ میں ملک میں اخلاقی انارکی، قومی واجتماعی خودکشی، بے دردی کے ساتھ اخلاقی وانسانی قدروں کی پامالی، خودغرضی وخودپرستی کا جنون، انسان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی انتہا درجہ بے قدری، حقیر شخصی فوائد اور مادی منافع کے لئے اجتماعی وملکی مفادات کی بآسانی قربانی، احساسِ ذمہ داری کا فقدان، زندگی کے تمام شعبوں میں بے عنوانی، فرقہ وارانہ منافرت اور باہمی کشمکش اور رسہ کشی کے جو ہولناک اور دل سوز مناظر سامنے آرہے تھے، ان کو دیکھ کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دل میں قلق واضطراب کے ساتھ اس فضا کو ختم کرنے کا احساس وجذبہ بڑھتا گیا، حجاز ومصر وشام وغیرہ کے طویل ترین سفر سے واپسی کے بعد مولانا نے ۱۹۵۲ء میں بڑی قوت اور جوشِ عمل کے ساتھ اپنی دعوتی سرگرمیاں شروع کیں، ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کو حق وانصاف کی بات بتانے اور راہ دکھانے اور ایک صاف ستھرا اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کا خیال مولانا کے دل میں آیا، مولانا نے ایک مضمون ''ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے'' کے عنوان سے لکھا اور ملک کے تقریباً تمام سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں اور وزراء کو بھیجا، اس کے بعد پھر ۱۹۵۴ء میں یہ

کوشش شروع ہوئی اور مختلف ہندو مسلم مخلوط اجتماعات ہوئے، لکھنؤ، گورکھپور، جونپور، مئو اور غازی پور وغیرہ مشرقی اضلاع میں متعدد پروگرام ہوئے، مولانا کی یہ تقریریں ''پیامِ انسانیت'' اور ''مقامِ انسانیت'' کے عنوان سے طبع ہوئیں۔ مولانا نے بڑے سلیقہ، احتیاط اور حکمت اور نفسیات کی رعایت کے ساتھ اپنی باتیں کہیں جو بہت پسند کی گئیں اور ان کی اثر پذیری کے عجیب واقعات بھی پیش آئے، تقریر ختم کرنے کے بعد سامعین کی طرف سے مزید سننے کی پیشکش بھی آئی، جسے مولانا نے قبول کیا، یہ سلسلہ بیچ میں مولانا کے بیرونی اسفار کی وجہ سے بند ہوگیا جسے شدتِ احساس کی وجہ سے مولانا نے اپنی اخلاقی کوتاہی اور قابل محاسبہ عمل سمجھا اور پھر طویل وقفہ کے بعد دسمبر ۱۹۷۴ء میں یہ کام الٰہ آباد سے شروع ہوا، مولانا کے یہ تجربات واقدامات (اس درجہ کامیابی وتاثیر کے بعد) ۱۹۷۴ء میں ''پیامِ انسانیت'' کی تحریک کی شکل اختیار کر گئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''بہت انتظار کرنے کے بعد اپنی بے سروسامانی، تنہائی وبے اثری کا پورا علم واحساس ہونے کے باوجود ہم نے میدان میں آنے اور بلاتفریق مذہب وملت اس ملک کے رہنے والوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا کہ جب کسی محلّہ یا گاؤں میں آگ لگتی ہے تو کوئی اپنی کمزوری اور بے نوائی کو نہیں دیکھتا، گونگے بھی چلا اٹھتے ہیں اور اپاہج بھی دوڑ پڑتے ہیں''۔ (کاروانِ زندگی ۲/۱۱۱)

اس تحریک کے قیام کے بعد ایک انٹرویو میں مولانا نے اس تحریک کے بارے میں اپنے احساسات ظاہر کئے اور اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ بھی اس دعوت وتحریک سے کچھ فائدہ پہنچے گا؟ فرمایا:

''میرے نزدیک مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ اس کا کچھ بھی فائدہ نہ پہنچے اور ملک کو فائدہ پہنچ جائے، جب بھی اُن کو یہ کام کرنا چاہئے، وہ اپنے دین ومنصب کے لحاظ سے اس کے لئے مامور ہیں اور ملک کے ہر فائدے میں شریک؛ لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت طریقہ پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں اور

اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پر کریں جو عرصۂ دراز سے اس ملک میں چلا آ رہا ہے، کسی ملک میں کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی واضح افادیت وضرورت اور بے لاگ اور بے غرض قیادت ودعوت کے بغیر عزت واطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اقبالؒ نے صحیح کہا ہے:

ع: زندگی جہد است استحقاق نیست''

(کاروانِ زندگی ۲/۱۱۵)

چناں چہ بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، پنجاب اور یوپی ہر جگہ کے کامیاب دورے ہوئے، مؤثر تقریریں ہوئیں۔ مئی ۱۹۷۵ء میں لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں ایک جلسہ ہوا، اس میں مولانا نے بے حد مؤثر تقریر فرمائی جو ''اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے'' کے عنوان سے طبع ہوئی، ۱۶/اپریل ۱۹۷۸ء کو سیوان میں ایک جلسہ عام ہوا، مولانا کی تقریر کا عنوا تھا ''جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹیر کا دورہ پڑتا ہے'' اس تقریر کا آخری اقتباس کتنا مؤثر اور طاقتور ہے۔

''میں انسانیت کو سویا ہوا سمجھتا ہوں مرا ہوا نہیں سمجھتا، انسانیت سو بار سوئی سو بار جگائی گئی، آیئے ہم آپ سب مل کر سوئی ہوئی انسانیت کو جگائیں، پہلے خود جاگیں پھر دوسروں کو جگائیں، سویا ہوا سوئے ہوئے کو نہیں جگا سکتا، ایک جاگتا ہوا سیکڑوں سوئے ہوؤں کو جگا دیتا ہے؛ لیکن سوسوئے ہوئے ایک سوئے ہوئے کو بھی جگا نہیں سکتے''۔

(کاروانِ زندگی ۲/۱۲۱)

۳۱/دسمبر ۱۹۷۸ء کو مولانا نے مرادآباد کے ایک جلسہ پیامِ انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے ایک سوال اٹھایا، پھر اسی کا جواب دیا، وہ سوال ہی تقریر کا عنوان بن گیا۔ دنیا میں آنے والے انسان چمن کے کانٹے ہیں یا پھول؟ اس تقریر کے آخر میں مولانا نے وہی بات دہرائی کہ:

''مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں، خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک سویا ہے، مرا نہیں، سویا ہوا جگایا جا سکتا ہے؛ لیکن مرا ہوا جلایا نہیں جا سکتا، ہم سوئے ہیں مرے نہیں، خدا کا شکر ہے ہم

کئی بار سوئے کوئی بار جاگے، یہ انسانیت کئی بار سوئی کئی بار جاگی، اور جاگی تو ایسی جاگی کہ اپنے سونے کی سب تلافی کر دی''۔ (دنیا میں آنے والے انسان چمن کے کانٹے ہیں یا پھول ۲۹)

پیامِ انسانیت کے سلسلہ کا سب سے کامیاب اور حیرت انگیز دورہ ۲۱؍مارچ تا ۳۱؍مارچ ۱۹۷۸ء میں ہریانہ و پنجاب کے ان علاقوں میں ہوا جو آزادی کے موقع پر بڑے حساس رہ چکے تھے، اور وہاں مسلمانوں کی آبادی برائے نام رہ گئی تھی؛ لیکن اس کاروانِ انسانیت کو کوئی خوش گوار تجربہ نہیں ہوا، چندی گڑھ کے عظیم اجلاس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے عظیم مجمع واتحاد سے یہ اندازہ کیا گیا کہ اس کام کی کتنی گنجائش ہے اور کتنی ضرورت اور لوگوں میں اس کے قبول کرنے کی کتنی صلاحیت ہے؟

نومبر ۱۹۷۷ء کے اواخر میں اور دسمبر کے اوائل میں ایک دس روزہ دورہ ہندوستان کے وسیع ترین صوبہ مدھیہ پردیش کا ہوا تھا، یہ بھی بہت کامیاب ثابت ہوا تھا، اس کی تفصیلی روداد مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم کے قلم سے ''تحفۂ انسانیت'' کے نام سے طبع ہو چکی ہے، ہر جگہ اس پیام کا استقبال کیا گیا اور لوگوں کا یہ احساس رہا کہ ان مسلمانوں کو ہم سے زیادہ ملک کی سلامتی کی فکر ہے اور باہمی امن کے لئے تڑپ ہے۔

اس تحریک میں مولانا کے ساتھ کام کرنے والوں میں مولانا اسحٰق جلیس ندوی زیادہ پیش پیش تھے، ان کی زبان وقلم اس کے بہت مؤثر ترجمان بن گئے تھے، اس کے بعد مولانا محمد الحسنی کو بھی اس تحریک سے پوری مناسبت تھی، دونوں نے مل کر وہ حلف نامہ بھی تیار کیا جو ہر طبقہ پر حاوی اور ہمہ گیر ہے، تحریک کے تعارف میں بھی دونوں کا قلم یکساں رواں دواں تھا، مگر دونوں رفقاء ۱۹۷۹ء میں چند ہفتوں کے وقفہ سے اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کی جواں مرگی سے تحریک کو بڑا صدمہ پہنچا، مولانا کے دیگر معاونین میں قاضی عبدالحمید اندوری، پروفیسر انیس چشتی، جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب کی کوششیں قابل قدر ہیں، دیگر علماء نے بھی مولانا کا تعاون کیا اور ساتھ دیا۔

۱۹۸۰ء میں مرادآباد کے فرقہ وارانہ فساد سے (جو عیدگاہ میں دورانِ نمازِ عید پیش آیا) مولانا کے قلب ودماغ کو جو کوفت اور چوٹ پہنچی، اس کے پس منظر میں مولانا نے لکھنؤ کی بارہ دری میں پیام انسانیت کے عنوان سے ۲۷-۲۸/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ایک اہم اجلاس بلایا، اجلاس میں مختلف خیالات ومذاہب کے لوگ شریک ہوئے، مولانا کا خطبہ (جو ''ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لئے حقیقی خطرہ'' کے عنوان سے کئی زبانوں میں شائع ہوا) اس اجلاس کا حاصل تھا، اس کے بعد اس عنوان سے مختلف جلسے مختلف موقعوں سے ہوتے رہے۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں بندیل کھنڈ کے ایک دورہ کا پروگرام شروع ہوا جو حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معاونت سے بڑا کامیاب ثابت ہا، اس عرصہ میں مولانا کو شدت سے یہ احساس ستا رہا تھا کہ ملک کی اکثریت مسلمانوں کے بنیادی عقائد، ان کے دینی وملی مزاج وفطرت اور ان کے اہم ترین مسائل وجذبات سے بے حد ناواقف ہے، پھر منافرت انگیز لٹریچر، سیاسی پروپیگنڈوں، زہر آلود ورنگ آمیز تاریخ اور بے تحقیق داستانوں کی بنا پر معاملہ نفرت واشتعال اور تذلیل وتحقیر کے جذبات تک پہنچ چکا ہے، نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ جو بڑے زور وشور سے اٹھایا گیا تھا، اس میں بھی تلخ تجربات ہوئے تھے، جن کی وجہ سے یہ داعیہ مولانا کے دل میں بڑی قوت سے پیدا ہوا کہ اس مقصد کے لئے ڈائیلاگ (Dialogue) منعقد کرائے جائیں۔

اس سلسلہ میں دہلی میں پہلا ڈائیلاگ ۴/مئی ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوا، مولانا کا مضمون ''مسلمانوں کے مسائل وجذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے'' کے عنوان سے طبع ہو چکا تھا جو پڑھا اور تقسیم کیا گیا، اس میں مسلم پرسنل لاء کی اہمیت کا ذکر بھی تھا اور پیام انسانیت کے تعلق سے مؤثر باتیں کہی گئی تھیں، یہ ڈائیلاگ زیادہ کامیابی حاصل نہ کرسکا، ساری محنتوں اور کوششوں کے باوجود بھی فضا کے غیر معتدل ہونے کی وجہ سے غیر مسلم صحافیوں، دانشوروں اور پارٹیوں کے رہنماؤں کی شرکت نہ ہونے کے برابر رہی۔

دوسرا ڈائلاگ ۵/اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ناگپور میں ہوا، مولانا کا مضمون ''ملک ومعاشرہ انتائی خطرناک موڑ پر ہے'' تقسیم ہوا، اس کے علاوہ مولانا کی کئی تقریریں ہوئیں، یہ ڈائیلاگ کافی کامیاب اور مؤثر ثابت ہوا۔

اس کے بعد فروری ۱۹۸۷ء میں پونہ میں تیسرا ڈائیلاگ منعقد ہوا، جس میں مولانا کا مقالہ ''ملک کے بہی خواہوں کے سوچنے اور کرنے کی باتیں'' بڑے سکون وتوجہ سے سنا گیا، کئی بار تالیوں سے بھی سامعین نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

۲۹/دسمبر ۱۹۸۸ء کو حیدرآباد میں ''پیامِ انسانیت'' کی ایک کانفرنس میں مولانا شریک ہوئے اور اس کے خصوصی وعمومی جلسے بڑے کامیاب رہے۔ ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور میں جو ہولناک ولرزہ خیز فساد ہوا اس نے ہر صاحب شعور انسان کے دل کو زخمی اور احساسات کو مجروح کردیا، مولانا نے اس موقع پر ہندوستان کے ممتاز دانشوروں کے نام ایک پراثر خط لکھا، جس میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا، یہ خط مولانا کے احباب نے ہندوستان کے سربرآوردہ افراد تک پہنچایا، اسی موقع پر ایک تاریخ ساز کنونشن کا فیصلہ ہوا، جو ۱۷/مارچ ۱۹۹۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا، مولانا کا مؤثر وپرجوش خطاب اس اجلاس کی روح ثابت ہوا، مولانا نے اپنے خطاب میں فرمایا:

> ''تاریخ کا باب ایک سویا ہوا ہے، شیر سوتا رہے آپ بغل سے اپنے راستہ سے نکل جایئے، شیر جگادینے پر آپ اپنا راستہ خود طے کرنے کے لائق نہیں رہ جائیں گے، فرقہ واریت کی نفرت میں آدمی خدا سے لڑتا ہے، کمہار گھڑے بناتا ہے، کبھی اس کے دو چار گھڑے توڑ کر دیکھو تو کیا ہوتا ہے، انسان کو تو خدا نے بنایا ہے پھر بھی اس کی پرواہ کئے بغیر پاگل انسان انسانوں کو مارنے پر آمادہ ہوجاتا ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۴/۱۹۶-۱۹۷ مختصراً)

۱۲/جون ۱۹۹۰ء میں بنگلور میں ایک اجلاس ''پیامِ انسانیت'' کے تعلق سے ہوا، مولانا نے اپنے خطاب میں تشدد (Violence) اور رشوت خوری وبدانتظامی (Corruption)

کا بڑی مضبوطی سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور امن ومحبت کا پیغام دیا، جس کے بحمد اللہ اچھے نتائج سامنے آئے۔ ۲؍جولائی ۱۹۹۰ء کو لکھنؤ میں بھی ایک جلسہ بلایا گیا، جس میں دانشوران وسیاسی رہنما بڑی تعداد میں شریک ہوئے، مولانا نے بے انتہاء مؤثر تقریر کی اور اس بات پر زور دیا کہ غلطی کو غلطی نہ ماننا اور احساسِ جرم وگناہ ختم ہوجانا ہی سب سے خطرناک چیز ہے، یہ اجلاس بہت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ دسمبر ۱۹۹۰ء میں ضلع سلطان پور کی ایک دینی درس گاہ میں پیام انسانیت کے عنوان سے آنکھ کے آپریشن کا ایک مشترک کیمپ بھی لگایا گیا، جس میں سیکڑوں مریضوں کا مفت آپریشن بڑی کامیابی کے ساتھ ہوا، مولانا اس موقع پر وہاں تشریف لے گئے اور اپنے مختصر سے خطاب میں انسانیت کا پیغام پہنچایا اور فرمایا کہ یہ عظیم ثواب کا کام ہے، جو منافرت وبے اعتمادی کی فضا کم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کا اندوہ ناک حادثہ پیش آیا، جس کی منظر کشی بے حد دشوار ہے، اس کے فوراً بعد ہی ممبئی، مہاراشٹر اور سورت کے ہولناک فسادات اور مسلمانوں کے ہوش ربا جانی ومالی نقصانات نے حضرت مولانا کو بے حد بے چین اور فکر مند کردیا، ملک میں اس اٹھتے ہوئے طوفان کے خلاف مولانا نے ۶؍جنوری ۱۹۹۳ء کو لکھنؤ میں ایک عظیم مخلوط مجمع کے سامنے بڑی مؤثر تقریر کی اور پوری صفائی اور جرأت کے ساتھ خطرہ کی گھنٹی بجانے اور قلب وضمیر پر چوٹ لگانے کی کوشش کی، یہ تقریر ''ملک ومعاشرہ کا سب سے خطرناک مرض! ظلم وسفاکی'' کے نام سے طبع ہوئی، اس میں مولانا نے ظلم وستم کی مذمت کا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ:

> ''ملک کی تین چولیں اگر بیٹھ جائیں تو ملک باقی رہ جائے گا اور وہ تین چولیں ہیں: ''ایجوکیشن، پولیس اور پریس'' یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ اگر یہ درست ہوجائیں تو پھر کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے''۔ (ظلم وسفاکی ۲۳ مختصراً، از: مولانا علی میاںؒ)

۳۰؍جون ۱۹۹۳ء کو پٹنہ میں ایک غیر معمولی تاریخی اجلاس ''پیامِ انسانیت'' کا ہوا،

مولانا نے دل کھول کر اپنی بات کہی اور اپنا پیغام پہنچایا، اسی کے بعد اکتوبر ۱۹۹۴ء میں لکھنؤ میں ایک اہم اجلاس اِسی موضوع پر ہوا، جس میں مولانا نے یہ پیام دیا کہ اس وقت ملک کو بربادی سے بچانے کے لئے دیوانوں کی ضرورت ہے، مولانا کی اس تقریر کا بڑا اچھا اثر محسوس کیا گیا۔ ۸/جون ۱۹۹۸ء کو پونہ میں بھی پیام انسانیت کا ایک اجلاس بلایا گیا، مولانا نے اس مؤقر اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انسان سے انسان کی نفرت کو سب سے بڑا خطرہ اور اس کے سدِ باب کی کوشش کو سب سے بڑی ذمہ داری قرار دیا۔ ۱۴/نومبر ۱۹۹۸ء ہی کو بہار کے مشہور شہر گیا میں ایک عظیم الشان جلسہ پیام انسانیت کے تعلق سے ہوا، مختلف تنظیموں اور مذہبی وعلمی مراکز کے ہندو ذمہ دار بڑی تعداد میں شریک ہوئے، مولانا نے اپنے خطاب میں اعتدال (Normalcy) کے ساتھ زندگی گزارنے کی دعوت دی، یہ تقریر بڑے سکون واطمینان کے ساتھ سنی گئی۔ اس کے بعد یکم مارچ ۱۹۹۹ء کو بنگلور میں بھی پیامِ انسانیت کا ایک کامیاب اجلاس ہوا، جس میں مولانا نے بڑا بصیرت افروز خطاب کیا، پیامِ انسانیت کے عنوان سے غالباً یہ مولانا کا سب سے اہم آخری خطاب تھا۔

اس کے علاوہ مولانا نے اپنی مختلف کتابوں میں بھی بنیادی موضوع تعمیرِ انسانیت، ایک بہترین انسانی سماج کی تشکیل اور انسانوں کی صلاح واصلاح کو بنایا ہے، جس کے واضح نمونے ان کی مشہور تصانیف ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی وتعمیری کردار، انسانت کے محسن اعظم'' وغیرہ میں ملتے ہیں۔

پیامِ انسانیت کی یہ تحریک (بعض مخالفین کے پروپیگنڈوں کے باوجود) اپنی نوعیت کی پہلی، بے انتہا ضروری، اہم اور کامیاب تحریک تھی جو کسی خوفزدہ اور مرعوب ذہنیت کی پیداوار نہ تھی؛ بلکہ ملک وقوم کی خیرخواہی وخیرسگالی پر مبنی ایک مثبت اصلاحی وتعمیری تحریک تھی،

پیامِ انسانیت کی یہ صدا پوری بیسوی صدی میں مولانا کے علاوہ کسی نے اتنے مؤثر، پرجوش اور منظّم انداز میں نہیں لگائی، یہ مولانا کا عظیم ترین کارنامہ اور امتیاز ہے۔ مولانا نے پیامِ انسانیت کو مقبول بنانے کے لئے نفسانیت کی رعایت کے ساتھ بڑا دل کش اسلوب اختیار کیا تھا، پیامِ انسانیت کی اکثر تقریروں اور تحریروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی اس مثال کو بار بار دہرایا کہ ''ایک کشتی کے سوار اگر دوسرے کو کشتی میں سورخ کرنے سے نہیں روکتے تو بالآخر سبھی ڈوب جائیں گے''۔ (ماہنامہ ''نیا دور''ص:۵ لکھنؤ مارچ ۲۰۰۰ء)

اپنی تقریروں میں مولانا نے یہ بات بھی بار بار دہرائی کہ:

''اگر کانٹے کے جواب میں سبھی کانٹے بچانے لگیں تو ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہوجائیں گے، اس لئے کانٹوں کے جواب میں پھول بچھانے کی کوشش کرنی چاہئے؛ تاکہ ہر طرف پھول ہی پھول ہوں''۔ (ماہنامہ ''نیا دور''ص:۶ لکھنؤ مارچ ۲۰۰۰ء)

مولانا نے جگر مرادآبادی مرحوم کے ان اشعار کو بارہا اپنی تقریروں کا موضوع بنایا:

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں
کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے
یہ مے کدہ کی یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف کوئی شرم سار آئے
خلوص و ہمتِ اہلِ چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

پیامِ انسانیت کے تعلق سے مولانا نے اپنا پیغامِ محبت جہاں تک ممکن تھا پہنچایا، تقریروں اور مقالات کے علاوہ ذاتی مجلسوں، وزراء واعیانِ حکومت اور دانشوروں سے ملاقاتوں اور گفتگو میں بارہا مولانا نے عدم تشدد (Nonviolenoe) جمہوریت (Democracy) اور نامذہبیت (Secularism) کے اصول یاد دلائے۔

وحدتِ ادیان اور اس جیسے بہت سے خطرات سے بچتے ہوئے مولانا نہایت دانش مندی، دور اندیشی اور حکمت واحتیاط کے ساتھ تقریباً نصف صدی تک سچی حب الوطنی، احترامِ انسانیت اور بقائے باہم (Coexistence) کے حدود میں رہتے ہوئے انسانیت کا پیغام دیتے رہے، جس کی تفصیلات ان کی خودنوشت سوانح حیات کی تمام جلدوں میں جگہ جگہ ملتی ہیں، مولانا کی باتوں اور تجاویز کی پذیرائی بھی خوب ہوئی، جو ان کے اخلاص اور سوزِ اندرون کی دلیل تھی۔

افسوس ہے کہ مولانا کے بعد اس سمت میں بھی ابھی کوئی پیش قدمی نہیں ہو پا رہی ہے، حالات کا مطالبہ اور ضرورت ہے کہ مولانا کے مشن کو آگے بڑھایا جائے اور یہ کاروانِ محبت پھر سے رختِ سفر باندھ کر نکل پڑے اور کوئی سنگ گراں اس کی راہ میں حائل بھی ہو تو اسے ٹھکراتا ہوا نکل جائے اور اس سفر میں اُسے کہیں بھی پڑاؤ ڈالنے کا تصور نہ ہو، یہ پیغام اپنی قوت وتاثیر سے ناسازگار حالات کو سازگار بنانے میں بڑا معاون ثابت ہوسکتا ہے:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

دینی تعلیمی کونسل

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی سے ہندو احیائیت (Revivalism) نے اپنی جڑیں مضبوط کرنی شروع کردی تھیں، بیسک ریڈروں مآں ہندو دیومالا (Mythology) کی باتیں اور مشرکانہ اسباق وکہانیاں بڑھتی جارہی تھیں، مسئلہ پیچیدہ ہوتا جارہا تھا، نصابِ تعلیم اور تاریخ میں تحریف وتلبیس کی یہ دشمنانہ سرگرمیاں مسلمانوں کی نئی نسل کو عقیدۂ توحید سے ناآشنا اور کفریہ عقائد سے متأثر کرنے کے لئے کمربستہ تھیں، اس سلسلہ میں ایک کام تو یہ کرنے کا تھا کہ حکومت سے تعلیمی پالیسی میں دیانت

داری، نامذہبیت، غیر جانب داری اور سب فرقوں کے ساتھ یکساں معاملات کا مطالبہ کیا جائے، دوسرا کام یہ تھا کہ مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم کا نظم خود کریں، ایسے مکاتب و مدارس کا قیام عمل میں آئے، جن میں اردو، عقائد و دینیات کی ابتدائی ٹھوس تعلیم کے ذریعہ اسلامی نقوش کو ذہنوں میں ثبت کر دیا جائے۔

تعلیمی میدان میں ان خطرات کا احساس سب سے پہلے ضلع بستی کے ایک بالغ نظر دانشور قاضی محمد عدیل عباسی کے دل میں پیدا ہوا، رفتہ رفتہ یہ احساس ان کے ذہن و اعصاب پر ایسا مستولی ہو گیا کہ انہوں نے اپنی ساری توانائیاں اور ذہنی صلاحیتیں اسی میں صرف کریں، ایک عرصہ تک وہ ضلع بستی ہی کے حدود میں اس خطرہ کا مقابلہ اور مکاتب قائم کرنے کا کام خاموشی سے کرتے رہے؛ لیکن پھر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے اپنے بعض رفقاء کے ساتھ مل کر قاضی صاحب سے کام کا دائرہ وسیع کرنے اور کم از کم صوبائی پیمانہ پر کام انجام دینے پر اصرار کیا۔ ۳۰-۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء اور یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو بستی میں ایک صوبائی عظیم دینی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، صوبہ کے باہر سے بھی دانشور اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بڑی تعداد میں تشریف لائے، مولانا بھی اس کانفرس میں شریک ہوئے، اور اپنا وقیع مقالہ پیش کیا۔ اجلاس میں دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا اور اس کی صدرت کے لئے باتفاق رائے حضرت مولانا ہی کا انتخاب ہوا، مولانا تاحیات کونسل کے صدر رہے، قاضی محمد عدیل صاحب عباسی کو جنرل سکریٹری بنایا گیا اور انہیں ایڈوکیٹ ظفر احمد صدیقی کی صورت میں اپنا ایک سرگرم و مخلص معاون مل گیا، کونسل کی سرگرمیاں جاری رہیں، مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار اور بنیادی مقاصد کے لئے جب خطرات پیدا ہونے لگے تو حضرت مولانا اور کونسل کے تمام ارکان و ذمہ داران نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، لکھنؤ کے علیگ حلقہ نے اسے ایک تحریک کی شکل دی تھیں، جس کے ساتھ مولانا

کا تعاون اخیر تک جاری رہا، اور مولانا ہر دنور میں اسے مسلمانوں کی ایک بڑی ملی خدمت اور وقت کا تقاضا سمجھتے رہے۔

جنوری ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ میں، نومبر ۱۹۶۱ء میں ٹونک راجستھان میں اور جون ۱۹۶۴ء میں الٰہ آباد میں دینی تعلیمی کونسل کی تین زبردست کانفرنسیں ہوئیں، مولانا نے ہر موقع پر بحیثیت صدر مؤثر خطبہ دیا۔ ۱۹۶۳ء کے اواخر تک کونسل کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا تھا کہ آٹھ ہزار مکاتب قائم ہوگئے تھے جن میں چار لاکھ طلبہ تعلیم پا رہے تھے۔

کونسل کے فعال ارکان میں ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کا نام سرفہرست ہے، جو ۱۹۸۰ء میں قاضی محمد عدیل صاحب کے سانحۂ ارتحال کے بعد سے اب تک جنرل سکریٹری ہیں اور اپنی ذمہ داریاں بڑے نشاط و جوش کے ساتھ انجام دے رہیں ہیں۔

فروری ۱۹۸۳ء میں بستی میں ایک اہم دینی کانفرنس منعقد ہوئی، مولانا تشریف لائے اور ''دین و ایمان کو جسم و جان پر ترجیح دینا ایمانی تقاضا ہے'' کے عنوان سے ایمان افروز خطاب فرمایا، اس کے بعد نومبر ۱۹۸۶ء میں بنارس میں کونسل کی چھٹی صوبائی کانفرنس ہوئی، جس میں نمائندوں اور ارکان کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔

۱۹۸۹ء میں ریاست اتر پردیش میں دو قانون ایسے سامنے آئے جو ان مکاتب و مدارس کے تعطل کا ذریعہ بن سکتے تھے، پہلا مسئلہ مکاتب و مدارس کے لئے کم سے کم اجرت کے قانون اور رجسٹریشن (Minimum Wages) کا تھا، جس سے ان اداروں کا وجود خطرہ میں نظر آنے لگا، جونیئر ہائی اسکول کو اقلیتی حیثیت نہ دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا، بڑے عصری تعلیمی ادارے بھی اس سے محروم رکھے گئے۔ دوسرا مسئلہ عربی مدارس کی اقامت گاہوں کو یتیم خانوں کے زمرہ میں شامل کر کے انہیں رجسٹریشن کا پابند کرنے کا تھا، اس نازک صورتِ حال کے خلاف قانون کی منسوخی کی آواز اٹھائی گئی، اور دینی تعلیمی کونسل نے لکھنؤ میں

یکم ودو جون ۱۹۸۹ء کو کل ہند دینی تعلیمی کنونشن منعقد کیا، اس میں بڑی تعداد میں علماء مفکرین اور دانشور جمع ہوئے، مولانا نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں اس قانون کی مخالفت کے ساتھ دینی مدارس کے ذمہ داروں کو قناعت تاور عوام سے مکمل ارتباط اور ایثار وقربانی کی دعوت دی، مولانا کے خطاب کا آخری اقتباس ملاحظہ ہو:

''لیکن اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ اور مدارس ومکاتب کے کارکنوں وخدمت گذاروں کو کسی نہ کسی درجہ میں ایثار وقناعت سے کام لینے اور ایمان واحتساب کے ساتھ اس چراغ کو روشن رکھنے اور اس کی روشنی دور دور اور دیر دیر تک پہنچاتے رہنے کی کوشش وجانفشانی بھی جاری رکھنی چاہئے کہ اس دین کا ماضی، حال اور مستقبل ایمان ویقین، ایثار وتوکل اور عزم وہمت سے وابستہ رہا ہے اور رہے گا، اور یہی جوہر ہر طرح کے بدلے ہوئے حالات اور تیز وتند آندھیوں میں اس چراغ کو گل ہونے سے بچاتا رہا ہے اور بچاتا رہے گا۔ بقول اقبالؒ:

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دئے ہیں اندازِ خسروانہ

میں مزید اقبالؒ کے ان اشعار پر گذارش کا اختتام کرتا ہوں کہ:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم''

(کاروانِ زندگی ۴/۸۷)

اس موقع پر رات کے جلسہ عام میں بھی مولانا نے بے حد اہم تقریر فرمائی، اس کے بعد ۱۲/جون ۱۹۹۲ء کو انجمن تعلیمات دین مرادآباد کے زیر اہتمام ایک دینی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں مولانا نے اپنا وقیع (مطبوعہ) خطبۂ صدارت پیش کیا۔

نومبر ۱۹۹۳ء میں لکھنؤ میں ایک کل ہند دینی تعلیمی کنونشن کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں

ریاستی حکومت کی سرکاری نصابوں کا قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا، مولانا نے اپنے خطاب میں نصابِ تعلیم میں زہر آلود مضامین کی شمولیت کے خطرات اور دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت اور علماء ومفکرین کی ذمہ داریوں پر مشتمل بڑی قیمتی باتیں فرمائیں، جن کا اچھا اثر محسوس کیا گیا۔

۱۶؍دسمبر ۱۹۹۳ء کو دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے زیر اہتمام ایک دینی تعلیمی کانفرنس میں حضرت مولانا تشریف لائے اور مدرسہ کے وسیع احاطہ میں ہزاروں افراد کے مجمع میں ''ایمان جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے'' کے عنوان پر بڑا پر مغز اور جامع خطاب فرمایا (بستی کی دینی تعلیمی کانفرنسوں منعقدہ ۱۹۸۳ء و ۱۹۹۳ء میں مولانا کے خطبات ''دین وعلم کی خدمت اور ایمانی تقاضے کی اہمیت'' کے عنوان سے مولانا محمد اسعد قاسمی کی ترتیب کے ساتھ مرکز دعوت وارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی سے طبع ہو چکے ہیں)

۲۸؍اپریل ۱۹۹۴ء کو کونسل کا سالانہ اجلاس نجیب آباد میں منعقد ہوا، مولانا نے اپنا مطبوعہ خطبۂ صدارت ''ملی عزیمت اور اجتماعی فیصلہ'' کے عنوان سے پیش کیا۔

۱۹۹۷ء میں جب حکومت اتر پردیش کی طرف سے صوبہ کو ہندو دیومالا اور تعلیمی وثقافتی حیثیت سے ایک برہمن ہندو تہذیب بنا دینے کے تعلیمی وثقافتی سطح پر اقدامات وانتظامات کھل کر سامنے آئے، جس کی علامتوں میں وندے ماترم جیسے مشرکانہ گیت اور صنمی ترانہ کا اسکولوں میں واجبی طور پر پڑھانا اور ہندوستان کی تصویر پر پھول چڑھانا اور ادب سے سر جھکانا داخل تھا، اس نازک صورتِ حال کے خلاف احتجاج کے لئے ۸؍فروری ۱۹۹۸ء کو ندوۃ العلماء میں دینی تعلیمی کونسل کا ایک اہم نمائندہ اجلاس منعقد ہوا، حضرت مولانا نے اس میں بڑی ولولہ انگیز تقریر کی اور ارکان کو بیدار ہو کر عزمِ نو کے ساتھ مثبت انداز میں اپنا کام انجام دینے کی دعوت دی۔

اسی سلسلہ میں ۲۶/اپریل ۱۹۹۸ء کو دینی تعلیمی کونسل کا ایک اہم اجلاس علی گڈھ میں بھی منعقد ہوا، جس میں مولانا نے اپنے بصیرت افروز خطاب کے آخر میں فرمایا کہ:

''جو قوم خود فیصلہ نہیں کرسکتی، دنیا کی ساری تدبیریں، حکمت وسائنس؛ بلکہ طاقتور اور سلطنتیں بھی اس قوم کی مدد نہیں کرسکتیں، جن قوموں نے اپنے ضمیر کے ساتھ، اپنے عقیدے اور اپنے ایمان کے ساتھ، ان اصولوں کے ساتھ جو ان کو جان سے زیادہ عزیز تھے، باقی رہنے کا فیصلہ نہیں کیا، ان کا نام حرفِ غلط کی طرح لوحِ جہاں سے مٹادیا گیا، دنیا جس کو تاریخ کہتی ہے، یہ سلطنتوں کی تاریخ نہیں ہے، تہذیبوں کی تاریخ نہیں ہے، علم ودانش کی ترقی وفروغ کی تاریخ نہیں ہے، ذہانتوں کی تاریخ نہیں ہے، ایک جملہ میں یہ انسانی فیصلوں کی تاریخ ہے، فیصلوں نے سلطنتیں قائم کی ہیں اور مٹادی ہیں، فیصلوں نے تہذیبوں کو پیدا کیا ہے اور تہذیبوں کا گلا گھونٹ دیا ہے، فیصلوں نے قوم کو دنیا کے ایک سرے سے اٹھا کر دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچادیا ہے، اور عزم وفیصلہ کی غیر موجودگی نے جیتی جاگتی، دوڑتی بھاگتی، زندہ اور توانا قوم کو بے جان مجسموں کی طرح باقی رکھا اور مردوں کی طرح دفن کردیا:

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی اُن کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

(کاروانِ زندگی ۱۳۴/۷-۱۳۵)

وندے ماترم کے مسئلہ پر بہت سے اخبارات، ریڈیو، ٹی وی کے نمائندوں اور نامہ نگاروں نے ۱۹/نومبر ۱۹۹۸ء کو تین بار مولانا سے انٹرویو لیا، جس میں مولانا نے اپنے سخت

موقف کی وضاحت کی اور فرمایا کہ حکومت کی تعلیمی پالیسی ملک کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے اور اس پوری جدوجہد سے کوئی ادنیٰ فائدہ بھی ہونے والا نہیں ہے، مولانا نے کہا کہ سرسوتی وندنا اور وندے ماترم کی ہماری مخالفت صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہے، یہ خالص دینی وشرعی مسئلہ ہے اور حکومت جس طرح اسکولوں میں اسے نافذ کرنا چاہتی ہے وہ میرے نزدیک مداخلت فی الدین ہے۔ (کاروانِ زندگی ۲۰۶/۷-۲۰۷)

مولانا کا یہ انٹرویو اخبارات میں شائع اور ریڈیو ٹی وی پر نشر ہوا، ہر حلقہ سے مولانا کے موقف کی تائید ہوئی، چناں چہ ۱۳؍دسمبر ۱۹۹۸ء کو حکومت یوپی نے اپنا آرڈر کینسل کرنے کا فرمان جاری کیا اور اطمینان کی فضا پیدا ہوئی۔

دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے مولانا اپنی تقریروں اور تحریروں میں اکثر حضرت یعقوب علیہ السلام کا وہ واقعہ بیان کرتے رہے ہیں اور اپنے مخصوص ومؤثر انداز میں استدلال کرتے رہے ہیں جو قرآنِ کریم میں مذکور ہے:

ام کنتم شھداء اذ حضر یعقوب الموت، اذ قال لبنیه ما تعبدون من بعدی، قالوا نعبد الٰھک والٰه اٰباء ک ابراھیم واسماعیل واسحٰق الٰھاً واحداً ونحن له مسلمون. (البقرۃ:)

ترجمہ: پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: میرے بعد تم کس کی بندگی کروگے؟ سب نے جواب دیا: ہم اُسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحٰق نے خدا مانا ہے اور ہم اسی کے مطیع ہیں۔

مولانا نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بلیغ سوال ﴿**ما تعبدون من بعدی**﴾ کی اہمیت کا بارہا احساس دلایا، مولانا نے فرمایا:

''اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ملت کے لئے صرف ایک پوسٹر بنانا ہے اور صرف ایک جملہ کی گنجائش ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو میں کہوں گا کہ: ﴿ما تعبدون من بعدی﴾ لکھ دو، پوسٹر کے نیچے لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے، اپنا جائزہ لے، محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ وہ اپنے بچوں کے لئے، اپنی نسل کے لئے یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ نہیں، کہ: ﴿ما تعبدون من بعدی﴾ (میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟) میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں''؟ (ماخوذ از: دین وعلم کی خدمت اور ایمانی تقاضے کی اہمیت، مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم الاسلامیہ بستی مجموعۂ خطبات: حضرت مولانا علی میاںؒ)

دینی تعلیمی کونسل الحمدللہ آج بھی فعال ہے، مولانا کے حادثۂ ارتحال کے بعد ان کے جانشین اور ندوۃ العلماء کے ناظم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی کو صدر منتخب کیا گیا ہے، توقع ہے کہ موجودہ صدر کی رہنمائی میں کونسل اپنا سفر تیزی سے طے کرے گی اور دینی تعلیم کی شاخیں اور جڑیں تناور درختوں میں تبدیل ہوں گی۔ اِدھر چند مہینوں سے صوبہ یوپی میں بالخصوص مشرق کے بارڈر سے قریب علاقوں میں مدارس ومکاتب پر آئی، ایس آئی کے ایجنٹ کا الزام لگا کر جس طرح خوف زدہ کیا جارہا ہے اور دوسری طرف مذہبی عبادت گاہ ریگولیشن بل کو نافذ کرنے کی جو خطرناک مہم چل رہی ہے، وہ حکومت کی اسلام دشمن پالیسی کا ایک حصہ ہے، اس طرح کی ناپاک کوششیں جب بھی ہوئی ہیں، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اپنی غیرتِ ایمانی کے تقاضے پر حکومت کو للکارا اور احتجاج کیا، جو مؤثر ثابت ہوتا رہا ہے۔ موجودہ حالات میں بھی وہی طریقۂ کار اپنانے اور انہیں خطوط پر کام کرنے کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے۔

آل انڈیا پرسنل لاء بورڈ

مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلمانانِ ہند کا وہ واحد نمائندہ اجتماعی پلیٹ فارم ہے جسے

ہندوستانی مسلمانوں کے وقار کا رمز وعلامت سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد ہی سے ہندو احائیت کی سرگرمیاں جب بڑے زور وشور سے شروع ہوئیں، اس وقت حکومت کا رجحان متعدد پارٹیوں اور خود مسلمانوں کے بعض تجدد پسند اور آزاد خیال افراد کے مطالبہ کی وجہ سے ایک مشترکہ عائلی قانون (Unitorm Civil Coad) کو پورے ملک میں نافذ کرنے کی طرف ہوا، اور اسے قومی وحدت و یک رنگی کا سب سے اہم مظہر سمجھا جانے لگا، اس سلسلہ میں بعض تکلیف دہ واقعات بھی پیش آئے، حکومت کے بعض بیانات بھی اس کی تائید کررہے تھے، پھر عبدالحمید دلوائی کی قیادت میں ایک طبقہ مسلسل عائلی قانون کا مطالبہ دہرا رہا تھا، یہ مسلمانوں کے تہذیبی اور معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کی برکتوں سے محرومی کا پیش خیمہ تھا، اس خطرہ کا احساس سب سے پہلے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ کو ہوا، انہوں نے اس کے خلاف ایک ہمہ گیر اور جامع تحریک چلانے کا فیصلہ کیا، جس کی تائید مسلم مجلس مشاورت اور ہندوستان کے تینوں مرکزی اداروں (دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے ذمہ داران وعلماء نے پوری طرح کی۔ اور ۲۷-۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں مسلم پرسنل لاء کنونشن منعقد ہوا، یہ کنونشن اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ اس میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال اور مذہبی گروہوں کے نمائندے خطرات اور اندیشوں کے احساس کے ساتھ مستقبل کا لائحۂ عمل طے کرنے کے لئے ایک اسٹیج پر موجود تھے، حضرت مولانا علی میاں ندوی رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس کے سلسلہ میں حجاز کے دورہ پر تھے، اور حج کے بعد واپسی کا پروگرام تھا؛ لیکن مولانا نے اس مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے فوراً واپسی اور کنونشن میں شرکت کا پروگرام بنایا، کنونشن بے حد کامیاب اور مؤثر رہا، اس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورد کا قیام عمل میں آیا، جس کی صدارت کے لئے باتفاق رائے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد

طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (جن کو اللہ نے ایک دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی) کو اور جنرل سکریٹری کے عہدہ کے لئے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب (جو اپنی جرأت وحمیت اور جوشِ عمل کے لحاظ سے طبقہ علماء میں ممتاز تھے) کو منتخب کیا گیا۔ یہ اس مبارک اور مؤثر مہم کا آغاز تھا جو اب تک جاری ہے۔

حضرت مولانا اس کے بانی اراکین میں تھے، اس کے بعد مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم سے متعدد اجلاس منعقد ہوئے، انفرادی طور پر بھی بورڈ نے اپنی سرگرمیوں میں تیزی اور حرکت پیدا کی۔ ۱۹۷۷ء میں رانچی میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، تو بعض حلقوں کی طرف سے قیادت کی تبدیلی کا مسئلہ اٹھایا گیا اور حضرت مولانا کا نام صدارت کے لئے پیش کیا گیا، حضرت مولانا نے اس نازک موقع پر اپنے بصیرت افروز خطاب میں صاف صاف فرمایا کہ جب کشتی طوفان میں گھر جاتی ہے تو ملاح بدلے نہیں جاتے، اس کا سب سے بڑا محرک یہ تھا کہ حضرت مولانا کے بقول حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسا باوقار اور ہر دل عزیز صدر بورڈ کو ملنا مشکل تھا اور بورڈ جیسے مشترک ملی ادارہ کی قیادت کے لئے وہی موزوں تھے۔

۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء کو حضرت قاری صاحب کے انتقال کے بعد صدارت کی جگہ خالی ہوئی، ۲۷-۲۸/دسمبر ۱۹۸۳ء کو بورڈ کا سالانہ اجلاس مدراس میں طے پایا، جس میں مولانا اپنے امراض کی وجہ سے چاہتے ہوئے بھی شریک نہ ہوسکے، اس اجلاس میں مولانا کو باتفاق رائے بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا، مولانا کی صدارت کے زمانہ میں بہت سے ایسے سنگین مرحلے بھی ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں پیش آئے جن کی نظیر نہیں ملتی، اور ہر موقع پر مولانا کی بصیرت وغیرت کے نمونے دیکھنے میں آئے۔

۶-۷/اپریل ۱۹۸۵ء میں بورڈ کا عظیم اجلاس کلکتہ میں ہوا، جس میں محتاط اندازہ کے

مطابق ۵؍لاکھ افراد نے شرکت کی، مولانا نے اپنا فکر انگیز خطبہ صدارت ''مسلم پرسنل لاء کی صحیح نوعیت واہمیت'' کے عنوان سے پیش کیا، جس میں مسئلہ کے تمام اصول اور اساسی پہلوؤں کے ساتھ مسلم پرسنل لاء کے متعلق غلط فہمیوں کی حقیقت بھی تفصیل سے آ گئی ہے۔ اجلاسِ عام میں مولانا نے خالص مسلمانوں کو خطاب کر کے بڑا بے لاگ طریقہ پر ان کا احتساب بھی کیا اور قانونِ اسلامی پر عمل کے سلسلہ میں ان کو کوتاہیاں یاد دلائیں، اس اجلاس کے کچھ ہی دنوں بعد ۲۳؍اپریل ۱۹۸۵ء کو سپرم کورٹ نے نفقۂ مطلقہ کے سلسلہ میں ایسا فیصلہ دیا جس میں قرآنی آیات کی من مانی تفسیر، دین میں کھلی مداخلت اور شریعت اسلامی کی توہین نمایاں تھی، یہ فیصلہ شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں دیا گیا تھا، یہ بڑا ہنگامہ پرور مسئلہ تھا، اس سلسلہ میں بورڈ کی طرف سے وزیر اعظم کے نام بڑی تعداد میں احتجاجی خطوط لکھے گئے، مساجد ومدارس اور جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہوئے، اور ملک کے ہر گوشہ سے اس کی مخالفت کی جو آواز اتحاد کے ساتھ اٹھائی گئی اور اس مسئلہ کا جیسا اثر لیا گیا، وہ بے مثال تھا، تحفظِ شریعت کی مہم اس موقع پر چلائی گئی۔ ۹؍فروری ۱۹۸۶ء کو رائے بریلی میں تحفظ شریعت کانفرنس ہوئی، جس میں لاکھوں کا مجمع تھا، مولانا نے بڑا مؤثر خطاب فرمایا۔

نومبر ۱۹۸۶ء میں بورڈ کے ایک وفد نے جنوبی ہند کا دورہ کیا، حضرت مولانا اس میں شریک رہے، ہر جگہ مسلمانوں نے یہ بات کہی کہ: ''شریعت کی حفاظت کے لئے جان ومال حاضر ہے''، اس دورہ میں متعدد جلسے اور کانفرنسیں ہوئیں، اس کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بورڈ کے وفود نے کامیاب دورے کئے، خواتین کے مستقل اجلاس بھی ہوئے۔

دوسری طرف انگریزی وہندی پریس نے اس مسئلہ میں بڑا معاندانہ موقف اپنایا، اور مسلمانوں کی مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا؛ لیکن پھر بھی مسلمانوں کا احتجاج بدستور رہا، اس سلسلہ میں بورڈ کے مؤقر وفود نے اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی سے کئی بار ملاقاتیں

کیں۔۲؍فروری ۱۹۸۶ء کو وزیر اعظم نے خود مولانا کو ملاقات کی دعوت دی، مولانا تشریف لے گئے اور پوری صفائی سے مسئلہ کی نزاکت اور اپنا موقف واضح کیا۔۱۷؍فروری ۱۹۸۶ء کو دوبارہ ملاقات ہوئی، مولانا نے بڑی مؤثر گفتگو کی اور سارے اعتراضات رفع کئے، بڑی تگ ودو کے بعد سپرم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف ایک بل پارلیمنٹ میں منظور ہوا، راجیو گاندھی نے اس بل کی حمایت میں کئی بیانات دئے، اس دوران بڑے نازک مراحل بھی آئے، مگر بات بن گئی اور لاج رہ گئی، مسلمانوں میں اس بل کی منظوری پر خوشی بھی منائی گئی، مولانا نے راجیو گاندھی کے نام ایک مکتوب میں اس سلسلہ میں ان کی محنتوں کی تعریف وشکریہ بھی ادا کیا، نفقۂ مطلقہ کے اس مسئلہ میں کامیابی کے بعد بھی ''یونیفارم سول کوڈ'' کی تلوار مسلمانوں کے سروں پر لٹک رہی تھی، اس کے خلاف بورڈ کی سرگرمیاں مولانا کی قیادت میں جاری رہیں۔دسمبر ۱۹۸۶ء میں بورڈ کا آٹھواں اجلاس عام ممبئی میں ہوا، مولانا نے اپنے خطبہ صدارت میں ''یونیفارم سول کوڈ'' کے خطرات کا تذکرہ کرتے ہوئے ملت کو ایک نئی اور طویل جدوجہد اور جمہوری ودستوری جنگ کے لئے آمادہ کیا اور اسے جہاد اکبر قرار دیا۔

دوسرا ہنگامہ پرور مسئلہ بابری مسجد کا تھا، ۱۹۸۶ء ہی میں ضلع جج فیض آباد نے بابری مسجد پر عدالتی حکم سے لگا تالا کھول کر اندر مجرمانہ طریقہ پر رکھی گئی مورتیوں کی پوجا کی اجازت دے دی، اس فیصلہ سے مسلمانوں میں بڑا اشتعال پیدا ہوا، حضرت مولانا نے بورڈ کے ذمہ داروں کے ساتھ مل کر وزیر اعظم سے اس مسئلہ پر گفتگو کی۔فروری ۱۹۸۶ء میں بورڈ کی عاملہ کا اجلاس منعقدہ دہلی میں یہ طے ہوا کہ مجلس مشاورت نے بابری مسجد کے مسئلہ کو لے کر اقدامات کا آغاز کر دیا ہے، اس لئے بورڈ ابھی اس مسئلہ کو ہاتھ میں نہ لے، یہ تجویز منظور ہوئی اور ۱۹۹۰ء تک بورڈ نے اسی پر عمل جاری رکھا، اس دوران ذاتی سطح پر مولانا نے خطوط،

تحریروں اور ملاقاتوں کے ذریعہ بابری مسجد کے مسئلہ کو سلجھانے کی جس طرح کوشش کی، ہندوؤں کے مذہبی رہنما شنکراچاریہ سے بھی بارہا ملے اور مسئلے کے حل کی خواہش ظاہر کی، اس کی تفصیلات کاروانِ زندگی میں موجود ہے۔

مئی ۱۹۸۷ء میں میرٹھ وملیانہ اور اس کے بعد ۱۹۸۹ء کے بھاگلپور کے لرزہ خیز ہولناک فسادات میں جو وحشیانہ اور انسانیت سوز واقعات پیش آئے، مولانا نے ان کے خلاف آواز اٹھائی، مارچ ۱۹۸۹ء میں کانپور میں بورڈ کا سالانہ اجلاس ہوا، مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسائل کی نزاکت اور ذمہ داریوں کا احساس جس طرح دلایا وہ بہت مؤثر ثابت ہوا۔

اس کے بعد ۳؍دسمبر ۱۹۹۰ء کو بورڈ کی عاملہ کا ایک اہم اجلاس دہلی میں بلایا گیا جس میں فسادات اور بابری مسجد کا مسئلہ اہم موضوع رہا، مولانا اس میں شریک نہ ہوسکے، ملک کے حالات خراب ہوتے گئے۔ علی گڈھ میں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات پیش آئے، بورڈ نے ان تمام موقعوں پر بڑے ہوش وحکمت کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں انجام دیں، بابری مسجد کے سلسلہ میں بھی مشاورت کی خاطر خواہ کامیابی وسرگرمی نہ ہونے کی وجہ سے بورڈ نے یہ مسئلہ اپنے ہاتھ میں لیا اور کوشش شروع ہوئی۔

مارچ ۱۹۹۱ء میں جنرل سکریٹری مولانا منت اللہ رحمانی کے انتقال سے بورڈ کو بڑا صدمہ پہنچا، ان کی جگہ پر مولانا نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری بنائے گئے۔

نومبر ۱۹۹۱ء میں بورڈ کا دسواں اجلاس عام دہلی میں ہوا، جس میں مولانا نے اپنا مفصل خطبہ صدارت پڑھا، اور عائلی قانون کی وحدت کے مسئلہ پر تنقید وجرح کی۔

رام جنم بھومی اور بابری مسجد کا مسئلہ شدت اختیار کرتا جارہا تھا، حضرت مولانا نے بورڈ کی طرف سے اپنے بیانات اور انٹرویوز میں بالکل واضح کردیا کہ مسجد نہ منہدم کی جاسکتی ہے،

نہ منتقل کی جاسکتی ہے، وہ ہمیشہ مسجد رہے گی اور اپنی جگہ پر رہے گی۔

۱۱؍اگست ۱۹۹۲ء کو بورڈ کی عاملہ کا اجلاس لکھنؤ میں بلایا گیا اور بابری مسجد کے بارے میں ایک واضح اور طاقتور تجویز منظور کی گئی، اسی دوران اس وقت کے وزیراعظم نرسمہاراؤ کا ایک مکتوب بھی مولانا کے نام آیا، جس میں بابری مسجد کے مسئلہ کو حل کرنے اور گفتگو کرنے کے لئے ملاقات یا اپنی تجاویز اور طریقۂ کار کی تفصیلات ارسال کرنے کی دعوت دی، مولانا نے اس خط کا جواب دیا اور ۱۵؍اگست ۱۹۹۲ء کو ایک مؤقر وفد کے ہمراہ وزیراعظم سے ملاقات کی اور اپنا اٹل موقف بیان کیا، وزیراعظم سے دوسری ملاقات خود انہیں کے اصرار پر دوسرے دن ۱۶؍اگست ۱۹۹۲ء کو تنہا مولانا کی ہوئی، وزیراعظم مولانا کو کسی طرح مفاہمت پر آمادہ کرنا چاہتے تھے، مگر مولانا نے لکھا:

> ''میں نے یہ طے کرلیا (اور دل میں گویا قسم کھالی اور عہد کرلیا) کہ میری زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے گا جس کا وہ سہارا لے سکیں اور اس کو دلیل بنائیں اور مسلمانوں کی رائے عامہ اور بورڈ کے اس فیصلہ سے کہ مسجد کسی حال میں منتقل نہیں ہوسکتی، ان کو گریز کا موقع یا دلیل مل جائے کہ صدر بورڈ نے ایک نجی ملاقات میں یہ بات کہی تھی، جن سے مسئلہ کا دوسرا حل نکالا جاسکتا ہے۔ راقم اللہ کا نام لے کر اور لکھنؤ کے سفر کے لئے تیار ہوکر ان کی قیام گاہ پر پہنچا اور نہایت محتاط اور مختصر گفتگو کی، جس سے غالباً ان کو مایوسی ہوئی اور مسئلہ جوں کا توں اپنی جگہ پر رہا''۔ (کاروانِ زندگی ۱۰۸/۵)

اس ملاقات پر بعض معاندین نے یہ افواہ بھی پھیلائی کہ مولانا نے بابری مسجد کے انہدام کی اجازت دے دی ہے، مولانا نے اس کی تردید کی اور سخت تکلیف وصدمہ محسوس کیا۔ بابری مسجد کے قضیہ کو سلجھانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود حکومت کی بدنیتی باقی رہی، اور ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کا الم ناک سانحہ پیش آہی گیا اور پھر فسادات کا وہ طوفان شروع ہوا کہ الامان والحفیظ۔

اس کے بعد بورڈ کی عاملہ کا ایک اجلاس جنوری ۱۹۹۳ء میں دہلی میں منعقد ہوا، جس میں بابری مسجد کے سلسلہ میں لائحۂ عمل طے کیا گیا، وزیراعظم و دیگر وزراء واعیان سے اس سلسلہ میں بار بار گفتگو ہوئی۔ ۱۵؍مئی ۱۹۹۳ء کو لکھنؤ میں بورڈ کی ایک اور اہم میٹنگ بلائی گئی، جس میں بعض ارکانِ بورڈ پر مشتمل ایک کمیٹی برائے بازیابی بابری مسجد کی تشکیل عمل میں آئی، اسی اجلاس میں اصلاحِ معاشرہ کی مہم کو تیز تر کرنے کی بھی تجویز پاس ہوئی، جس کا ایک اجتماع مارچ ۱۹۹۳ء میں پٹنہ میں بڑا مؤثر ثابت ہوا تھا۔

اکتوبر ۱۹۹۳ء میں بورڈ کا ایک اہم اجلاس جے پور میں منعقد ہوا، اس وقت تک بورڈ کی نگرانی میں بالغ نظر علماء کی ایک کمیٹی نے اسلام کے عائلی قوانین کی دفعہ اور تدوین کا کام بھی مکمل کرلیا تھا، اس کی طباعت کی تجویز پاس ہوئی، افسوس یہ ہے کہ ابھی تک یہ مجموعہ طبع نہ ہوسکا ہے) ۶؍دسمبر ۱۹۹۳ء کو بابری مسجد کی شہادت کے ایک سال کے بعد مسجد کے مسئلہ پر وزیراعظم نرسمہاراؤ سے آخری ملاقات مولانا نے کی اور ایک مراسلہ بورڈ کی طرف سے پیش کیا، جس میں بڑی وضاحت سے دوٹوک انداز میں تحریر تھا کہ:

> ''یہ بات اور بھی تکلیف دہ ہے کہ معروف یا غیر معروف کسی بھی شر پسند کو غارت گرانہ جرم کی سزا نہیں دی گئی اور حکومت نے صرف چارج شیٹ داخل کرنے کے لئے ایک سال کا وقت ضائع کیا، انکوائری کمیشن نے تا حال کوئی پیش رفت نہیں کی، ان حالات میں بورڈ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ آپ پر یہ واضح کیا جائے کہ سیکولر قوتوں اور خاص کر مسلمانوں کا اعتماد آپ پر سے اٹھ چکا ہے، بورڈ کو اس بات پر اعتماد نہیں رہا کہ جو زخم آپ نے اپنی بے عملی یا عمل سے لگائے ہیں، ان کے اندمال کی کوشش کریں گے، اور بابری مسجد کی دوبارہ تعمیر کا جو وعدہ ہندوستانی عوام سے ساری دنیا کو گواہ بنا کر کیا تھا، اس کو پورا کریں گے، ہم ریکارڈ کے لئے اپنے اس مطالبہ کو دہرائیں گے کہ بابری مسجد کی جلد از جلد دوبارہ تعمیر کی جائے، یا یہ جگہ مسلمانوں کو واپس کی جائے، اگر آپ نے کوئی فوری قدم نہیں اٹھایا تو آپ کے اغماض، بے حسی اور بے عملی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس مسئلہ پر اب کوئی مزید ربط آپ سے نہ رکھا جائے گا اور نہ کوئی گفتگو کی جائے گی''۔ (ماہنامہ ''افکارِ ملی'' دہلی ص:۵۲، مئی ۲۰۰۰ء)

بورڈ کے زیر انتظام اصلاحِ معاشرہ کی پہلی کانفرنس ۳۰؍جولائی ۱۹۹۴ء کو ندوۃ العلماء میں ہوئی، مولانا نے اس میں ایک طاقتور اور ایمان افروز خطاب کیا، جس کا عنوان ''کل مسلمان اور مکمل اسلام'' تھا، اس میں سو فیصدی مسلمانوں کو سو فیصدی اسلام پر عمل کرنے اور زندگی میں احکام شریعت کی تنفیذ پر زور دیا گیا، اصلاحِ معاشرہ کے سلسلہ کی دوسری کانفرنس نومبر ۱۹۹۴ء میں میرٹھ میں ہوئی، اس میں بھی مولانا کا بڑا مؤثر خطاب ہوا، اس سلسلہ میں تیسری کانفرنس مشرقی یوپی کی نمایاں درسگاہ دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں ۳۱؍مارچ ۱۹۹۵ء کو منعقد ہوئی، جس میں علماء اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ شریک ہوا، حضرت مولانا نے بڑا فکر انگیز خطاب کیا اور نکاح وطلاق کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ناجائز رسوم اور سماجی برائیوں کو ختم کرنے کی دعوت دی، اس کے بعد مختلف جگہوں پر اصلاحِ معاشرہ کے جلسے ہوئے۔

اسی دوران سپریم کورٹ کی طرف سے یکساں سول کوڈ کی تنفیذ کا مطالبہ بھی سامنے آیا، اس موقع پر مولانا نے بڑے طاقتور اور صریح بیانات دئے، ۱۸؍جون ۱۹۹۵ء کو دہلی میں بورڈ کا ایک مشاورتی اجتماع بلایا گیا اور حکومت سے پرزور اپیل کی گئی کہ یکساں سول کوڈ کی تدوین وتنفیذ کے ارادے بڑے خطرناک ہیں، جنہیں حکومت کو عملی شکل دینے سے گریز کرنا چاہئے، اس اجلاس میں ائمہ مساجد کے وقف بورڈ سے تنخواہیں لینے کا مسئلہ بھی آیا، یہ تحریک جمیل الیاسی صاحب کی طرف سے بڑے زور وشور سے چل رہی تھی، مولانا نے اس کی مخالفت کی اور اسے اسلامی غیرت واستغناء کے خلاف بتایا۔

اکتوبر ۱۹۹۵ء میں بورڈ کا بارہواں عظیم اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا، اس اجلاس کو مؤثر اور کامیاب بنانے کے لئے پورے زور وشور سے کئی ہفتے پہلے سے سرگرمیاں جاری تھیں، اس اجلاس میں مولانا کا بے مثال خیر مقدم کیا گیا، کانفرنس میں ڈھائی لاکھ سے زائد

افراد کا مجمع تھا، مولانا نے مسلمانوں کو اسلام پر مکمل عمل اور توحید واسوۂ نبوی پر استقامت کا پیغام بڑے مؤثر انداز میں دیا۔

جنوری ۱۹۹۶ء میں بورڈ کی عاملہ کا ایک اجلاس لکھنؤ میں ہوا، اس سے قبل اصلاحِ معاشرہ ہفتہ کی تقریب اور جلسے پورے صوبہ میں پورے زور وشور سے کئے گئے تھے، اس اجلاس میں مولانا نے مرکزی قانونی جائزہ کمیٹی کی تشکیل نو اور صوبائی کمیٹیوں کی تشکیل کی بات رکھی، اور انہیں ایسے قوانین اور فیصلوں پر نظر رکھنے کا پابند کیا جن سے مسلم پرسنل لاء میں مداخلت ہورہی ہو۔

۷/جولائی ۱۹۹۶ء کو بھی بورڈ کی عاملہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، جس میں بابری مسجد کے مسئلہ پر تفصیلی مباحثے ہوئے اور سپریم کورٹ کے ذریعہ تصفیہ کی تجویز کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا۔

۲۵/اپریل ۱۹۹۸ء کو بورد کا ایک اہم اجلاس دہلی میں ہی بلایا گیا، جس میں موجودہ حالات کے تناظر میں مسلم پرسنل لاء کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے طریقۂ عمل پر غور وخوض ہوا، مولانا نے اصلاحِ معاشرہ کی تحریک کو ملک گیر سطح پر چلانے اور مختلف مقامات پر دینی اجتماعات کے انعقاد پر زور دیا اور یہ واضح کیا کہ شریعت کے خلاف کوئی قانون قابل قبول اور لائق عمل نہیں ہے۔

اکتوبر ۱۰۹۹ء میں بورڈ کے ایک سالانہ اہم اجلاس میں ممبئی میں مولانا اپنی بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے اور صدارت سے معذرت کا پیغام بھیجا، مگر اسے قبول نہ کیا گیا اور مولانا تاحیات صدر رہے۔

مولانا کی قیادت میں بورڈ نے جو سفر طے کیا ہے، اس کی یہ مختصری داستان ہے، جس میں بہت سی تفصیلات نہیں آسکی ہیں۔

دینی تعلیم کونسل، پیامِ انسانیت اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم سے مولانا نے جو خطبات دئے ہیں، ان کا مجموعہ یکجا کرکے اگر شائع کردیا جائے تو وہ بہت قیمتی اور دستاویزی چیز ثابت ہوگا۔

بورڈ کے جلسوں میں مولانا کے خطبات کے اس اقتباس سے ان کی غیرت وحمیت کا اندازہ کیجئے۔ مولانا نے فرمایا:

''ایک جمہوری ملک میں جو اکثریت کے ذریعہ (جس کے جذبات، خواہشات ومقاصد بدلتے رہتے ہیں) آئین سازی کا دائمی وکلی حق رکھتا ہے، کسی فرقہ واقلیت کو (جو اپنا مستقل دین، عائلی قانون اور ملی تشخص رکھتی ہے، اور وہ اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے) کسی وقت بھی مطمئن ہوکر بیٹھنے اور حالات وواقعات سے آنکھیں بند کرلینے کی کوئی گنجائش نہیں، ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظامِ تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہئے اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے''۔ (ماہنامہ ''افکارِ ملی'' دہلی ص:۳۳، مارچ ۲۰۰۰ء)

بورڈ کے زیرانتظام اصلاحِ معاشرہ اور دارالقضاء کے قیام کی مہم کو بہت تیز رفتاری سے نہیں چل سکی، تاہم اس سمت میں بہت کچھ کام ہوا ہے، جس کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا کے انتقال کے بعد بورڈ کی صدارت کا مسئلہ بڑا حساس تھا، مگر بحمداللہ اتفاقِ رائے سے مشہور بالغ نظر عالم وفقیہ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب ہوا، ان کی قیادت میں بورڈ نے اپنی سرگرمیاں بڑے جوش وہوش سے شروع کی ہیں، خدا کرے کہ بورڈ سدا اپنے مقاصد میں کامیاب اور سرخرو ہوتا رہے، آمین۔

ہندوستان کے علاوہ پاکستان وبنگلہ دیش سے بھی مولانا کا بڑا گہرا ربط تھا، مولانا نے وہاں کے بڑے دورے کئے اور ہر جگہ دعوت واصلاح کا پیغام پہنچایا، پاکستان میں نفاذِ

شریعت کی ہر کوشش کے وہ مؤید رہے اور جنرل ضیاء الحق کو خطوط میں اور ملاقاتوں میں کئی بار اس سلسلہ میں ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے موقع پر جب لسانی وتہذیبی تعصب کا طوفان ابھر کر سامنے آیا تو مولانا نے اس کے ردعمل میں ۲۳ رمئی ۱۹۷۲ء کو کلکتہ کے ایک اجلاس میں بڑا مؤثر خطاب فرمایا، جو ''لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق'' کے عنوان سے کئی زبانوں میں طبع ہوا۔

مولانا نے اپنے خطبات میں اس المیہ کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا:

''ان واقعات کا سب سے زیادہ شرم ناک پہلو یہ ہے کہ اس سے مخالفین کو اصلام کی ناکامی کے ثبوت کے لئے ایک دلیل ہاتھ آئی اور انہوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام میں رابطہ بننے اور مختلف قوموں اور نسلوں کو (جن کی زبانیں اور رنگ ونسل مختلف ہیں) متحد کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، نیز یہ کہ اسلامی عقیدہ پر کسی معاشرہ اور کسی ریاست (State) کے قائم ہونے اور اگر قائم ہو جائے تو باقی رہنے کا امکان نہیں، یہ وہ معنوی خسارہ ہے جس کا کوئی خسارہ مقابلہ نہیں کرسکتا، اس سے اسلام کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ تجارت میں اصل چیز ساکھ اور اعتبار ہے، میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ اس قوم میں صحیح دینی شعور کی کمی تھی، قلب کے ساتھ دماغ کا مؤمن ہونا بھی ضروری ہے، تنہا اسلام کی محبت کافی نہیں، اس کے ساتھ خلافِ اسلام فلسفوں اور دعوتوں کی نفرت بھی لازمی ہے؛ بلکہ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر طاغوت اور شیطان اور جاہلیت کے داعیوں سے بغاوت اور بیزاری کا ایمان باللہ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللّٰہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا.

ترجمہ: اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

(لسانی تہذیب کا المیہ اور اس سے سبق ۱۵-۷ مختصرا)

افغانستان کے مسئلہ سے بھی مولانا کا بڑا تعلق تھا، نومبر ۱۹۸۲ء میں مولانا نا ''افغان مجاہدین کو سلام'' کے عنوان سے اُن کو ایک تائیدی و تہنیتی پیغام لکھا اور انہیں کمیونسٹ حملوں اور روس جیسی دنیا کی دوسری عظیم طاقت کے مقابلہ میں ثبات و استقلال پر مبارک باد دی اور لکھا کہ:

''افغانستان تنہا وہ ملک ہے جہاں غیر ملکی فوجوں اور سیاسی قزاقوں کے خلاف فوجی اعتبار سے ناسازگار اور سخت حالات کے باوجود اتنی لمبی مدت تک جنگ جاری رہی جس کی دوسرے اسلامی ملکوں میں مثال نہیں ملتی، اس کا راز ان کی قومی غیرت، دینی حمیت، سخت کوشی اور سپاہیانہ زندگی میں پوشیدہ ہے۔ بقول اقبال:

قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں''

(کاروانِ زندگی ۲/۳۶۷-۳۶۸ مختصراً)

یہ بیان کئی زبانوں میں طبع ہوا، اس سے مولانا کے دینی جذبات و احساسات اور اخلاقی و اصولی تائید و حمایت کا جو ہر سامنے آتا ہے۔

نصف صدی سے زائد عرصہ میں مسلمانوں کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے، جس پر مولانا نے توجہ نہ فرمائی ہو، آپ نے تمام مسائل کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا، اس کا حل اور علاج کتاب وسنت کی روشنی میں اخذ کیا اور پیش کیا، اور سیرتِ نبوی اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں شروع سے آخر تک آپ کے فکر و عمل کے ہم سایہ رہے اور انہیں آپ نے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔

ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ کتاب وسنت پر اس درجہ اعتماد ہی کا نتیجہ تھا کہ ان تمام مسائل میں مولانا کا موقف کبھی جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہوا، اسی کا ذکر اُس حدیث میں

ملتا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللّٰہ وسنۃ رسولہ.

ترجمہ: میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک تم انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے، ہرگز راہِ حق سے برگشتہ و منحرف نہیں ہو سکتے۔ ایک تو اللہ کی کتاب ہے دوسری اس کے پیغمبر کی سنت۔

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر پرانے چراغ کے تینوں حصوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

❐❖❐

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی نظر میں

عالم عربی اور عالم اسلامی کے مسائل ومشاکل

(خطرات، اثرات، تجاویز اور موقف)

عرب قومیت، ذہنی وفکری ارتداد، اشتراکیت اور استشراق

''میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں، نہ میری معلومات سکنڈ ہینڈ ہیں، اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ، ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے، اور نہ میں اچانک اور بے وقت اس میدان میں آ گیا ہوں، میں اپنے کو (ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی) اس وسیع وعظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے، ایک فرد سمجھتا ہوں، میں اُن کے دُکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت اُن کی قسمت سے وابستہ ہے، اُن کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میرے تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن، عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت اور سربلندی کے لئے قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی طٰہٰ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی؛ لیکن میں نے اُردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا، اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ:

مرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زنمہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں کہ نوا مری عربی رہی

(میر کارواں، از: مولانا عبداللہ عباس ندوی ۳۵۲-۳۵۳)

یہ اس مضمون کا ایک مؤثر ترین اقتباس ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

رحمہ اللہ نے اس وقت تحریر فرمایا تھا جب جمال عبدالناصر کی حکمت نے مصر میں اسلام سے عملی ارتداد اور نبوتِ محمدی سے بغاوت کے یورپی منصوبوں پر عمل کرنا اور ہر اسلامی تحریک وطاقت کو کچلنا شروع کر دیا تھا، مولانا کی غیرتِ ایمانی اس وقت بیدار اور مشتعل ہوئی تھی اور اپنی تقریروں اور تحریروں سے یہ صدا بڑے شد و مد اور پورے زور وشور سے لگائی کہ یہ ارتداد ایک سنگین خطرہ ہے، اسے ختم ہونا چاہئے، اس موقع پر مولانا نے عالم عربی کو خصوصاً متوجہ کیا، جہاں یہ فتنہ اپنے برگ وبار لا رہا تھا، اور اس کا زہر سرایت کرتا جا رہا تھا، اس وقت بعض کج فہم، عالم عرب سے ناواقف اور حاسد مزاج افراد اور حلقوں نے مولانا کے اس موقف ودعوت پر اعتراض اور نفرت وناپسندیدگی کا اظہار کیا اور یہ آواز اٹھائی کہ یہ دوسرے ملک کا معاملہ ہے، اس میں اس درجہ مؤثر اور دخیل ہونے کی کیا ضرورت ہے، مولانا نے اس موقع پر یہ مضمون لکھ کر ذہن صاف کئے کہ یہ مسئلہ محض کسی ملک کا نہیں؛ بلکہ دین کے بقاء کا ہے۔ مولانا کی پوری زندگی مسلمانوں کے مسائل ومشاکل کے خاتمہ، اصلاح ودعوت کی کوشش میں صرف ہوئی ہے، جس کی کچھ تفصیل ''دعوتِ اسلامی'' کے مضمون میں گذر چکی ہے۔

عربوں کی بے اعتدالیاں خصوصاً مولانا کے لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوتی رہیں؛ لیکن مولانا عربوں کی اس غفلت، عیش پرستی، لذت کوشی، کبر ونخوت اور خیانت سے کبھی مایوس نہیں ہوئے اور ان کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتے رہے، مولانا کی یہ توقعات بڑی حد تک پوری ہوئیں، عربوں کے مسائل ومشاکل مولانا کی فکر بلند سے ہمیشہ مربوط رہے ہیں، اپنے اسلامی نقطۂ نگاہ اور اندازِ فکر سے مولانا ان کا جائزہ لیتے رہے اور بے پناہ مؤثر افکار، آراء اور تجاویز عربوں کے سامنے رکھیں، جن میں انہیں معرفت خودی، اپنی حقیقت سے آشنائی، کردار کی بحالی، قیادت، اسلام کی طرف رجوع، بے اعتدالیوں سے مکمل اجتناب اور انسانیت کو اس خسارۂ عظیم سے بچانے کی دعوت دی، جو مسلمانوں کی زبوں حالی اور ادبار کا نتیجہ تھا، یہ

انحطاط فی الواقع عربوں کی قائدانہ صلاحیتوں اور کردار سے محرومی اوران کے عیش وآرام اور خاندانی، قومی، قبائلی اور طبقاتی تفاوت اور کشمکش ہی میں لگ جانے کی وجہ سے پوری امت کو درپیش تھا، مولانا کو عربوں کی حقیقت اور مقام کا اندازہ تھا، اسی لئے مولانا نے حالات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے کر عربوں کو اس خلا کے پر کرنے کی دعوت بار بار دی اور کہا کہ اس وقت دنیائے انسانیت کے نقشہ میں جو خلا اور شگاف پیدا ہوگیا ہے، اسے پاٹنے اور پر کرنے کا استحقاق عربوں کو ہے، عرب ساتویں صدی میں اور اس کے بعد بھی انسانیت کی قیادت کرتے ہوئے آئے ہیں، آج بھی اگر وہ اپنا مقام ومرتبہ سمجھ لیں، اپنی قوت کے چشموں اور سوتوں سے واقف ہوجائیں، اپنے پیغام کی وسعت وعظمت اور اپنی ذمہ داریوں کی گرانباری اور اہمیت ونزاکت سے باخبر ہوجائیں تو اس صدی میں بھی وہ کاروانِ انسانیت کی رہنمائی کا کام انجام دے سکتے ہیں۔

مولانا کا تعلق ایسے خانوادے سے تھا جس کا سلسلہ عرب سے جاملتا تھا، اس وجہ سے بھی اور دینی وتہذیبی روابط کی وجہ سے بھی مولانا عرب اقوام کے مسائل سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں ان کی کوششیں بعض عربوں سے بھی کہیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ مولانا یہ یقین رکھتے تھے کہ عرب کی قومی فکر کا اسلام سے امتزاج مکمل اور جامع ہونا چاہئے، یہ امتزاج نہیں ہوگا تو عربی عناصر مردہ اور تاثیر سے محروم ہوجائیں گے، چناں چہ مولانا نے پورے اسلامی جذبات اور ہوش وخرد کے ساتھ عربوں کو اسلام کے مضبوط اور پائیدار حصار میں پناہ گزیں ہوجانے کی دعوت دی، بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مولانا عالم عرب کے اُفق پر نمودار ہوئے، وہ جہاں بھی گئے اعلانِ حق سے باز نہ آئے، ان کی بے باکی قابل فخر وتقلید رہی، ان کے محاضرات اور تالیفات میں یہ عنصر بہت نمایاں ہے، جن میں ان کی کتابیں ''إسمعوها صريحة منى أيها العرب'' (اے عربو! صاف صاف مجھ سے سن لو) ''الخطر الأكبر على العالم العربى'' (عالم عرب کا سب سے بڑا خطرہ) ''كيف

یستعید العرب مکانتھم" (عرب اپنے مقام ومنصب کو کیسے بحال کر سکتے ہیں؟)
"العرب والإسلام" (عرب اور اسلام) "کارثة العالم العربی وأسبابھا الحقیقیة" (عالم عربی کا المیہ اور اس کے اصلی اسباب) وغیرہ سرفہرست ہیں۔

حضرت مولانا نے عربوں کو یہ حقیقت یاد دلائی اور بارہا فرمایا کہ اس زمین پر میری نگاہ میں سب سے زیادہ قابل احترام واکرام قوم عرب ہیں، اور اگر مجھے کسی قسم کی لاگ لپیٹ، بیجا مراعات اور رواداری کا لحاظ رکھنا ہی ہوتا، تو میں عرب کے ساتھ یہ رویہ اپناتا؛ لیکن میں اسے اخلاقی جرم باور کرتا ہوں اور پوری ملت اسلامیہ کے حق مآں اسے ایک بڑی خیانت تصور کرتا ہوں، میرا ذہن وعقیدہ اور مذہب ومسلک مجھ سے صدق اور راستی اور حق گوئی وبیباکی کے التزام کا مطالبہ کرتا ہے، میرا ضمیر اور امت اسلامیہ عربیہ سے میرا دینی، نسبی اور تہذیبی اٹوٹ رابطہ میرے ذمہ وفاداری، دیانت وپاکیزگی اور برملا اعلانِ حق کے فرائض عائد کرتا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں اور اس میں حق بجانب بھی ہوں کہ عرب ہی پیغام اسلام کی امانت اور ذمہ داری اٹھانے اور نبھانے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، انہیں جو عزت بھی نصیب ہے وہ اسلام کا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض ہے، اسلام ہی اگر ان سے چھن جائے تو پھر ان کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچتا، اسلامی صلابت اور دینی غیرت کا مطلوبہ معیار پورا کرنے پر عرب یقیناً سب سے زیادہ مستحق قیادت ہیں، انہیں اپنا یہ منصب سنبھالنا چاہئے۔

اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وتابعین اور مجددین کی شخصیت وافکار اور طریقۂ کار کی پوری چھاپ مولانا کے یہاں ملتی ہے، مولانا کا خود یہ کہنا ہے کہ تاریخ وسیرت نگاری سے ان مقصد محض جامد تاریخ معلومات پیش کرنا نہیں ہے، نہ ہی سیرتِ رسول مرتب کرنے کا مقصد محض علمی اور تاریخی ہے، اور نہ ہی صحابہ کرام کی تاریخ صرف معلومات کے لئے انہوں نے مرتب کی ہے؛ بلکہ ان سب کے پس پردہ نہایت اہم تربیتی اور تعلیمی مقاصد وجذبات کارفرما ہیں، اور یہ کوشش ہے کہ عرب اسلام کی صحیح

قدر و قیمت پہچان کر اپنے شاندار و تابناک ماضی سے اپنے حال کو مربوط کریں اور تہذیب اسلامی کی بحالی کے ساتھ صحیح سمتِ سفر اختیار کریں۔ مولانا نے بار بار وضاحت کی ہے کہ عربوں کو یہ حقیقت ذہن نشیں کر لینی چاہئے کہ یہ صرف قرآنِ کریم اور ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا، جو وہ ماضی میں اتنا عظیم تاریخی انقلاب لانے میں کامیاب ہو سکے۔ بہت سے موقعوں پر مولانا حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس ایمان افروز تقریر کا حوالہ دیتے ہیں جو انہوں نے شاہِ حبشہ نجاشی کے دربار میں کی تھی اور جس کا ہر ہر جملہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، اس تقریر میں اسلام و جاہلیت کے فرق اور ماضی و حال کی صورتِ حال کا بڑا حقیقت پسندانہ تجزیہ ملتا ہے، مولانا ان جملوں کو بار بار دہراتے ہیں اور مقصد عربوں کو اس انقلاب کی عظمت و وسعت کا احساس و ایقان دلانا ہے جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے اور اسلام کے نتیجہ میں اُن کا نصیب ہوا۔

مغرب کے آلۂ کار بعض عرب اُدباء اور دانشور اسلام اور عرب کے مابین کسی مستحکم اور جذباتی تعلق و ربط کا انکار کرتے ہیں، وہ فی الواقع ان تبدیلیوں سے ناواقف ہیں جو اسلام کی بدولت تہذیبوں کی تاریخ میں آئی ہے اور جن سے پورے عالم کو فیض پہنچا ہے، مولانا علی میاںؒ اس منحرفانہ فکر کے خلاف شمشیر برہنہ تھے، انہوں نے بڑی گہرائی سے دیکھا اور پڑھ کر یہ یقین حاصل کر لیا تھا کہ کہ عربوں کی زندگی میں اسلام نے جو تبدیلیاں پیدا کیں اور جو اثرات ڈالے اور جو عظمت اسلام کے واسطہ سے ان کو نصیب ہوئی وہ تاریخ کی ایسی ٹھوس حقیقت ہے جسے پردوں میں ہرگز چھپایا نہیں جا سکتا۔

اپنی کتابوں اور مکاتب میں جگہ جگہ مولانا نے رسول اللہ کے عطا کردہ انعامات و انقلابات کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے اور یہ صراحت کر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ انسانیت اور حیاتِ انسانی کے لئے ایک کامل اور مکمل نمونہ تھے، آپ نے تمام مشاکل و مسائل کو حل کیا، اسلام کی صالح اقدار کو زندہ اور نمایاں کیا اور ان بلند حقائق اور

مبادی کو واضح کیا، جن سے انسان غافل ہو چلا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کارنامہ یہی ہے کہ آپ نے وہ تلوار نیام میں کرادی جو انسانوں کی گردنوں پر ہمہ وقت مسلط تھی، اور ہر وقت انسان اپنی ہلاکت وموت کے اندیشوں میں گرفتار رہا کرتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف وہراس اور کشت وخون کی یہ فضا ختم کر کے انسانوں کو ایسے تحفے اور عطیے دئے، جن سے ان میں زندگی اور حرارت آئی، نیا خون دوڑا، طاقت وقوت اور غیرت وحمیت کے اوصاف پیدا ہوئے، ان کے سامنے ایک نیا اور بلند مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک زمانہ سے انسانیت، تہذیب وثقافت، تمدن اور کلچر، علوم وفنون، اخلاص وروحانیت انسانیت کی از سر نو تعمیر وتشکیل کا نیا دور شروع ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا لازوال خزانہ عطا فرمایا ہے جس سے انسانیت اپنی صلاح وفلاح، خیر وبرکت اور تہذیبی ارتقاء وکمال کے میدانوں میں فائدہ اٹھاتی آئی ہے۔ (محمد الرسول الاعظم وصاحب الملۃ الکبریٰ علی العالم، از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مطبوعہ قاہرہ ۱۷)

مولانا اپنی مشہور کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت وافتخار کا عنوان اور اس کا سنگ بنیاد ہیں، اگر اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا کر دیا جائے، تو اپنے تمام قوت کے ذخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقش بے رنگ سے زیادہ نہ ہوگی''۔

اسلام عالم عربی کی قومیت ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے امام اور قائد ہیں، ایمان اس کی قوت کا خزانہ ہے جس کے بھروسے پر اُس نے دوسری قوموں کا مقابلہ کیا اور فتح یاب ہوا، اس کی طاقت کا راز اور اس کا کارگر ہتھیار جو کل تھا، وہی آج ہے، جس کے ساتھ وہ دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے''۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ۳۵۵-۳۵۷)

مولانا نے بڑی جامعیت اور اختصار کے ساتھ دو لفظوں میں اسلام کے عطیوں کا ذکر

کر دیا ہے: (۱) بلند اقدار (۲) اہم اساسیات ومبادی۔

یہی دونوں وہ نمایاں اور مرکزی چیزیں ہیں، جو اسلام کے واسطہ سے تاریخ اور تہذیب انسانی تک پہنچی ہیں، اور اسلاف نے اپنی فکر وکردار اور جدوجہد کے ذریعہ انہیں کی اشاعت کی ہے، جو اہم مبادی اسلام نے عطا کئے ہیں، ان کے دائرہ میں یہ چند چیزیں بے حد نمایاں ہیں: (۱) توحید کا صاف اور دوٹوک عقیدہ (۲) وحدتِ انسانی اور مساوات (۳) احترامِ انسانیت (۴) عورتوں کے حقوق ومراتب کی بحالی (۵) ناامیدی اور بدشگونی کے بجائے رجائیت اور امید واعتماد (۶) دین ودنیا کی جامعیت (۷) دین وعلم کے درمیان پاکیزہ اور ابدی روابط کا استحکام (۸) عقل کا استعمال اور تمام معاملات میں خصوصاً دینی مسائل میں عقل سے استفادہ اور دلائل النفس وآفاق میں غور کرنے کی دعوت (۹) امت اسلامیہ خصوصاً عربوں کو دنیا کی نگرانی اور قیادت اور اخلاق ورجحانات کے محاسبہ وتجزیہ کی دعوت (۱۰) عالمی تہذیبی اور اعتقادی وحدت جس میں آزادئ رائے، تبادلۂ افکار وخیالات اور تنوع کی گنجائش ایمان کے دائرہ میں رہتے ہوئے دی جائے۔ (محمد الرسول الاعظم وصاحب المنۃ الکبریٰ علی العالم، از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مطبوعہ قاہرہ ۱۹-۲۰)

مولانا نے جہاں جہاں عربوں کے مجد وشرف کا ذکر کیا ہے، اسے نبوت محمدی کا فیض قرار دیا ہے، اس طرح آپ نے انہیں یہ حقیقت یاد دلائی ہے کہ راہِ ہدایت صرف اسلام اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی ہے، عرب میں جو فکری اور علمی واعتقادی اور عملی انقلاب آیا ہے وہ نبوتِ محمدی کی پاکیزہ تعلیمات کی تابانیوں سے آیا ہے، عرب کے اسلاف نے اس کی قدر کی اور اسلامی سانچہ میں ڈھل کر قیادت کے فرائض انجام دئے ہیں، ان حقائق کی روشنی میں معاصر عربوں کو تہذیب انسانی کا علمبردار ہونے کی کوشش کرنی چاہئے، وہ قیامت تک اسی مقصد کے لئے منتخب کر لئے گئے ہیں، اس کے بغیر ان کی رفعت وسیادت کا تصور تک نہیں ہوسکتا، دوسرے طریقے اور ترکیبیں ہی وہ آزمالیں، انہیں اس وقت تک عزت

ومقام حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک اسلام ان کی عقلوں اور دلوں میں رچ بس نہ جائے اور ان کے رگ وپے اور نس نس میں سرایت نہ کر جائے۔ دوسرے عناصر نے اگر چہ معرکہ آرائیوں یا فکری وعقلی وسائل کے ذریعہ عالم پر اپنا تسلط جمالیا ہو؛ لیکن عرب تاریخ میں اپنا مقام اُسی وقت بنا سکتے ہیں جب وہ اسلام کے طریقہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر ہمہ تن اس میں مشغول ہو جائیں، ان کی محبوبیت، مقبولیت، مرجعیت، ان کی زبانِ عربی کا اس درجہ شہرہ اور پھیلاؤ، مختلف علوم کی تدوین اور خود ان کی بقاء ودوام سب کچھ بلاشبہ شریعت اسلامی ہی کا رہین منت اور فیض دامن ہے، تاریخ میں اپنا مقام بحال کرنے اور سفینۂ انسانیت کی ناخدائی کے لئے عربوں کے سامنے صرف انسانیت کے لئے رحمت وہدایت اور مخلص وبے لوث خدمت ہی کا راستہ ہے، وہ تاریخ میں اپنا مقام آج بھی اسی راستہ پر چل کر بنا سکتے ہیں، جس راستہ کو اپنا کر ان کے اسلاف نے اپنا مقام بنایا تھا۔

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

عالم عربی سے اپنی توقعات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''عالم عربی اپنی خصوصیات، محل وقوع اور اپنی سیاست اہمیت کی بنا پر اسلام کی دعوت کی ذمہ داری اٹھانے کا حق دار ہے، وہ یہ کرسکتا ہے کہ عالم اسلامی کی قیادت کا بیڑا اٹھائے اور مکمل تیاری کے بعد یورپ سے آنکھیں ملا سکے اور اپنے ایمان، دعوت کی طاقت اور خدا کی نصرت سے اُس پر غالب آجائے، اور دنیا کو شر سے خیر کی طرف، تباہی وبربادی سے امن وسلامتی کی طرف لے آئے، عالم انسانی عالم اسلامی کی طرف اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے، اور عالم اسلامی عالم عربی کی طرف اپنے لیڈر اور رہبر کی حیثیت سے نظریں اٹھائے ہوئے ہے، کیا عالم اسلامی عالم انسانی کی توقع کو پورا کرسکتا ہے اور کیا عالم عربی عالم اسلامی کے سوال کا جواب دے سکتا ہے؟ عرصہ سے مظلوم انسانیت اور برباد شدہ دنیا اقبال کے پُر درد الفاظ میں مسلمانوں سے فریاد کر رہی ہے، اس کو اب بھی یقین ہے کہ جن

مخلص ہاتھوں نے کعبہ کی تعمیر کی تھی، وہی دنیا کی تعمیر نو کا فرض انجام دے سکتے ہیں:

ناموسِ ازل را تو امینی امینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
صہبائے یقیں در کش و از دیر گماں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز''

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ۳۷۳)

اسی لئے گمراہ کن نظریات اور ذہنی وفکری ارتداد کی جو بدتر صورتِ حال عرب ممالک میں تیزی سے پیدا ہورہی تھی، مولانا نے اُن کا کھل کر مقابلہ کیا، استشراق بھی ایک طوفان تھا، جس کے مسموم اثرات عالم عربی میں خصوصاً اور پوری دنیا میں عموماً پھیلتے جارہے تھے، مولانا نے اپنے خطبات وتصنیفات میں جگہ جگہ اس فتنہ کا مقابلہ کیا ہے، دارالمصنفین اعظم گڈھ (جس کے مولانا سرپرست بھی تھے) کے زیر اہتمام فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے ایک دوروزہ عظیم سیمینار منعقد ہوا، جس میں عالم عرب کے کچھ ممتاز اصحاب علم بھی شریک ہوئے، اس موقع پر مولانا نے ''الاسلام والمستشرقون'' (اسلامیات اور مغربی مستشرقین) کے عنوان سے ایک وقیع مفصل مقالہ پیش فرمایا، جس میں بڑے تحقیقی انداز میں مسئلہ کو ذکر کیا گیا تھا، پھر ندوۃ العلمای ء کے آرگن ''البعث الاسلامی'' کا خاص شمارہ بھی اسی موضوع پر شائع ہوا، اس کے علاوہ مولانا نے جہاں جہاں استشراق کا اثر محسوس کیا، اسے ختم کرنے میں کوئی لمحہ غافل نہیں رہے، افغانستان گئے تو وہاں مستشرقین ومبشرین کے افکار اور تہذیب حاضر کی دلفریب رعنائیوں سے دور رہنے کی تلقین کی۔

اسی طرح عرب قومیت وہ گمراہ کن عقیدہ اور نظریہ ہے جو یہود ونصاریٰ کے سازشی ذہنوں کی پیداوار ہے اور دین وسیاست کی تفریق، وطن وقوم پرستی اور بیجا تعصب کی بنیادوں پر محض مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کرنے اور اسلام کو کمزور کرنے کے ناپاک مقاصد کے

تحت وجود میں آیا ہے، اس عقیدہ کے راستہ سے عربوں کے دل ودماغ میں یہ بات بٹھائی جارہی تھی کہ ان کی ترقی کے لئے اس عقیدہ کا اعتراف واشاعت اور اس پر استحکام سب سے بنیادی چیز ہے۔ ۱۹۵۲ء کے بعد سے اس نظریہ نے اپنے بال وپر نکالنے شروع کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پوار عالم عرب اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کے بدتر اثرات ہر جگہ پہنچنے لگے۔

حضرت مولانا علی میاں نے برصغیر میں سب سے زیادہ مؤثر اور طاقتور انداز میں اس باطل نظریہ کی تردید کی، اس کو اپنا مشن بنالیا، مولانا کے اندازِ بیان اور شدت وقوت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قومیت، فرقہ بندی، تعصب بیجا اور طبقاتی تقسیم ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ خطرناک اور بدترین عناصر ہیں، اس لئے مولانا نے اپنی زبان وقلم کے راستہ سے جتنی قوت اور طاقت سے قومیت کے اس نظریہ (جو اصلاً کمیونزم اور اشتراکیت کا عربی ایڈیشن تھا) کی تردید کی وہ شاید کسی اور مسئلہ میں کی ہو۔

ہم شروع میں ذکر کرچکے ہیں کہ جمال عبدالناصر ہی اس تہذیبی ارتداد کا سب سے بڑا علم بردار بھی تھا، وہ عالم عربی کا رُخ اس مرکزی نقطہ سے ہٹا کر جو اس کے فکر وعمل، شوق وتمنا اور جوش وجذبہ کا قبلہ رہا ہے، ہمہ گیر مادیت اور نامذہبیت (سیکولرزم) کی طرف پھیرنا چاہتا تھا، وہ پورے عزم وتنظیم اور سوچی سمجھی اسکیم کے ساتھ اس منزل کی طرف رواں دواں تھا، اس طرح کی قوم پرستی نہ صرف اخوتِ اسلامی کی حریف؛ بلکہ نبوتِ محمدی کی رقیب بھی تھی، اس باطل نظریہ کے اثراتِ بد بڑے بلند پایہ افراد کے یہاں بھی نمودار ہورہے تھے، مشہور مصری فاضل اور ادیب استاذ احمد حسن زیّات کے قلم سے جامعہ ازہر کے ترجمان ''مجلۃ الازہر'' میں ''أمة التوحيد تتوحد'' کے عنوان سے جمال عبدالناصر کی زندگی ہی میں ایک مضمون شائع ہوا، جس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

وہ وحدت جس کی دعوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، ایک عام اصول تھا؛ اس لئے کہ اس کی بنیاد عقیدہ پر تھی، عقیدہ کی کتنی ہی زندگی ہو وہ کمزور بھی پڑ جاتا ہے اور بدل بھی

جاتا ہے، اور وہ وحدت جس کی صلاح الدین ایوبی نے دعوت دی تھی، وہ ایک خاص جزئیہ تھا اس لئے کہ اس کی بنیاد طاقت پر تھی اور طاقت کو ضعف بھی عارض ہوتا رہتا ہے، اور اس کا زوال بھی ہوجاتا ہے؛ لیکن وہ وحدت جس کی جمال عبدالناصر نے دعوت دی ہے، وہ باقی رہنے والی اور پھلنے پھولنے والی ہے؛ اس لئے کہ اس کی عمارت تین بنیادوں پر قائم ہے، غذا اور اسبابِ معیشت میں اشتراکیت، اظہارِ خیال میں حریت اور نظام حکومت میں جمہوریت، اور یہ تین عناصر اس وحدت کی بقاء کے لئے دائمی ضمانت ہیں''۔ (کاروانِ زندگی ۲/۶۹-۷۰)

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ مصر کی یہ قیادت اسلام کے لئے کس قدر خطرناک ثابت ہورہی تھی اور اس کے بدتر نتائج صرف ذہنی اور تہذیبی ارتداد ہی پر منحصر نہ تھے؛ بلکہ اس کے حدود کہیں کہیں اعتقادی ارتداد سے بھی مل جاتے ہیں، جیسا کہ مذکورہ اقباس میں نمایاں ہے۔ مولانا نے خود تحریر فرمایا ہے کہ:

''مجھے یہ محسوس ہوا کہ خود ہمارے ملک کے دینی حلقے میں بھی اس دینی حمیت اور اسلامی غیرت میں جو اس حلقہ کا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار تھا اور اس کے اکابر کا شعار تھا، تیزی کے ساتھ انحطاط آ گیا ہے، اور یہ وہ نقصان ہے جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں، اس بنا پر میرے قلب وضمیر کی اذیت میں اور اضافہ ہوا، اور اس نے اس صدائے احتجاج کو اور زیادہ بلند آہنگ اور تلخ بنادیا:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی''

(کاروانِ زندگی ۲/۷۰-۷۱)

انہیں خطرات کے پیش نظر مولانا نے اس فکر کی مخالفت میں روز وشب ایک کردئے، متعدد کتابیں، رسائل، تقریریں اور مکتوبات اسی مسئلہ سے متعلق ہیں، مولانا نے ''عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں''؟ کے نام سے ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا، اس کے علاوہ ''البعث الاسلامی'' اور اس کے فاضل مدیر مولانا محمد الحسنیؒ اور دیگر احباب نے مولانا کے ہمراہ اس فکر کی تردید کے لئے جس جوش وجذبہ کے ساتھ کام کیا، وہ قابل مدح وفخر ہے۔ اس

حق گوئی کی پاداش میں مولانا کو وزارتِ خارجہ دہلی میں طلب کر کے اس سلسلہ میں پوچھ تاچھ بھی ہوئی، مگر مولانا نے پوری صفائی سے اپنے موقف کی وضاحت کی اور اس پر قائم ودائم رہنے کے عزم بالجزم اور جذبہ بے پناہ کا اظہار بھی کیا، خواہ اس کے نتیجہ میں انہیں باہر جانے کی سہولتوں سے محروم کر دیا جائے، اسی طرح مدیر ''البعث الاسلامی'' مولانا محمد الحسنی مرحوم کو بھی بلا کر موقف تبدیل کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا، مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

۵/جون ۱۹۶۷ء کو مصری شکست فاش اور اسرائیل کی فتح کے نتیجہ میں بیت المقدس اور دریائے اردن کے مغربی کنارہ کی پوری عرب پٹی پر اسرائیلی تسلط کے سنگین حادثہ نے طویل وعریض عالم اسلام کی بے بسی اور رسوائی کا نقشہ پیش کر دیا اور عرب قومیت کے نظریہ کی گمراہی اور اس کا فساد کھل کر سامنے آیا، اس حادیثہ کے بعد مولانا کا ایک رسالہ ''**کارثة العالم العربی و اسبابها الحقیقة**'' شائع ہوا، جس میں اس شکست وریخت کے اسباب اور عربوں کی بنیادی خامیوں اور کمزوریوں کا بے لاگ جائزہ اور دعوتِ اصلاح ہے۔ اس کے علاوہ ''**ردّة ولا ابابکر لها**'' (ارتداد ہے مگر کوئی ابوبکر نہیں) ''**الفتح للعرب المسلمین**'' (فتح وکامرانی مسلمان عربوں ہی کا مقدر ہے) ''**إغارة التتار علی العالم الاسلامی وظهور معجزة الاسلام**'' (عالم اسلام پر تاتاریوں کا حملہ اور اسلام کے معجزہ کا ظہور) ''**کیف دخل العرب التاریخ**'' (عرب تاریخ میں نمایاں کیسے ہوئے؟) وغیرہ متعدد رسائل مولانا نے عربوں کو اسی انحراف سے بچانے کے لئے لکھے ہیں، یہ ایک طوفان تھا جس کا مقابلہ مولانا نے شدومد سے کیا شاید کسی اور نے کیا ہو، اسی کا نتیجہ تھا کہ عرب ممالک میں اس طوفان کو روکا جاسکا اور مرورِ ایام سے قومیت کا یہ نعرہ بے اثر اور کمزور ہوتا گیا۔ **واللّٰہ علیٰ کل شیءٍ قدیر**۔

مسئلہ فلسطین

فلسطین پر یہود کے ناپاک قبضہ اور عربوں کی ہزیمت نے مولانا کے دلِ درمند کو جو

سخت چوٹ پہنچائی تھی، اس کا کچھ اندازہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے ہوسکتا ہے، فلسطین کا یہ مسئلہ جو بیسویں صدی کے نصف آخر کا اہم ترین مسئلہ ہے، مولانا کی توجہ اور مساعی کا مرکز بنا رہا، فلسطین کے مسئلہ کو سلجھانے اور حل کرنے کے لئے مولانا نے جو کوششیں فرمائی ہیں ان سے مولانا کی دور اندیشی، باریک بینی، نتائج کے بجائے اسباب کی تلاش وجستجو اور فراست وبصیرت نمایاں ہے۔ مولانا کا یہ عقیدہ تھا کہ فلسطین کا یہ سانحہ اللہ کا عذاب ہے، جو خیانت وبد عملی کی وجہ سے عربوں پر مسلط ہوا ہے، یہ محض آزمائش یا ظلم یا اتفاقی واقعہ نہیں ہے، اور یہودیوں کا یہ خطرہ صرف فلسطین اور فلسطینیوں تک محدود نہیں رہے گا، اس کے اثرات سارے عرب ممالک تک پہنچائیں گے۔

مولانا نے عرب ممالک کی بہت قریب سے زیارت کی ہے اور وہاں غیر اسلامی مذبذب سیاسی حکومتوں کا ضعف ارادہ اور مغربی ملکوں کے چشم وابرو کی پیروی کے تکلیف دہ مناظر کا مشاہدہ کیا ہے، اربابِ حل وعقد اور ذمہ داران وقائدین کے اخلاق وکردار، راحت پسندیوں، عیش کوشیوں اور مادیت پرستیوں کو بڑے غور سے دیکھا ہے، خصوصاً مصر کا مولانا نے بڑے غور سے مشاہدہ کیا ہے، جو عالم عربی کا زعیم اور تمام ادبی، علمی اور دینی تحریکات کا مرکز رہا ہے، جہاں ادباء، اصحابِ قلم اور دانشوروں نے دینی طاقتوں، اخلاقی واجتماعی اقدار اور تاریخی انمٹ حقائق کا مذاق اڑایا اور اپنے ادب وفن کی ساری توانائیاں صالح زندگی اور اخلاقِ کریمانہ کی بنیادیں منہدم کرنے، حق وناحق کی پروا کئے بغیر فکری اضطراب پیدا کرنے میں صرف کردی ہیں۔ مولانا نے علماء اور دین کے ٹھیکے داروں کو حق گوئی، باطل پر تنقید اور عدل وانصاف کے تقاضے پورا کرنے سے بھاگتے اور گھٹیا قدروں کے پیچھے دنیادار، مادیت پرست اور غلط مقاصد کی تکمیل، اہل خاندان کو ہر بجا وبے جا میں خوش رکھنے اور معیارِ زندگی بہر صورت اونچا اور خوب تر کرنے کی فکر میں منہمک افراد کی طرح دوڑتے دیکھا، عام لوگوں اور نچلے طبقات کا گانے بجانے، عیش وطرب، لہو ولعب غرضیکہ سماعت وبصارت اور تخیل کی تمام تر لذتوں کے حصول

میں بے انتہا شغف وانہماک بھی دیکھا اور یہ بھی محسوس کیا کہ یہ سارے طبقے اپنے معیار وتہذیب کے نمایاں فرق کے باوجود دنیا کی اس چندروزہ زندگی کی محبت میں مست ہیں، اور موت کو ناپسند کرتے ہیں، اس لئے نہ وہ اپنے کو خطرات میں ڈالنا چاہتے ہیں اور نہ ہی کوئی عملی اقدام کرتے ہیں۔ اس خطرناک صورتِ حال کو دیکھ کر مولانا کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ عرب کی یہ قومیں کسی بیرونی خطرہ کا سامنا کرنے کی اہل نہیں ہیں اور نہ ہی اپنے دین وشرف اور شعائر اور مقدس عبادت گاہوں کا دفاع کرسکتی ہیں۔ مولانا نے اپنے قلب کی گہرائی اور ایمانی قوت سے یہ سمجھ لیا تھا کہ جو کچھ ہورہا ہے، وہ اسی آیت کی تفسیر ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم.

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

مولانا نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ فلسطین کی اس شکست ورسوائی کے پس پردہ دراصل بہت سے اخلاقی اور تربیتی عوام کارفرما ہیں، مغربی استعمار نے مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں مخفی قوت کے سوتوں کو ڈھونڈا اور اپنی جستجو کے نتیجہ میں انہوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کی قوت وزندگی کا سب سے بڑا سرچشمہ ایمان ہی ہے، چناں چہ اس کے خلاف محاذ آراء ہوگئے اور انہوں نے اپنی تدبیر ومکر سے مسلمانوں پر وہی دو دشمن پھر مسلط کردئے جو اس سے قبل مختلف اقوام خصوصاً تاتاریوں اور مغلوں کی ہلاکت وپستی کا اصل سبب رہ چکے ہیں: (۱) شک وتذبذب اور یقین کی کمزوری اور بوداپن جس سے بڑی بزدلی اور کمزوری کوئی اور نہیں ہوسکتی (۲) احساسِ کمتری جو مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں اس درجہ رچ بس گئی کہ وہ اپنے دین ومذہب اور اخلاق وتمدن تک کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے اور یورپین اقوام کی ہر موقع پر برتری، فضل وشرف اور خیر وکمال کا اعتراف واقرار کرنے لگے، اصل مشکل فلسطین کے مسئلہ کی یہی تھی کہ عربوں نیعام طور سے اس مسئلہ کو اس کے صحیح دائرہ میں نہیں رکھا اور اسے اسلامی مسئلہ نہیں

سمجھا جو یہودیوں کے حملہ کا نشانہ بن رہا تھا، انہوں نے اس مسئلہ کے حل کی جو کوششیں بھی کیں، وہ اس انداز کی ہیں جیسے کوئی سیاسی مسئلہ درپیش ہو، انہوں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھیں اور تقریریں بھی کیں، مگر ہر جگہ اس ظلم وناجائز تصرف کو ختم کرنے اور مٹانے کی بات کہی؛ لیکن انہوں نے اس ذلت ونکبت کے اسباب کا جائزہ لے کر اسے ختم کرنے کی آواز بلند نہیں کی، وہ اصل بنیادوں سے غافل رہ گئے اور دوسری چیزوں میں پھنس گئے۔

واقعہ یہی ہے کہ فلسطین کے مسئلہ میں زبانی جمع خرچ تو بہت ہوا، مگر اس سمت میں کوئی سنجیدہ عملی کوشش نہیں ہوئی، نہ ہی مغرب کی اس خطرناک سیاست وخیانت کے ستم رسیدہ ملکوں اور قوموں کو اپنا نظامِ حیات بدلنے کی کوئی دعوت واضح اور طاقتور انداز میں سامنے آئی، یہ ہماری تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے کہ اس مسئلہ میں ذلت ورسوائی کے اسباب کے ازالہ کے لئے کوئی داعیہ اور جذبہ بیدار نہیں ہوسکا، جب کہ خداوند قدوس کی نصرت حقیقی کا اصل ضامن انہیں اسباب کا ازالہ ہے، کتاب وسنت اور تاریخ اسلامی میں اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں؛ لیکن فلسطین کے مسئلہ میں یہ بے توفیقی رہی کہ حکام اور مؤثر افراد میں سے کسی کو بھی اس موقع پر قرآنِ کریم سے استفادہ اور عقل سلیم سے کام لینے کا شعور تک پیدا نہیں ہوا۔

مولانا جس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں وہ یہی ہے کہ فلسطین کی بازیابی اسلام ہی کے راستہ سے ممکن ہے، فلسطین کی شکست کے اخلاقی، نفسیاتی اور فکری عوامل جب کبھی بھی ختم ہوں گے، تو یہ سارے مصائب ومسائل بھی ختم ہوجائیں گے اور فلسطین کی بازیابی کی راہ ہموار ہوتی چلی جائے گی، مولانا کے بقول فلسطین کے مسئلہ کا حل بہت آسان ہے۔ عربوں کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے تصرفات وامور میں آزاد اور خودمختار ہوجائیں، ان کی سیاست ان کے اپنے ہاتھوں میں ہو، اغیار کی مٹھی میں نہ ہو، وہ خطر پسند ہوجائیں، وہ دوسروں پر تکیہ کرنا اور دست نگر رہنا چھوڑ دیں، اور طاؤس ورباب کے بجائے شمشیر وسناں کو اختیار کرلیں، اللہ کی نصرت پر بھروسہ اور اپنے زورِ بازو پر اعتماد کے ساتھ جہاد ودعوت کے لئے

آمادہ اور شہوت و مادہ پرستیوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔ (فلسطین کے مسئلہ کی مذکورہ بالا تفصیلات کے لئے دیکھئے: اعلام القرن الرابع عشر الہجری، مصنفہ: استاذ انور الجندی ۴۲۳-۴۲۶)

۱۹۵۱ء کے وسط میں مولانا نے شام، عمان اور بیت المقدس کا سفر کیا، جس میں یہ حقائق بھی مولانا کے علم میں آئے کہ مسئلہ فلسطین ایک ڈرامہ تھا، جس کو انگریزوں اور ان کے چیلوں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا، اس کے کردار عرب بادشاہ اور حکومتیں تھیں، یہ ڈرامہ فلسطین کے اسٹیج پر کھیلا گیا اور عالم عربی اور عالم اسلام کی آنکھوں میں دھول ڈال کر برطانیہ اور صہیونی یہودیوں کے منصوبے کو پورا کیا گیا، یہ ایک سوچی سمجھی شاطرانہ اسکیم تھی، مسلمانوں کی اس ذلت و رسوائی کے معاملہ میں آزاد فلسطینی قوم سب سے زیادہ بے قصور ہے، اصلاً فلسطین کا خون عرب حکومتوں اور اُن کے قائدین اور عرب لیگ کی گردن پر ہے۔ (کاروانِ زندگی ۱/۳۸۷ مختصراً)

مولانا نے ۲۳/جولائی ۱۹۵۱ء کو دمشق یونیورسٹی کے ہال میں دانشوروں اور علماء کے بڑے مجمع میں اپنا ایک وقیع مقالہ پیش کیا جو "العوامل الاساسیة فی کارثة فلسطین" (المیۂ فلسطین کے بنیادی اسباب) کے نام سے بعد میں طبع ہوا۔ اس مقالہ میں ان اہم اسباب سے بحث کی گئی ہے جو المیہ فلسطین کے ذمہ دار ہیں، ان میں پہلا سبب اپنے اصول وعقیدہ پر مر مٹنے اور جان کی بازی لگا دینے والے جذبہ کا فقدان تھا، دوسرے اس ذہنی ونفسیاتی کیفیت کا فقدان جسے اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تیسرا سبب یہ ہے کہ عرب حکومتوں اور قوموں میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا، جس کے دل و دماغ پر فلسطین کا مسئلہ چھا جائے۔ (کاروانِ زندگی ۱/۳۸۸)

فلسطین کی بحالی کا مسئلہ مولانا کی رائے میں عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۹۵۶ء میں دمشق کی مؤتمر اسلامی میں مولانا نے "ارتباط قضیة فلسطین بالوعی

الاسلامی ’’(اسلامی بیداری سے مسئلہ فلسطین کا ربط) کے موضوع پر جو خطاب کیا تھا وہ اسی فکر کا اظہار تھا‘‘، یہودیت اسلام سے شروع سے متصادم اور مزاحم ہے، ہم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس تصادم میں اسلام کے غلبہ کی کوششوں کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں، اس کے لئے کسی نئے دین کی ہمیں ضرورت نہیں، والعیاذ باللہ۔ ہاں! نئے ایمان کی ضرورت ضرور ہے، حالات جب غیر معمولی ہو جاتے ہیں اس وقت انسان غیر معمولی توانا و مضبوط، زندہ و پر جوش اور مجسم عمل ایمان کی ضرورت محسوس کرتا ہے، یہ ایمان اگر صحابہ جیسا نہ ہو تو کم از کم صلاح الدین ایوبی اور ان کے دین دار لشکریوں کی طرح تو ہو۔ قاضی بہاؤ الدین ابن شداد نے صلاح الدین ایوبی کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ حرام امور سے تائب اور لذت و عیش کا تارک ہو چکا تھا، اس کے ذہن و دماغ میں یہ حقیقت جاگزیں ہو گئی تھی کہ اللہ نے اسے ایک بلند مقصد کے لئے وجود بخشا ہے جو لہو و لعب سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا، بیت المقدس کی بازیابی کا مسئلہ اس کے نزدیک سب سے اہم تھا اور اس کے لئے اس میں بے پناہ جوش اور عزم و استقلال تھا، فلسطین کو آزاد کرانے کے لئے اس میں وہی تڑپ تھی جو ایک ماں کو اپنے اکلوتے بیٹے کی گم شدگی یا موت پر ہوتی ہے۔ (نفحات الایمان ۸۰، مؤلفہ: مولانا ندویؒ)

فلسطین کی بازیابی کے لئے صلاح الدین ایوبی ہی کے عزم و ارادہ کی ضرورت ہے، فلسطین و بیت المقدس زبانِ حال سے گویا ہے:

هاتِ صلاح الدين ثانية فينا

وجدّدی حطّين أو شبه حطّينا

ترجمہ: صلاح الدین کو دوبارہ لاؤ اور معرکہ حطین کی یاد تازہ کرا دو۔

مغربی تہذیب، اس کے فلسفوں، مادیت پرستی، دنیا سے محبت، نفع پرستی اور تمام بے اعتدالیوں سے جب تک احتیاط نہیں برتی جائے گی اور روشن خیال مگر تاریک روح، بے دین، بد باطن، کم ہمت، بے صبر، بزدل، بد اخلاق، ضعیف الارادہ اور ذاتی منافع کے حریص

دنیا پرست افراد کو میدانِ عمل سے جب تک ہٹایا نہیں جائے گا، فلسطین کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

یہی وہ پیغام ہے جو مولانا کی تقریروں اور تحریروں میں ملتا ہے، مسئلۂ فلسطین کے حل کے لئے مولانا نے جو کوششیں فرمائی ہیں وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہیں، ان کی پوری تفصیلات مولانا کی کتاب ''المسلمون و قضية فلسطين'' (مسلمان اور مسئلۂ فلسطین) المیۂ فلسطین سے تین سبق، عالم عربی کا المیہ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خلیجی جنگ

اگست ۱۹۹۰ء کو عراق کی حکومت نے کویت پر غاصبانہ قبضہ کر یا اور پھر غارت وفساد کا وہ طوفانِ بدتمیزی برپا ہوا جو پورے عالم اسلام کے لئے تکلیف وندامت کا باعث ہوا، اس کامیابی نے عراق کے حوصلے بڑھادئے اور اس کی نظر بد حجاز مقدس پر بھی پڑنے لگی، اس خطرناک صورتِ حال کو خاص طور سے اس دینی حلقہ نے محسوس کیا جو عالم عربی میں پیدا ہوئی پچھلی تحریکات اور خصوصاً قومیت عربیہ (جو البعث العربی کے نام سے معروف ہے) کی تاریخ، عوامل واسباب اور ان کے فکری سرچشموں سے بخوبی واقف تھا اور جسے یہ خطرہ سامنے نظر آرہا تھا کہ اس طرح کے تخریبی اقدامات اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے اور حجاز مقدس کے تقدس کو پامال کرنے کی کوششیں ہیں جو دراصل غیر اسلامی افکار اور مغرب کی دشمنانہ منصوبہ بندیوں ہی کے سلسلہ سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کا اصل مقصد اسلام کے اس اصیل واولین مرکز میں داخل ومؤثر بن کر عربوں کے ذہن کی تہذیبی ارتداد اور جاہلیت اولیٰ کی طرف بازگشت اور دین اور عقیدہ وعمل میں ضعف وتزلزل پیدا کرنا اور کفر سے نفرت اور جاہلیت سے عار محسوس کرنے کے جذبات کو ختم کرنا اور دورِ جاہلیت ہی کو قابل فخر زمانہ ثابت کرنا تھا۔

مولانا نے ہندوستان میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ان خطرات کو محسوس کیا، عربوں کے افکار، مسائل ومشاکل اور محاسن ومعائب پر مولانا کی جتنی گہری نظر، مطالعہ اور

مشاہدہ تھا اس کے پیش نظر ہمارے علم میں برصغیر میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا، مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پوری صفائی سے عراقی حملہ کی مذمت کی اور واضح کیا کہ:

''کویت پر صدام حسین کے اقدام کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ اسلام کی اخلاقی شہرت اور انسانی دعوت کو وہ نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی برسوں نہیں ہو سکے گی، مسلمانوں کا سر شرم سے جھک گیا ہے، وہ اغیار کی شکایت اب کس منہ سے کریں جب ایک ہی مذہب کے مدعی، ایک ہی زبان کے بولنے والے اور ایک پڑوسی ملک نے ایک ایسے پڑوسی ملک پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا جو اس سے رقبہ میں بہت چھوٹا اور تاریخ میں بہت کم عمر اور غیر نمایاں ہے، ہمارے اس برصغیر (ہندوستان و پاکستان) کی ایک بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مغربی طاقت کے خلاف زوردار لفظ بول دے تو وہ ہیرو بن جاتا ہے، اس کی برائیوں کے ریکارڈ بھلا دئے جاتے ہیں، ہر لفظ جس میں ''خطر پسندی'' اور ''مہم جوئی'' ہو اس کو سن کر مسلمان دیوانے ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس سے اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچتا ہے، ''پیام انسانیت'' کے ایک داعی کی حیثیت سے اب یہ مشکل ہو گیا ہے کہ اس جرأت اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کسی سے نہیں کہہ سکتے کہ کسی کی جان نہیں لینا چاہئے اور کسی کی زمین و جائیداد پر قبضہ نہیں کرنا چاہئے''۔ (کاروانِ زندگی ۵/۱۸-۱۹)

واقعہ کی سنگینی مولانا کے بقول اس وجہ سے تاور بڑھ جاتی ہے کہ یہ واقعہ بلادِ عربیہ میں جہاں پیش آیا، جہاں سے احترامِ انسانیت، عدل، احسان شناسی اور شرافت اور کمزور کی حمایت وحفاظت کی عالمی تحریک ودعوت نمودار ہوتی تھی۔ مولانا نے اپنے خاص اسلوب اور طرزِ فکر (جس میں سب سے زیادہ نمایاں سلامت روی اور دوراندیشی ہے) کے مطابق اس حادثہ کی سنگینی اور اس کے انسانی واسلامی ضمیر پر بار ہونے کی متعدد وجوہ واسباب اپنے ایک رسالہ ''المأساة الأخيرة في العالم العربي'' (عالم عربی کا تازہ المیہ) میں تحریر فرمائے ہیں، جن کا حاصل مختصراً یہ ہے:

۱:- عراق جیسے بڑے اور طاقتور ملک نے جو حال ہی میں ایران جیسے عظیم ووسیع ملک سے جنگ میں کامیاب ہو چکا تھا، کویت جیسی چھوٹی ریاست پر حملہ اور قبضہ کر کے ایک

ایسی خراب نظیر قائم کردی جو نہ صرف یہ کہ اسلام کی اخلاقی تعلیم وروایات سے مطابقت نہیں رکھتی؛ بلکہ انسانی ضمیر اور اصولِ اخلاق کے لحاظ سے بھی ایک مذموم اقدام اور ''قزاقی'' کے مرادف ہے، پھر اس میں مزید سنگینی کا پہلو یہ ہے کہ حملہ آور ملک اور اس ستم کا شکار علاقہ دونوں مسلمان بھی ہیں اور عرب بھی، مزید برآں یہ کہ ایک ایسے ملک نے اس ریاست پر حملہ اور قبضہ کیا جس نے قریب ترین ماضی میں اس کی فیاضانہ مدد کی تھی اور جس کا کوئی ایسا قصور نہ تھا کہ اسے یہ سزا دی جاتی۔

۲ :- پھر عراق کے کویت پر اس کامیاب حملہ اور قبضہ کے نتیجہ میں وہ ساری قباحتیں اور شرم ناک واقعات پیش آئے جن کا ایسے حملے اور فتوحات میں حملہ آور فوجوں کے ہاتھوں تجربہ کیا جاچکا ہے اور جس کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

ان الملوک اذا دخلوا قریة افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة، وکذٰلک یفعلون.

ترجمہ: بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں، تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کردیتے ہیں، یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔

۳ :- پھر عراق کے فوجی قائد وحکمراں صدام حسین نے ایران کی ان سب شرطوں اور دعاوی کو بلاشرط مان لیا جن کی بنا پر ایران سے سالہا سال ایک طویل اور خونریز جنگ اس نے لڑی اور طرفین کے لاکھوں آدمی لقمۂ اجل بنے، صدام حسین نے یہ حرکت کرکے اپنے ''کارنامہ'' پر خود پانی پھیر دیا اور ان لاکھوں مقتولین کے ساتھ ناانصافی کی جو اس جنگ میں مارے گئے، اور جن کے متعلق یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ: ﴿بای ذنب قتلت﴾ (کس جرم میں ان کو مارا گیا؟) صدام کے اس متضاد طرزِ عمل نے خود اس کے کارنامہ کو گرد وغبار بنادیا۔

۴ :- صدام حسین کی قوتِ ارادی، کامیاب فوجی تنظیم وقیادت سے بعض حلقوں میں یہ امید قائم ہونے لگی تھی کہ شاید وہ عالم عربی کی قیادت کے خلاء کو پر کرسکے اور اسرائیل

کے خلاف محاذ آرا ہوکر فلسطین کی بازیابی کی خدمت انجام دے سکیں؛ لیکن یہ موقع نہیں آیا تھا کہ اس نے بجائے اسرائیل کے بلادِ عربیہ اسلامیہ کے اندر ایک نیا محاذ کھول دیا اور ساری توقعات خاک ہوکر رہ گئیں۔

۵ :- کویت پر یہ حملہ خطرہ کی گھنٹی ہے اور جزیرۃ العرب وحجاز مقدس پر صدام کی نگاہِ طمع اٹھنے کا اندیشہ بھی سر اٹھا رہا ہے، کیوں کہ:

تاریخِ اُمم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

اس اندیشہ کے نتیجہ میں حکومت سعودیہ کو امریکہ وبرطانیہ سے فوجی امداد طلب کرنی پڑی اور دنیا کے عام مسلمانوں کو یہ تمنا ہوئی کہ کاش خود مسلم ممالک جزیرۃ العرب کی حفاظت کے لئے پورے شوق ونشاط کے ساتھ کمربستہ ہوجاتے اور میدانِ عمل میں آتے۔

۶ :- اگر عراق کے کویت پر حملہ کرنے اور کسی دوسرے عرب ملک کی طرف بھی حوصلہ مندی کی نگاہ اٹھانے کے جواز میں یہ کہا جائے کہ ان بلادِ عربیہ کی زندگی خود ایسے تادیبی اقدامات اور کارروائیوں کی عرصہ سے دعوت دے رہی تھی، اور یہ وہاں کی مترفانہ اور مسرفانہ زندگی کا نتیجہ ہے جس کی تصدیق قرآن وحدیث کے بیانات سے ہوتی ہے؛ لیکن یہ جواز بیحد بودا ہے، اس صورتِ حال کا علاج یہ نہیں تھا کہ ایک بڑا ملک ایک چھوٹی ریاست پر اندھا دھند حملہ کردے اور بلا کسی اصلاحی مقصد ودعوت کے اس پر قبضہ جمالے، اس کا علاج صحیح اسلامی دعوت وتحریک، احیائے دین کی سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش، اپنی جگہ پر صحیح اسلامی نظام حکومت وطرزِ معاشرت کا قیام، صالح نظام تعلیم وتربیت اور ایک معیاری مثالی واسلامی معاشرہ اور ماحول کی موجودگی ضروری ہے جو دنیا کے لئے جاذبِ نظر اور قابل رشک ہو۔ افسوس ہے کہ حملہ آور عراق کے پاس ان میں سے کوئی امتیاز وخصوصیت نہیں پائی جاتی اس لئے اس کا کوئی شرعی واخلاقی جواز نہیں تھا۔ (کاروانِ زندگی ۴/۲۷۴-۲۷۸ مختصراً)

حضرت مولانا علی میاںؒ کے دل ودماغ پر شعوری زندگی میں کسی حادثہ کا ایسا اثر نہیں پڑا جتنا اس حادثہ کا اثر پڑا؛ اس لئے کہ مولانا نے بدِ وشعور کے بعد ہی سے اپنی صلاحیتوں کا اصل میدان عالم عربی ہی کو بنایا اور اپنی اکثر اہم تالیفات وخطبات میں مخاطب عرب اقوام وممالک کو بنایا، اس حادثۂ فاجعہ سے بلادِ عربیہ خصوصاً حجاز مقدس اور حرمین شریفین کے لئے جو خطرات پیدا ہوگئے تھے، ان سے مولانا کے دل ودماغ کو بڑا گہرا صدمہ پہنچا کہ:

ع: اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

اس کے ساتھ ہی مولانا کو جزیرۃ العرب کی منجانب اللہ حفاظت پر پورا یقین تھا؛ لیکن اس طرح کی تکلیف دہ صورتِ حال کا ازالہ مولانا کے نزدیک طرزِ زندگی کی اسلامیت اور ایمانی قوت وطاقت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

مولانا نے اس موقع پر صرف ای کرخی دعوت سے کام نہیں لیا؛ بلکہ جہاں عراق اور صدام حسین کے طرزِ عمل کی سختی سے مذمت کی وہیں عالم عرب کے متعدد امراء وحکام کو ان خطرات کی طرف توجہ دلائی اور اخلاص کے ساتھ ان خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کی دعوت دی جو اللہ کی تائید وحمایت سے محرومی کا سبب بنتی ہیں، مولانا نے اپنا دعوتی فرض اور دینی احتساب غیر جانب داری اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دیا، اس موقع پر مولانا نے سعودی عرب کے سربراہ شاہ فہد بن عبدالعزیز کو ایک طویل مکتوب لکھا، جس میں اُن کو اِن حقائق کی طرف متوجہ کیا اور اس سلسلہ میں خلیفۂ راشد سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اور مجاہد اعظم صلاح الدین ایوبیؒ کے نمونوں کو پیش نظر رکھنے کی دعوت بھی دی، شاہ فہد نے اس مکتوب کا جواب دیا اور مولانا کی ہدایات پر عمل کا جذبہ ظاہر کیا اور مولانا کا شکریہ بھی ادا کیا۔

کویت پر عراق کی فوج کشی کا خاتمہ ہوا تو مولانا نے عبدالکریم پاریکھ صاحب کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''آج صبح یہ خبر ملی کہ عراق نے اپنی فوج کو کویت سے واپس آنے کا حکم دے دیا ہے:

ہر چہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

کاش! صدام نے پہلے ہی ان سب کا مشورہ مان لیا ہوتا؛ لیکن بقول فارسی شاعر کے:

خلقے بمنّت یک طرف
آں شوخ تنہا یک طرف

افسوس ہے کہ دین اور امت کی ایسی بدنامی اور بدنمائی ہوئی جس کی نظیر دور دور تک نہیں ملتی''۔ (ماہنامہ ''افکارِ ملی'' دہلی مارچ ۲۰۰۰ء)

عالم عربی کے مسائل ومشاکل اور وہاں کی فکری، سیاسی اور دعوتی صورتِ حال کے تجزیہ واصلاح اور رہنمائی کی ذمہ داری مولانا نے مختلف ذریعوں اور طریقوں سے انجام دی ہے، عربوں میں خود شناسی کا شعور پیدا کرنے، اپنا منصب پہچاننے اور اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے مولانا نے بڑی قابل قدر کوششیں فرمائی ہیں، ان کی بے راہ رویوں پر مولانا تڑپے اور روئے ہیں، انہیں منزل کا راستہ بتایا ہے، مغربی تہذیب کی لعنتوں (جن کی تفصیل آگے آرہی ہے) سے بچانے کے لئے ہر طرح سے جدوجہد کی ہے اور ہر موقع پر کتاب وسنت اور تاریخ اسلام سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے، اپنی مشغول ترین زندگی میں مولانا نے عربوں کی اصلاح کا جو بیڑہ اٹھایا اس سے ان کی حمیتِ اسلامی اور جذبۂ غلبۂ دین کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نوٹ: اس مضمون میں مولانا کی کتاب ''**کیف دخل العرب التاریخ، الاسلام والحضارة الانسانية، العرب يكتشفون انفسهم**'' سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ زیادہ تر پرانے چراغ کے تینوں حصوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

(عربی حوالوں میں ترجمہ مضمون نگار کے قلم سے)

❐❖❐

مغربی تہذیب کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ کا

معتدل اور جامع موقف

مغربی تہذیب کا جو سیلابِ تند و تیز ایک عرصۂ دراز سے عالم عربی اور عالم اسلامی کو اپنی زد میں لئے ہوئے ہے اور اپنی ظاہری رعنائیوں، دل فریبیوں اور جاذبیت کی وجہ سے مرکز توجہ اور منظور نظر بنا ہوا ہے، اور وہ پختہ مسلمان بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں جن کے اسلاف تقریباً دس صدیوں تک اپنے علوم و اقدار کے ساتھ دنیا کے حاکم و سربراہ رہے۔ مغرب کا یہ کلچر (جو حضرت مولانا علی میاںؒ کے الفاظ میں مسیح دجال ہے) دراصل اسلامی ثقافت پر حملہ، اسلامی اقدار و غلبہ کو کمزور کرنے کی گہری سازش اور ایک سوچا سمجھا اور جانا بوجھا منصوبہ ہے۔

مغربی تہذیب و اقدار کے سلسلہ میں تین ہی موقف ہو سکتے ہیں: (۱) سلبی (Negative) موقف: یعنی مغربی تہذیب سے بالکل گریز اور نفرت اور اس کے ہر ہر جزء کی مخالفت اور ہر موقع پر اُسے شجر ممنوعہ سمجھنا۔ یہ موقف نہ تو عقلی اور طبعی طور پر درست ہے، نہ ہی شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ہے؛ کیوں کہ اسلام ہر جگہ سے صالح و نافع اشیاء کے اخذ کا داعی ہے۔ (۲) ایجابی و تائیدی (Positive) موقف: یعنی خیر و شر اور صلاح و فساد ہر موقع پر مغرب کے کلچر کی پوری پیروی اور مکمل سپردگی۔ یہ طریقۂ فکر و عمل اور موقف افراط پر مبنی ہے، اور پہلے سلبی اور تفریط کے موقف سے بدرجہا سنگین اور خطرناک ہے، اس لئے کہ یہ اسلام، اسلامی اقدار، تہذیب و تمدن اور خصوصیات کو دفن کر ڈالنے کے مرادف ہے۔ (۳) اعتدال و توازن: یعنی اسلامی عقائد اور افکار و اقدار سے غیر متصادم چیزوں کو اختیار کرنا اور متصادم اشیاء کو ٹھکرا دینا۔ بالفاظِ دیگر خیر کا انتخاب اور شر سے اجتناب، یہ موقف ہر لحاظ سے جامع اور معتدل ہے، اور یہی اسلام کے اصول و ہدایات سے ہم آہنگ بھی ہے، حضرت مولانا علی

میاںؒ نے افراط وتفریط کے دونوں پہلوؤں پر شدید تنقید کی ہے اور اعتدال کے اس پہلو کو اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔

مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جگہ جگہ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کا جائزہ لیا ہے اور مغربی کلچر کے مفاسد ومنافع دونوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو معتدل راہ اختیار کرنے کی طرف آمادہ کیا ہے۔

مولانا کے بقول تہذیب مغرب کے سلسلہ میں منفی اور سلبی رویہ کا نتیجہ عالم اسلام کی پسماندگی اور زندگی کے رواں دواں قافلہ سے بچھڑنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا، اس سے عالم اسلام کا رشتہ باقی دنیا سے منقطع ہوجائے گا، یہ رویہ کوتاہ نظری پر مبنی ہے، اس سے فطری قوتوں اور وسائل میں تعطل پیدا ہوتا ہے، اور یہ اس دین فطرت کی صحیح ترجمانی اور تعبیر نہیں ہے جس نے کائنات میں عقل وتدبر کے استعمال پر بڑا زور دیا ہے اور مفید علوم میں استفادہ کی ترغیب دی ہے، اور جس نے یہ حکم دیا ہے:

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة من رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم.

ترجمہ: اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو؛ تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کردو۔

اور جس نے یہ فرمایا ہے:

الكلمة الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو احق بها.

ترجمہ: حکمت کی بات مؤمن کی متاع گم شدہ ہے، جہاں بھی وہ اس کو ملے وہ اس کا حق ہے۔

یہ سلبی موقف قانونِ تکوینی اور اس کائنات کے مزاج کے بھی سراسر خلاف ہے، یہ

اعتدال کا موقف نہیں ہے، اس لئے یہ زیادہ لمبے عرصہ تک باقی نہیں رہتا، چناں چہ جو عرب ممالک شروع میں مغرب کے اس سیلاب سے بالکل گریزاں تھے، کچھ عرصہ کے بعد وہ اس میں پورے پورے ڈوب گئے، افراط وتفریط کی یہ صورتِ حال فکر کی پستی، ذہن ودماغ کی تنگی اور قوتِ ایمانی وخود اعتمادی کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہوئی، مغربی طوفان کے یہ اثراتِ بد آج بھی تمام اسلامی ممالک اور بلادِ عربیہ میں بفرق مراتب دیکھے جاسکتے ہیں، افغانستان کے ساتھ بھی یہی ٹریجڈی پیش آئی، ایک عرصہ تک وہ مغربی تہذیب کے اثرات اور ہر قسم کی اچھی بری تبدیلیوں سے محفوظ رہا، قدیم تہذیبی ومعاشرتی روایات ورسوم کو اس نے دانتوں سے پکڑے رکھا، وہ جدید تہذیب کے صالح اور مفید اجزاء کو بھی قبول کرنے کا روادار نہیں تھا؛ لیکن آخر میں یہ حجاب اٹھا اور اس نے بھی مغربی تہذیب اور طرزِ زندگی کو (اپنی کمزوریوں اور سارے معائب کے ساتھ) قبول کرنے کا تہیہ کرلیا اور پھر آنکھیں بند کرکے تیزی کے ساتھ مغربی تہذیب ومعاشرت کو اپنالیا۔

حضرت مولانا نے ۱۹۷۳ء میں اپنے سفر افغانستان کے تأثرات میں لکھا ہے کہ:

''افغانی قوم اپنے ماضی سے بہت دور جاپڑی ہے، اور یہ دوری ماہ وسال کی تعداد کے اعتبار سے تو تم کم ہے، یعنی صرف ۴۵ رسال؛ لیکن فکری وتمدنی اعتبار سے یہ مسافت بہت طویل ہے، اکثر قومیں کہیں صدیوں میں اتنی مسافت طے کرتی ہیں۔ افغانستان میں پردہ اب پسماندگی، جہالت وغربت کی علامت بن گیا ہے، اور دین کے نمائندہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج بہت وسیع ہوگئی ہے، جس کو پر کرنا آسان نہیں ہے۔

(دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ۳۱-۳۲ مختصراً)

(طالبان کی موجودہ حکومت نے صورتِ حال پر بہت کنٹرول کیا ہے، اور شعائر واحکام اسلامی کی پیروی کا مزاج پیدا کیا ہے) افراط وتفریط کا یہ ماحول ہم کو یمن میں بھی خوب ملتا ہے، ایک طویل عرصہ تک یمن تہذیب مغرب کا بالکلیہ مخالف رہا؛ لیکن پے بہ پے

انقلابات نے وہاں اسلامی قدروں کو زبردست نقصان پہنچایا اور مغربی تہذیب نے اپنے وبال و پر وہاں اچھی طرح پھیلا دیئے، اسی غیر معتدل ماحول نے عالم اسلام کو ایسی ترقی پذیر معتدل و عادل اسلامی سوسائٹی کی تشکیل سے دور کر دیا ہے، جس میں اسلامی طریقۂ زندگی کو اپنے عملی و ثقافتی اظہار اور نمود کا پورا موقع مل سکے۔

مغربی تہذیب کے سلسلہ میں دوسرا ایجابی موقف شکست خوردگی اور پوری طرح سر تسلیم خم کر دینے کا ہے، یہ طرز فکر سب سے پہلے ترکی میں شروع ہوا۔ مشہور ترکی ادیب ضیاء گوک الپ جدید ترکی کے فکری معماروں میں سرفہرست ہے، اس نے بڑی بلند آہنگی اور جوش کے ساتھ ترکی کو اپنے ماضی قریب سے علاحدگی اور خالص قومی و مادی بنیادوں پر تعمیر و تشکیل جدید کی دعوت دی، اور اپنا پورا ادب و فن اسی نظریہ کی تائید میں استعمال کیا، یہ نظریہ قبول ہوتا گیا، اور ترکی مغربی تہذیب کے کھوکھلے مظاہر اور سطحی اسطلاحات میں الجھ کر رہ گیا۔ ترکی کے عوام (جو اسلام پسند تھے) اور مغرب پرست حکومت کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی، مغربی تہذیب کو بزور نافذ کرنے کے لئے ترکی حکومت نے جس سنگ دلی اور تشدد سے کام لیا اور صلاحیت مند افراد کو جس طرح نشانہ بنایا گیا، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، یہ کشمکش آج بھی موجود ہے، مغربی تعذیب سے استفادہ کے میدان میں ترکی کا پارٹ خالص تقلیدی پارٹ تھا، اس کا پارٹ صرف درآمد (Import) کرنے، مستعار لینے یا نقل کرنے کا تھا، نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم، چناں چہ اس دور میں نہ تو سائنسی علوم میں کوئی ترقی ترکی کو ہوئی اور نہ ہی دوسرے علوم میں، اس طرح آج یہ قوم ایک تیسرے درجہ کی قوم کی حیثیت سے مغربی ملکوں کے زیر سایہ پل رہی ہے۔ ترکی کے ایک دانشور نامق کمال نے تمغر بی تہذیب وعلوم سے استفادہ کی نسبۃً زیادہ متوازن دعوت پیش کی تھی، جس کے اثرات بھی ہوئے؛ لیکن ضیاء گوک الپ کی دعوت زیادہ مؤثر رہی، جس میں کمال اتاترک کی قیادت کا دخل ہے، اس قیادت نے ترکی میں لامذہبیت اور ماضی سے شدید انحراف و بغاوت اور عسکری آمریت کا جو

رخ اختیار کیا، مذہب کی جس شدت سے مخالفت کی، تہذیب جدید کی جس پر جوش انداز میں پوجا کی، ٹوپی اور سر کے ہر لباس کو خلافِ قانون اور ہیٹ کا استعمال لازمی کر دیا، تمام اسلامی شعائر کا مذاق بنایا، عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط رائج کر دیا اور پوری زندگی سے اسلامی اور عربی عناصر کو دور کرنے میں جو حیرت انگیز و بے نظیر کامیابی حاصل کی وہ ہماری تاریخ کا ایک تاریک ترین باب ہے، عالم اسلام میں بدقسمتی سے اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ تجدد کا امام، ہیرو اور آئیڈیل سمجھا گیا اور اس کی تقلید کی گئی۔

دوسری طرف ہندوستان میں مغرب و مشرق کی یہ کشمکش سامنے آئی، انگریز حکومت کے قدم ہندوستان میں جم چکے تھے، مسلمان شکست خوردہ اور مضمحل ہو گیا تھا، ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد اس صورتِ حال میں مزید اضافہ ہوا تھا، اس نازک مرحلہ میں دو قیادتیں مسلمانوں میں ابھریں، پہلی قیادت علماء دین کے زیر سایہ اور دوسری سرسید احمد خاں اور جدید مکتب خیال کے افراد کی نگرانی میں ابھری۔

علماء نے حالات کی سنگینی کا جائزہ لیا، اسی پس منظر میں دار العلوم دیوبند ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا، سرسید احمد خاں کی تحریک مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب و نقائص کے ساتھ بلا ترمیم و تنقید اختیار کرنے کی داعی تھی، وہ سائنسی معلومات کے مطابق قرآن کی تفسیر کر رہی تھی، سرسید مرحوم نے جو تعلیمی کام انجام دیا اس کا ایک کمزور پہلو یہ تھا کہ اس میں ہندوستان کے مسلم معاشرہ کے حالات اور تقاضوں کی رعایت نہ تھی اور نہ مغربی تمدن کو مادی روح سے پاک کرنے کی کوئی کوشش کی گئی تھی، دوسرا پہلو یہ تھا کہ ان کا سارا زور انگریزی زبان و ادب ہی کے حصول اور اعلیٰ تعلیم پر تھا، اور عملی علوم کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی، اگرچہ یہ تحریک بڑی مؤثر اور کامیاب ثابت ہوئی اور اس کے فوائد بھی محسوس ہوئے؛ لیکن مسلمانوں کے جدید نازک ثقافتی و فکری تقاضوں کی تکمیل میں اس نے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی اس سے توقع تھی، سرسید کے ان نظریات کے مقابلہ میں اکبر

الٰہ آبادی اور علامہ اقبالؒ کے نظریات سامنے آئے۔ دین و دنیا اور قدیم و جدید کے درمیان جو خلیج حائل ہو چکی تھی اسے پاٹنے کے لئے ندوۃ العلماء کی تحریک اٹھی اور بڑی حد تک اپنے مقاصد میں کامیاب رہی اور اصول و مقاصد میں سخت اور بے لوچ اور فروع و وسائل میں وسیع اور لچک دار ثابت ہوئی۔ پاکستان کے قیام سے مغربی تہذیب کے مفاسد کے ازالہ کی جو توقعات تھیں وہ بھی پوری نہ ہوئیں۔ پاکستان کی جماعت اسلامی نے نظام اسلامی کے نفاذ پر زور دیا تھا، مگر اس کی راہ میں داخلی و خارجی مشکلات حائل ہوئیں اور بعض بے اعتدالیوں نے اس کا حلقۂ اثر و رسوخ بھی کم کر دیا۔

مصر جو عالم اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، وہاں بھی تہذیب حاضر کی تجلیات نے عقلوں اور دلوں کو مسحور اور نگاہوں کو خیرہ کیا، جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ نے اپنے خاص سیاسی و دفاعی انداز میں (بعض خامیوں اور بے اعتدالیوں کے ساتھ) جو کوشش مصر کو مغربی پنجہ سے چھڑانے کی کی، وہ زیادہ مؤثر اور دیرپا ثابت نہ ہو سکی، مصر میں آزادئ نسواں کی تحریک بھی بڑے شد و مد سے اٹھی اور بے حد مؤثر ثابت ہوئی (آج بھی بے حیائی اور عریانیت کا دلدوز منظر مصر میں دیکھنے میں آتا ہے) مستشرقین کے اثرات بھی قبول کئے جانے لگے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے مصر کو یورپ کا ایک ٹکڑا قرار دیا، اخوان کی تحریک انہیں بدترین حالات کے ردعمل میں شیخ حسن البنا شہید نے شروع کی، جس نے بہت جلد اپنی تاثیر دکھائی؛ لیکن نیشنلزم اور سوشلزم کے علم برداروں نے اس تحریک کو کچلنے میں ساری قوتیں بے دریغ صرف کر ڈالیں، پھر اس تحریک کے جلد عملی سیاست میں قدم رکھنے کی وجہ سے بھی خطرات پیدا ہوئے، بالآخر اس کے وسیع فوائد سے عالم عربی اور مصر محروم ہو گیا۔

۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد کچھ توقعات وابستہ ہوئیں؛ مگر جمال عبدالناصر نے سب پر پانی پھیر دیا، فکری ارتداد کا سلسلہ شروع ہوا، انور سادات نے بھی ناصر کی ہی کافی حد

تک پیروی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ مغربیت کے پاؤں مصر میں ایسے جم گئے کہ اب تک ہٹنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔

شام وعراق میں بھی یہی صورتِ حال ہے، ایران نے بھی ترکی کے نقش قدم پر چلنے کا کام شروع کر دیا تھا، آیت اللہ خمینی کے ذریعہ جو انقلاب آیا تھا اس میں سیاسی عناصر کارفرما تھے، ان کی اصطلاحات کی کوشش ناکام ثابت ہوئی، انڈونیشیاء میں مغربی تمدن نے اپنا اثر قائم کرلیا ہے، اس کے علاوہ نئے آزاد اسلامی ممالک بھی مغربی زدگی کے راستہ پر ہیں۔ الجزائر، لیبیا، ملیشیا، مراکش ہر جگہ مغرب کو فکری اور تہذیبی قائد ورہنما تسلیم کرلیا گیا ہے، اور اسی منزل کی طرف کارواں سرگرم سفر ہے؛ البتہ عوام کی وجہ سے ہر جگہ حکومتوں کو خطرات ہیں، عوام چوں کہ دین دار اور مذہبی ہیں، اس لئے زعماء حکومت ان کو دبانے اور کچلنے کا پورا انتظام کرتے ہیں، مغرب کے عالمگیر رجحان کا سب سے بڑا سبب اس کے نظام تعلیم کا رواج ہے، مغربی مستشرقین کے افکار وتحقیقات کے اثرات اور علوم اسلامیہ کا زوال اور علماء کا فکری اضمحلال سب مغربی تہذیب کی مقبولیت کی اہم وجوہات میں سے ہیں۔

تیسرا موقف جو اعتدال کا ہے اسے ہی اپنانے سے اِن مفاسد کو دور کیا جاسکتا ہے، امت اسلامیہ کے قائدانہ کردار کی بحالی، قانونِ اسلامی کی تدوین جدید، اسلامی نصاب ونظام تعلیم وتربیت کی تنفیذ، مادیت کی فکر سے اجتناب، مغرب سے اس کی اچھی چیزوں میں حدود کی رعایت کے ساتھ استفادہ، اسلامی تمدن کی تشکیل، حوصلہ مندی وخود اعتمادی کے ساتھ مغرب کے مفاسد کا مقابلہ، خود تہذیب جدید کی رہنمائی اور نورِ اسلام کی تابانیوں سے پورے عالم کو منور کرنے کے جذبات واقدامات ہی کے نتیجہ میں اس طوفانِ بلاخیز کی روک تھاک کی جاسکتی ہے، انہیں خطوط پر کام کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔

حضرت مولانا کے بقول سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ ”مغرب سے علم وصنعت، ٹکنالوجی

اور سائنس اور ان علوم تحقیقات میں جن کا تعلق تجربہ، واقعات وحقائق اور انسانی محنت وکاوش سے ہے، بڑی فراخ دلی کے ساتھ استفادہ کیا جائے، پھر ان کو اپنی خداداد ذہانت اور اجتہاد کے ساتھ اُن اعلیٰ مقاصد کا تابع اور خادم بنایا جائے جو آخری نبوت اور آخری صحیفہ نے ان کو عطا کئے، اور جن کی وجہ سے اُن کو خیر امت اور آخری امت کا لقب ملا ہے، وسائل ومقاصد کا یہ خوش گوار امتزاج جس سے سردست مغرب بھی محروم ہے اور مشرق بھی کہ مغرب تنہا قاہر وسائل کا سرمایہ دار ہے اور صالح مقاصد میں محض تہی دامن ہے، اور مشرق (اسلامی) صالح مقاصد کا واحد اجارہ دار ہے اور مؤثر وسائل سے یکسر محروم، مغرب کر سب کچھ سکتا ہے؛ لیکن کرنا کچھ نہیں چاہتا، اور صحیح الفاظ میں کرنا نہیں جانتا، اسلامی مشرق کرنا سب کچھ چاہتا ہے؛ لیکن کر کچھ ہیں سکتا، یہ صحت مند وصالح امتزاج دنیا کی قسمت بدل سکتا ہے اور اس کو خودکشی وخودسوزی کے راستہ سے ہٹا کر فلاحِ دارین اور سعادت ابدی کے راستہ پر ڈال سکتا ہے، یہ ایسا کارنامہ ہوگا جو تاریخ کے دھارے اور دنیا کی قسمت کو بدل کر رکھ دے گا، یہ کارنامہ وہی امت انجام دے سکتی ہے جو آخری پیغمبر کی جانشین اور اس کی تعلیمات کی حامل وامین ہے، اس بنا پر عالم اسلام کا حقیقی نعرہ جس سے اس کے دشت وجبل گونجنے چاہئیں، یہ ہیں کہ:

عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز''

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ۲۱۱-۲۱۳)

مغربی تہذیب پر مولانا نے اپنے گہرے ایمان، کتاب وسنت اور تاریخ ادیان وتمدن واقوام وملل پر اعتماد، تہذیب اسلامی کی عظمت وامتیازات پر یقین کامل کی روشنی میں بار بار تنقید کی، بارہا یورپ وامریکہ گئے اور تہذیب حاضر کے نتائج بد کا اس کے اصل مرکز ومنبع میں مشاہدہ کیا اور وہاں بھی اس مادیت، افلاس اور حیوانیت پر تیشے چلائے اور صراطِ مستقیم کی دعوت دی، مولانا نے بچشم خود اسلامی ممالک میں تہذیب مغرب کے منفی اور گندے اثرات

دیکھے اور یہ محسوس کیا کہ اسلامی ممالک میں زندگی جمود پسند اور بے سکون ہوگئی ہے، وہ روحانی قدروں سے خالی ہوگئے ہیں، تہذیب حاضر کا یہ بت اور طلسم جب تک پاش پاش نہ ہوگا، مشرق میں زندگی اور سکون واطمینان، حیاء وشرم اور اخلاقی رونق نہیں آسکتی۔

مولانا نے یورپ کے پہلے سفر میں اکتوبر ۱۹۶۳ء میں اپنے عزیز برادرزادہ مولانا محمد الحسنی مرحوم کے نام لندن سے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''شنیدہ کے مانند دیدہ۔ کسی نے صحیح کہا ہے، خوبیاں اور خامیاں مشاہدہ بن گئیں، مغربی تہذیب سے مایوسی اور بعد بڑھ گیا، اس پتھر میں جونک لگنی بڑی مشکل معلوم ہوتی ہے، دور سے بڑی خوش گمانی ہوتی ہے، یہاں تو بالکل مشینی اور مصنوعی زندگی ہے، قدرتِ الٰہی ہی کچھ انتظام کرسکتی ہے کہ یہ لوگ کسی اور بالاتر حقیقت پر غور کریں''۔ (کاروانِ زندگی ۱/۴۹۴)

پیرس سے ایک دوسرے مکتوب میں مولانا نے یورپ میں عورتوں کی حیثیت کا ذکر بھی کیا ہے۔

ایک خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

انگریزوں کی مادیت، زندگی کے انہماک، تنازع للبقاء اور خود ساختہ معیاروں اور مقاصد کے حصول کی تگ ودو نے لطیف احساسات، روحانی تشنگی اور خدا طلبی کے جذبہ کو تقریباً فنا کردیا ہے، اسی لئے اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں، قوتِ ارادی، احساسِ ذمہ داری، نظم وضبط اور بہت سی خوبیوں کے باوجود صحیح روحانی تحریکوں اور دینی وروحانی فتوحات سے محروم ہیں، اور ماہرین فن کی یہ سرزمین جس نے دنیا کا نقشہ اور زندگی کا دھارا بدل دیا، ''عارفین'' سے خالی ہے، شاید اسی بنا پر مغرب کے رمز شناس اقبال نے کہا تھا:

ع: یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی

اور ان کی فطرتِ سلیم نے کچھ دن ان فرنگی ساحروں کے درمیان رہنے کے بعد اس طرح احتجاج کیا:

نشستم بانکویان فرنگی

ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

رہی سہی فطرت کی سلامتی اور نفس لوامہ کی سرزنش خمر وخنزیر نے ختم کردی، یہاں چند دن رہ کر جماع الاثم کی حرمت کی حکمت (جس پر الحمدللہ ایمان بالغیب اور شرحِ صدر ہمیشہ تھا) عین الیقین بن گئی۔ (کاروانِ زندگی ۱/۴۹۴-۴۹۵)

۱۹۵۰ء میں دوسرے سفرِ حج کے موقع پر مولانا نے حجاز میں مغربی تہذیب کے اثرات پھیلتے دیکھے اور یہ محسوس کیا کہ عرب ممالک کو یہ تہذیب پوری طرح مفلوج کرچکی ہے، اس موقع پر مولانا کے دل کا درد اس مکتوب میں الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوا، جو انہوں نے اپنے برادر بزرگ اور مربی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے نام تحریر فرمایا۔ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء میں ہم پہلی بار یہاں آئے تھے، اب ۱۹۵۰ء میں آئے ہیں، تین برسوں میں کھوا ہوا تغیر محسوس ہوتا ہے، بازار سے لے کر لوگوں کے دماغوں تک مغربی تمدن، تجارت، معاشیات اور افکار وخیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، کوئی نہیں جانتا، خوبصورت عربی لباس میں کتنے دل ودماغ خالص مغربی بن چکے ہیں اور قرآنی زبان کتنے مغربی خیالات اور خالص مادی تخیلات کا ذریعہ اظہار بنتی ہے، معاش کا انہماک، دولت آفرینی کی عادت بحرانی حد تک پہنچ چکی ہے، زندگی کا تصور اس کے بغیر ان کے نزدیک ممکن نہیں کہ اس کے سایہ میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے، عالم اسلام کا قبلہ مکہ معظّمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکز اسلام کا قبلہ سردست امریکہ ہے، وبائے عام کی طرح اس کا اثر فضا اور ہوا میں ہے، اس کے مقابلہ میں ہماری حقیر کوشش، چند کتابیں، چند ملاقاتیں، جماعتوں کے گشت اور نقل وحرکت بالکل وہی حیثیت رکھتی ہے، جو کسی سمندر میں ٹھیکریاں پھینکنے سے ہلکے تموج کی حیثیت ہوتی ہے''۔

(کاروانِ زندگی ۱/۳۵۹)

جے پور میں رابطۂ ادب اسلامی کے ایک سیمینار میں جون ۱۹۸۶ء میں مولانا نے مغرب کے فکر وفلسفہ پر ناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''مغرب کی بے راہ رویوں، خامیوں اور نارسائیوں کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب ہے، نورِ نبوت سے محرومی، نبوت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو ظن وتخمین سے نکال کر یقین تک پہنچاتی ہے، اور مغرب اپنی تمام تر ترقیات اور تمام فتوحات کے باوجود اس پورے سفر میں نورِ نبوت سے محروم رہا، قرآنِ مجید کی دو آیتیں پڑھتا ہوں جن میں مغرب کی صاف تصویر نظر آتی ہے اور ان میں مغربی ذہن کی نقاب کشائی کی گئی ہے:

بل ادّٰرک علمھم فی الآخرۃ بل ھم فی شک منھا بل ھم منھا عمون.

ترجمہ: بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے؛ بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں؛ بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں۔

قرآنِ کریم کی بلاغت اور اس کے اعجاز سے معذرت کے ساتھ میں ﴿**بل ادرک علمھم فی الآخرۃ**﴾ کا ترجمہ کرتا ہوں کہ آخرت کے بارے میں ان کا علم پنکچر ہو گیا، مجھے مغرب کی صورتِ حال اور اس کے علمی واختراعاتی سفر کی اس سے بہتر تشبیہ نظر نہیں آتی کہ جیسے کوئی کار چل رہی ہو اور اچانک اس میں کوئی ایسا نقص پیدا ہو جائے کہ اس کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں، اس کے لئے پنکچر سے بہتر کوئی لفظ نہیں۔ دوسری آیت یہ ہے:

بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یأتھم تاویلہ.

ترجمہ: اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا اس کو انہوں نے جھٹلا دیا۔

مغرب کی یہ خام خیالی ہے کہ جو مشہود نہیں وہ موجود نہیں، موجودات کو مشہودات میں محدود کرنا علم انسانی اور عقل انسانی کی شدید کمزوری ہے، جسے مغرب نے علمی رنگ دے دیا ہے، اور یہ انسان کی بڑی بدقسمتی ہے، انسانیت کے حق میں زیادتی ہے، اور فیض الٰہی سے محروم علم اور نبوت میں یہی فرق ہے''۔ (کاروانِ زندگی ۳/۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴ مختصراً)

مغربی تہذیب وافکار کے سلسلہ میں حضرت مولانا کے احساسات اور موقف کی مزید مکمل تفصیل ان کی معرکۃ الآراء کتاب ''**الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ فی الأقطار الإسلامیۃ**'' (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش)

میں پورے اعداد وشمار کے ساتھ موجود ہے، اس موضوع پر مولانا کے بہت سے رسائل، خطبات، محاضرات اور کتابیں ہیں، جن میں "**الاسلام والحضارة الاسلامية، واقع العالم الاسلامي، حاجة البشرية الى معرفة صحيحة ومجتمع اسلامي، الحضارة الغربية الوافدة وامرها فى الجيل المثقف، الأمة الإسلامية وحدتها ووسطيتها وآفاق المستقبل، ردة ولا أبابكر لها**" اسلام اور مغرب اور معرکۂ ایمان ومادیت وغیرہ سرفہرست ہیں۔

عرب قومیت، فکری وذہنی ارتداد، اشتراکیت، استشراق، مسئلہ فلسطین، خلیجی جنگ اور مغربی تہذیب جیسے تمام اہم نازک معاملات میں مولانا کے ایمانی موقف اور نظریات واحساسات کا ذکر قدرے تفصیل سے آ گیا ہے، اس کے علاوہ برصغیر خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے تمام ملی، ملکی، قومی اور مذہبی مسائل میں مولانا کا موقف اور اقدامات ایک تفصیلی موضوع ہے جس کے چند اہم گوشے آپ پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر استفادہ: "**الصراع بين الفكرة الإسلامية والفكرة الغربية**" سے کیا گیا ہے۔

اسلامی بیداری میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی

خدمات وخیالات

اسلامی بیداری (صحوۃ اسلامیۃ) کی کوششیں ایک لمبے عرصہ سے عالم عرب اور عالم اسلام میں ہورہی ہیں، ایک طویل غفلت اور بدمستی کے بعد یہ کام شروع ہو پایا ہے، ایک وسیع وعریض مندت ایسی بھی گذری ہے اور اس کے اثرات آج بھی ہیں، جس میں دین ومذہب اور دین دار حلقوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے، دین کو پسماندگی اور جمود کا داعی قرار دے کر سیکولر افکار اور مغرب کے سارے اچھے برے مناہج، طریقوں اور وسائل کو اختیار کرنے کی دعوت بڑے جوش وخروش سے دی جاتی رہی ہے۔ مغربیت کے ان پجاریوں اور سیکولرزم کے ان غلاموں کے مقابلہ میں دین دار، شعائر اسلام کا محافظ اور داعیٔ اسلام طبقہ نظر آتا ہے؛ لیکن اس میں فکری جمود، باہمی اختلاف اور رسہ کشی اور صرف زبانی دعوے اور جذبات (جن کو عملی حرکت ودعوت میں بدلنے کی ضرورت تھی) کا کافی عمل دخل پایا جارہا تھا، پھر مغربی تہذیب کے سلسلہ میں اُن کا موقف انتہائی سلبی اور مکمل دوری وبیزاری کا تھا، جو کسی بھی طرح اعتدال کا موقف نہیں ہوسکتا، اور جس کے خطرات کی تفصیلی نشان دہی گذشتہ مضمون میں آچکی ہے۔

ایسے ماحول میں اسلامی بیداری کی مہم شروع ہوئی جو دراصل ان افراد کی فکر پر ایک زبردست تازیانہ ثابت ہوئی، جو یہ باور کئے بیٹھے تھے کہ اسلام اب آخری سانس لے رہا ہے، اور دم توڑنے کو ہے۔ اسلامی بیداری کی یہ تحریک پورے عالم میں مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لینے اور سلجھانے کی کوششیں انجام دیتی رہی اور مشرق ومغرب ہر جگہ اس کے اچھے

اثرات محسوس کئے گئے، ضرورت یہ تھی کہ بیداری کی یہ مہم صائب الرائے، سلیم الطبع اور صحیح الفکر علماء ومفکرین کی رہنمائی میں اپنا سفر طے کرے، ان کے تجربات ومشاہدات اور معلومات سے استفادہ کرے، اور تعمیری ومثبت تنقید پر اسے کوئی کبیدہ خاطری نہ ہو، اسی لئے علماء کرام اور مفکرین کے ایک وسیع حلقہ نے اپنے اپنے اثر ورسوخ اور طریقۂ کار سے اسلامی بیداری کی ذمہ داریاں بڑے انہماک سے انجام دیں، اپنے افکار پیش کئے اور عملی اقدامات بھی کئے، چناں چہ اس کے خوش کن نتائج سامنے آئے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ اس طبقہ کی صف اول کے سرفہرست اور نمایاں لوگوں میں شامل ہیں، مولانا نے اس بیداری کے شعلوں میں اشتعال اور دلوں میں حرارت وولولہ پیدا کیا ہے، اس صدی کے مفکرین اور داعیان میں شیخ حسن البناء شہید، مفتی محمد عبدہ، امیر عبدہ، امیر عبدالکریم خطابی، شیخ بن باز، شیخ محمد الغزالی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر محمد اقبال، سید قطب شہید، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، شیخ عبدالقادر عودہ، شیخ محمد ابوزہرہ، شیخ علی طنطاوی، شیخ یوسف قرضاوی جیسے بلند پایہ افراد نے اسلام کی صحیح ترجمانی، سچا شعور بیدار کرنے، اسلامی بیداری کو عام کرنے اور فروغ دینے، امت کو متحد اور جمع کرنے، ملت کے تشخص کی حفاظت اور مغربیت وفکری ارتداد سے اسلام اور مسلمانوں کو متنبہ کرنے اور بچانے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں کا رول اس میں بہت ہی نمایاں ہے، انہوں نے اپنے خطبات ومقالات، مضامین ومحاضرات، مکاتیب ورسائل اور تصنیفات وتالیفات کے راستہ سے اسلامی بیداری کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، اس کی نظیر پیش کرنی مشکل ہے، ان کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ پورے عالم میں پھیلایا، اس عالمیت اور آفاقیت میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں ملتا۔

اسلامی بیداری کے احیاء میں مولانا نے ہمیشہ اقدامی اور جرأت مندانہ اور حقیقت پسندانہ موقف اپنایا ہے، اس میں کہیں بھی مدافعت، بزدلی اور حقائق سے انحراف کا تصور نہیں ملتا، جو ان کی کتابوں اور اسفار کی تفصیلات سے بڑی حد تک نمایاں ہے۔

مولانا نے صرف اس بیداری میں حصہ ہی نہیں لیا؛ بلکہ اس بیداری کے کاروانِ تیز رَو کا جائزہ لیتے اور نگرانی بھی کرتے رہے، ہر موڑ پر اُسے صحیح خطوط ونقوش پر چلنے کی راہ دکھائی اور جادۂ حق اور راہِ اعتدال سے سرمو بھی انحراف انہیں گوارا نہ ہوا، چوں کہ مولانا ایک عرصہ تک دینی، دعوتی واصلاحی تحریکات کا مطالعہ کرتے رہے اور متعدد تحریکوں کو بڑے قریب سے دیکھا، بعض تحریکات کے قائدین وعاملین کے ساتھ ان کے گہرے مراسم اور مخلصانہ تعلقات بھی رہے، ان کو ان کا اعتماد حاصل رہا، مولانا ان تحریکات کی خوبیوں اور خامیوں سے آشنا رہے، اور خوبیوں کے اعتراف وستائش اور خامیوں کی نشان دہی اور دعوتِ اصلاح میں مولانا کا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹا، اسی لئے مولانا اسلامی بیداری کو صحیح رخ دینے، دینی واصلاحی کوششوں کو بیش از بیش مفید اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے اپنے خیر خواہانہ مشورے اور آراء ہمیشہ دیتے رہے، مولانا کی کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں مولانا نے جماعت اسلامی کے قائد اور مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بعض ان تحریروں اور طریقۂ کار کا خیر خواہانہ جائزہ لیا اور نقد کیا ہے، جو موقف اعتدال سے ہٹی ہوئیں اور ان کی نگاہ میں امت کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی تھیں۔

ہر ہر مرحلہ پر مولانا نے اسلامی بیداری کی تحریکات اور کارکنان کے ساتھ خیر خواہانہ تعاون ونصیحت، مثبت، تعمیری اور حکمت پسندانہ تنقید، شیرازہ بندی اور خلیج پاٹنے کی کوشش، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام اختلافات اور نفسانی خواہشات پر ضبط اور کنٹرول کرنے کی دعوت کا کام انجام دیا ہے۔

اسلامی بیداری کے سلسلہ میں مولانا کے بعض افکار وآراء کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا نے نومبر ۱۹۸۸ء میں ابوظہبی کے ایک اجلاس میں ''اسلامی بیداری کے رہنما اصول'' کے موضوع پر اپنے خطاب میں فرمایا:

''آج کے زمانہ کو اسلامی دعوت وبیداری کی حاجت دوسرے زمانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے؛ کیوں کہ آج کا دور شہواتِ نفسانی اور شکوک وشبہات ذہنی کا دور ہے، اسلام سے دور ونامانوس فلسفوں اور افکار ونظریات کا زمانہ ہے، ہمارے آج کے زمانہ میں اسلامی بیداری کی ضرورت کہیں بڑھ گئی ہے، اور اس کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے، دنیا کے کسی ملک میں بھی یہ بیداری پیدا ہو، ہمیں اس سے ہم دردی ہے، ہم اس کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں؛ لیکن یہ ہمدردی ہمیں اس بات سے نہیں روکتی کہ تعمیری نقطۂ نظر سے اس کا تنقیدی جائزہ لیں، خیر وصلاح کے معیار پر پرکھیں اور اسلامی عقائد کی کسوٹی پر کس کو دیکھیں، پھر اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کریں اور صحیح فیصلہ کریں''۔ (اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر، بقلم: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۱۴، ترجمہ: ترشید الصحوۃ الاسلامیۃ، اردو ترجمہ بقلم: مولانا نور عظیم ندویؒ)

اس موقع پر مولانا نے اسلامی تحریکات میں حصہ لینے والوں کے لئے حسب ذیل پہلوؤں اور گوشوں کی اہمیت بھی واضح کی۔

(۱) اسلامی عقائد کے ساتھ کامل ہم آہنگی

اسلامی بیداری اور اسلامی دعوت کی صحت وسلامتی کے لئے اور اسے قابل اعتماد ولائق احترام اور ہر طرح حفاظت ومدافعت کا مستحق بنانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ یہ دعوت وبیداری قرآن وحدیث پر مبنی عقائد سے مکمل مطابقت رکھتی ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کے اسوہ وعمل، ماہرین دین وشریعت کے علم وفہم اور جمہور امت کے عقائد سے ہم آہنگ ہو، ایسا نہ ہو کہ سیاسی دھاروں اور وقتی رجحانات کے رخ

پر بہنے لگے یا محدود مقامی حالات کا ردعمل، سیاسی غلبہ واستیلاء کی کوشش اور اسلامی حکومت کے قیام کے خالی دعوؤں تک محدود ہو، نوجوان آنکھ بند کر کے اس کا استقبال کرنے لگیں اور اس کی حمایت ومدافعت کے جوش میں اس دعوت وتحریک کے سربراہوں کے عقائد کی تحقیق کی بھی ضرورت نہ سمجھیں، متفق علیہ اسلامی عقائد سے ان کے انحراف اور بسا اوقات ان مسلمہ عقائد سے تضاد کو بھی نظر انداز کر جائیں۔ (اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر، بقلم: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۱۵)

(۲) دینیات کے وسیع مطالعہ کی ضرورت

اسلامی بیداری کی صحت وافادیت کے لئے دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ یہ بیداری (امکانی حد تک) قرآن وحدیث کے فہم وادراک سے یکسر عاری اور اس کی ضرورت کی منکر نہ ہو، دینی مطالعات میں کسی حد تک وسعت بھی ہو اور گہرائی بھی، یہ ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں (جن کی تعداد بیداری کی ان تحریکوں میں روز بروز بڑھتی جارہی ہے) کی ذہنی وفکری تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے، ان کے لئے صالح اور طاقت ور فکری غذا فراہم کی جائے، جو ان کی عقل وفکر کے نہاں خانوں کو منور کر دے اور اس ایمان ویقین کو دوبارہ مستحکم کر دے کہ اسلام ہی قیامت کی اور زندگی کے مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر، بقلم: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۱۶-۱۷)

(۳) غیر ضروری مسائل ومشکلات سے اجتناب کی ضرورت

اسلامی دعوت کی افادیت اور نتیجہ خیزی کو باقی رکھنے کی تیسری شرط یہ ہے کہ دعوت وتحریک ایجابی (مثبت) ہو، وہ خالص سلبی بن کر نہ رہ جائے کہ حکومت یا قوت ووسائل سے مسلح افراد وعناصر سے پہلے ہی مرحلہ میں ٹکرانے لگے، اپنے لئے مسائل ومشکلات پیدا کرنے لگے، اپنی ساری قوت وصلاحیت اسی ٹکراؤ میں ضائع کر دے اور اپنے بے شمار دشمن

وحریف پیدا کرے، بے محل جدوجہد کرے اور بغیر دشمن کے جنگ کرتی رہے، اس کے مقابلہ میں چاہئے یہ کہ دعوت سلبی سے زیادہ ایجابی ہو، اس نقطۂ نظر سے کام کرے کہ ایمان کو برسر اقتدار لوگوں تک پہنچانا ہے، انہیں کے ہاتھ میں اسلام کا جھنڈا دینا ہے اور انہیں سے اسلامی نظام کو نافذ کرانا ہے، یہ مطمح نظر صحیح نہیں کہ کسی خاص اسلامی اصلاحی تحریک کو اقتدار تک پہنچانے کی کوشش کی جائے یا نظام اسلامی کی تنفیذ اور معاشرہ میں انقلاب کا حق کسی خاص جماعت کے افراد یا کچھ داعیوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے، مجھے اسلام میں اصلاح وتجدید کی طویل تاریخ میں کوئی بھی مثال کوئی تحریک جس کو حیرت انگیز کامیابی ملی ہو یا کوئی مصلح حالات میں انقلاب لانے، تاریخ کا رخ موڑنے اور اسے نئی راہ اختیار کرنے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہوا ہو، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (م ۱۰۳۴ھ) جیسی نہیں ملتی۔ (اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر، بقلم: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۳۰-۳۱)

(۴) جاہ ومنصب سے بے نیازی

اسلامی دعوت اور اسلامی بیداری کے لئے چوتھا ضروری عنصر یہ ہے کہ اس کے قائدین میں جاہ ومنصب اور عیش وعشرت کی زندگی اور جاہ ومنصب والوں کو اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں، ان میں ان کی ریس سے بڑی حد تک دور رہیں اور شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے (بغیر رہبانیت اور غلو کے) اپنی استطاعت بھر زہد وقناعت اور توکل کی صفات اپنے اندر پیدا کریں اور سلف صالحین اور اصحابِ عزیمت کے نقش قدم پر زندگی گذارنے کی کوشش کریں۔ تاریخ اسلامی میں ہمیں زہد وقناعت اور تجدید واصلاح کی کوششیں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں، طویل اسلامی تاریخ میں جن شخصیتوں نے زمانہ کی رفتار بدل دی، تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا، اسلامی معاشرہ میں نئی روح پھونک دی، اسلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، علم، فکر اور دین کے میدانوں میں ناقابل فراموش ورثہ چھوڑا، جو صدیوں تک ذہن وفکر کو

متأثر کرتے رہے، اور علم وادب کی دنیا میں جن کا سلسلہ چلتا رہا، وہ ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جن میں زہد تھا، دنیا سے بے رغبتی تھی، قناعت تھی، جنہوں نے نفس کی خواہشات پر قابو حاصل کرلیا تھا، مادی دولت اور اربابِ دولت وثروت واصحابِ جاہ وحشم کی کشش ان کی نگاہوں میں ختم ہوگئی تھی، غالباً اس کا راز یہ ہے کہ دنیا سے بے نیازی، قناعت اور زہد انسان کے اندر باطنی قوت اور عقیدہ وکردار کی اہمیت پیدا کردیتا ہے، مادی دولت میں ڈوبے ہوئیانسانوں، معدہ کے گرفتار اور شہوت کے شکار افراد کی قدر وقیمت ان کی نگاہوں میں گر جاتی ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کا منصب ہے اور رسول اللہ سے کہا گیا تھا:

ولا تمدن عینیک الی ما متعنا به ازواجاً منهم زهرة الحیاة الدنیا لنفتنهم فیه ورزق ربک خیر وابقیٰ.

ترجمہ: اور ہرگز آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے گروہوں کو متمتع کررکھا ہے، ان کی آزمائش کے لئے کہ وہ محض دنیوی زندگی کی رونق ہے، اور آپ کے پروردگار کا عطیہ کہیں بہتر اور دیرپا ہے۔

جن اشخاص کو اللہ تعالیٰ اس عظیم کام کے لئے منتخب کرتا ہے یا جو لوگ اپنے آپ کو اس کے لئے پیش کرتے ہیں اور اس اہم منصب کی تمنا کرتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا دستور یہی ہے اور اللہ کا دستور بدلا نہیں کرتا۔

(اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر، بقلم: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۳۴-تا-۳۷)

(۵) جرأت وشجاعت اور قربانی کا جذبہ وشوق

اسی بیداری کے لئے پانچواں لازمی عنصر یہ ہے کہ دعوت کے ساتھ جرأت وشجاعت کی روح اور صبر واستقلال اور قربانی کا جذبہ وشوق بھی وابستہ ہو، اگر حالات کا تقاضا ہو تو خطرات میں کود پڑنے کی ہمت اور طاقت بھی رہنی چاہئے۔ (اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر، بقلم:

مولانا کے ان افکار وتجاویز میں ان کے طالع کی ارجمندی، ذہن وفکر کی وسعت اور بلندی، اسلام کی سربلندی کا جذبۂ بے پناہ، عجیب وغریب ایمانی قوت واعتماد، فراست وبصیرت، دوراندیشی وحکمت اورزمانہ کی نبض شناسی کے جوہر گرانمایہ کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں "**ترشید الصحوة الاسلامية**" کے ساتھ کاروانِ زندگی حصہ چہارم اور جریدہ "**المجتمع**" کویت شمارہ ٦ ررمضان المبارک ۱۴۲۰ھ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

عالم عرب کی تحریکات، اداروں اور شخصیات سے

حضرت مولانا کا ربط وتعلق

رابطۂ عالم اسلامی

اشتراکی نظریات کا جو طوفان تند وتیز مصر کے سیاہ وسفید کے مالک اور اشتراکیت کے سب سے بڑے علم بردار نمائندہ جمال عبدالناصر کی نمائندگی ورہبری میں حملہ آور ہورہا تھا، اس کا مقابلہ مغربی مفکرین کے ہاں بھی اسلام کے سوا کسی اور ذریعہ سے ناممکن تھا؛ کیوں کہ اسلام مذہب وسیاست دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں میں مذہب کا عمل دخل دیکھنا چاہتا ہے، اس دیو استبداد کے مقابلہ کے لئے اگر کوئی مؤثر شخص سامنے آیا تو وہ تھے ''شاہ فیصل شہید''، جن کی زیر قیادت سعودی عرب نے اتحاد اسلامی کے تصور کے پیش نظر ناصری اشتراکیت کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۹۶۲ء میں حج کے موقع پر سعودی عرب نے عالم اسلام کے علماء، اہل خرد ودانش اور اربابِ بصیرت وسیاست کو اتحاد اسلامی کے امکانات پر غور کرنے کے لئے مکہ معظّمہ میں مدعو کیا، تو اس میں بڑی تعداد اکٹھا ہوئی اور حج کے بعد علماء ودانشوروں کے سامنے ۱۸ رمئی ۱۹۶۲ء کو رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا، یوں تو اس اجتماع کا اس وقت یہی مقصد تھا کہ امت مسلمہ کو غیر مذہبی اشتراکی عناصر کی وجہ سے پیش آمدہ مسائل پر بحث کی جائے، مگر بعد میں رابطہ ایک بین الاقوامی اسلامی تنظیم کی شکل میں سامنے آیا، جسے مسلمانوں کی عوامی وثقافتی تنظیم کا نام دیا گیا، رابطہ کا صدر دفتر مکہ معظّمہ میں طے پایا اور مجلس تاسیسی کا قیام عمل میں آیا، مجلس تاسیسی کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۹۶۲ء میں ہوا، جس میں یہ طے ہوا کہ رابطہ پر حجازی علماء ہی غالب رہیں گے؛ البتہ ارکانِ تاسیسی میں ہندوستان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، پاکستان سے مولانا سید

ابوالاعلیٰ مودودی اور مصر سے ڈاکٹر سعید رمضان جیسی بیرونی مؤثر شخصیات بھی شامل ہوئیں۔

رابطہ کے پہلے اجلاس میں مولانا علی میاںؒ نے اپنا گراں قدر مضمون ''الاخوۃ الاسلامیۃ فوق العصبیات'' پڑھا، جو قدر وستائش کی نگاہ سے دیکھا گیا، اس کے بعد رابطہ کے اجلاس میں ہر سال اور بسا اوقات سال میں دو بار شرکت ہونے لگی اور بار بار حرمین میں حاضری کا مبارک موقع میسر آنے لگا، رابطہ کی مجلس تاسیسی کے علاوہ اس کے زیر انتظام ''المجلس العالمی للمساجد'' اور ''المجمع الفقھی'' کے بھی مولانا رکن منتخب ہوئے، رابطہ کے تمام جلسوں میں مولانا کو بڑی اہمیت دی گئی، رابطہ کے سرپرست وصدر شیخ بن باز مرحوم، جنرل سکریٹری شیخ محمد سرور الصبان، شیخ صالح قزاز، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، شیخ صالح العبید وغیرہ نیز دیگر تمام ارکان (جن میں نائب جنرل سکریٹری شیخ محمد ناصر العبودی سرفہرست ہیں) کا مولانا سے بڑا گہرا تعلق تھا، اکثر مولانا کو ''کلمۃ الوفود'' پیش کرنے یک ذمہ داری دی جاتی تھی۔

رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹریٹ نے ۱۹۷۳ء میں چھ مسلم ممالک کا دورہ کرنے کے لئے ایک مؤقر وفد بھیجنا طے کیا، جس کا مقصد مسلمانوں کے حالات وکیفیات، ان کے علمی وتہذیبی اداروں اور ان کی ضرورتوں سے واقفیت بہم پہنچانا اور وہاں کے باشندوں کو رابطہ کے مقصد وپیام سے آگاہ کرنا تھا، اس وفد کا قائد حضرت مولانا کو بنایا گیا، اس وفد نے افغانستان، ایران، لبنان، شرق اردن، شام وعراق کا دورہ کیا، جو ۴؍جون ۱۹۷۳ء سے ۲۰؍اگست ۱۹۷۳ء کے درمیان ہوا، اس کی پوری تفصیل مولانا کے سفرنامہ ''من نھر کابل الی نھر الیرموک'' (دریائے کابل سے دریائے یرموک تک) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جولائی ۱۹۷۸ء میں رابطہ کی پہلی ایشیائی کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی، جس کا افتتاح صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے کیا، مسٹر اے کے بروہی وزیر قانون واسلامی امور

پاکستان صدر اجلاس رہے، اور مولانا کو مع دو رفقاء نائب صدر منتخب کیا گیا، یہ کانفرنس اپنے شرکاء کی کثرت وتنوع اور حسن انتظام کے لحاظ سے بے حد کامیاب تھی، آخری اجلاس کا آخری خطاب مولانا کے ذمہ تھا، مولانا نے نہایت بصیرت افروز اور ولولہ خیز خطاب فرمایا، جس میں حضرت صدیق اکبرؓ کے تاریخی جملہ: ''أینقص الدین وأنا حی'' (کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی قطع وبرید ہوسکتی ہے؟) کو اساس بنا کر گفتگو ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں رابطۂ عالم اسلامی کے زیر اہتمام ایک مؤتمر اسلامی کا انعقاد مکہ مکرمہ میں ہوا، حرم کا نامبارک حادثہ (جو ۶ رذی الحجہ کو ایرانیوں کی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ تھا) اس کانفرنس کے انعقاد کا پیش خیمہ تھا، مولانا نے اس کے دوسرے اجلاس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی حرمت کے موضوع پر خطاب کیا، اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (اس میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے) سے اپنے خطاب کا آغاز فرمایا، کانفرنس کے چوتھے دن مولانا نے اپنا ایک قیمتی مضمون: ''القرن الخامس عشر الهجری فی ضوء الواقع والتاریخ'' (پندرہویں صدی ہجری ماضی وحال کے آئینہ میں) کے عنوان سے پیش کیا، جس میں ممالک عربیہ خصوصاً حجاز کی موجود صورتِ حال، حقائق اور پیش نظر خطرات کی طرف کھل کر توجہ دلائی گئی تھی۔ آخری اجلاس میں مولانا نے ''کلمة الوفود'' بھی پیش کیا، اس موقع پر ''المجمع الفقهی'' کے جلاس میں بھی مولانا شریک ہوئے۔ ستمبر ۱۹۹۰ء میں رابطہ نے خلیج کے حالات، عراقی مظالم اور مملکت سعودیہ عربیہ کے سلسلہ میں اس کے خطرات واثرات کے پیش نظر ایک عالمی کانفرنس منعقد کی، اس میں پورے عالم اسلام کے نمائندے بڑی تعداد میں شریک ہوئے، مولانا نے پہلے اجلاس میں اپنا وقیع مقالہ ''المأساة الأخیرة فی العالم العربی'' (عالم عربی کا تازہ المیہ) پیش کیا، یہ مقالہ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی کئی بار نشر ہوا، آخر اجلاس میں

بھی مولانا کا خطاب ہوا، جس میں مولانا نے حاضرین کو اعتماد و یقین بحال کر کے عزم نو کے ساتھ میدان عمل میں آنے کی دعوت دی، یہ خطاب بہت غور سے سنا گیا۔

ستمبر ۱۹۹۴ء میں رابطہ کی طرف سے ایک اجلاس منعقد ہوا، جو قاہرہ میں آبادی اور انسانی ترقی کے موضوع پر ہوئی کانفرنس کی اسلام مخالف تجاویز کے ردعمل میں بلایا گیا تھا، مولانا نے موضوع کی مناسبت سے بڑا ایمان افروز اور حقیقت پسندانہ خطاب فرمایا۔

اوائل جنوری ۱۹۹۶ء میں رابطہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، مولانا نے اس میں بھی شرکت کی اور آخری اجلاس میں خطاب فرمایا، جس میں آیت قرآنی: ﴿والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر﴾ (جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا) کو موضوع بنا کر گفتگو کی۔

اسی سال دسمبر ۱۹۹۶ء میں پھر رابطہ کے ایک اجلاس میں حجاز تشریف لے گئے اور مساجد کی اہمیت وحقوق کے موضوع پر خطاب فرمایا، اسی سفر میں مولانا کو کلید کعبہ دے کر بیت اللہ کا دروازہ کھولنے کی پیش کش کی گئی جو بہت بڑی عزت افزائی تھی اور کسی ہندوستانی عالم کا پہلی بار یہ اعزاز تھا۔ دسمبر ۱۹۹۷ء میں بھی مولانا رابطہ کے اجلاس میں تشریف لے گئے اور بہت اہم خطاب کیا جس میں وقت کے اہم خطرناک اور اسلام کے خلاف اغیار کے منصوبوں کا ذکر کیا اور ان کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔

یہ رابطہ کے چند اہم جلسوں کا ذکر ہے، رابطہ عالم اسلامی کے اسٹیج سے مولانا نے اپنی دعوت، فکر اور موقف بے خطر پیش کیا، مولانا کو اس کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ رابطہ فعال نہیں رہا اور اس کا دائرۂ عمل بہت تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

رابطہ عالم اسلامی کے علاوہ مولانا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ (قائم شدہ ۱۹۶۲ء) کی

مجلس شوریٰ کے بھی شروع سے ممبر رہے، یہ مجلس ۱۹۹۷ء تک باقی رہی، پھر نامعلوم اسباب کی وجہ سے ختم کردی گئی، اس کے جلسوں میں مولانا مستقل شریک ہوتے رہے، جامعہ اسلامیہ میں مولانا کو تدریس کی بھی دعوت دی گئی، مگر مولانا نے اس سے معذرت کرلی (اس سے قبل ۱۹۵۶ء میں جامعہ دمشق کے ''کلیۃ الشریعۃ'' کے قیام کے بعد بھی ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی عمید الکلیۃ نے تدریس کی دعوت دی تھی، اس وقت بھی مولانا نے عذر کرلیا تھا؛ البتہ استاذ زائر کی حیثیت سے متعدد محاضرات دئے تھے جو تجدید ومجددین سے متعلق تھے اور یہی ''رجال الفکر والدعوۃ'' (تاریخ دعوت وعزیمت) کی تصنیف کا پیش خیمہ ثابت ہوئے) البتہ ۱۹۶۳ء میں مولانا نے دو ماہ کے لئے استاذ زائر کی حیثیت سے لکچر دینا شروع کیا جس کا عنوان ''النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن'' (منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین) تھا، کل آٹھ لکچرس ہوئے جو بہت مقبول ہوئے۔

تحریک اخوان المسلمین

تحریک اخوان اور اس کے بانی شیخ حسن البناء شہید اور ان کے طریق کار اور طریقۂ فکر سے مولانا بہت متأثر تھے، اور تحریک اخوان کی سرگرمیوں اور نظریات نیز اس کے ردعمل میں مصر کی جمال عبدالناصر کی حکومت کے ظالمانہ موقف سے بخوبی آشنا اور واقف تھے، انہوں نے اپنی ایمانی فراست وبصیرت سے یہ سمجھ لیا تھا کہ ناصری حکومت کا موقف جابرانہ ہے اور یہ ساری کارروائیاں مغرب کے اشارے پر ہیں، مغرب پرستی نے عقل ودانش اور شعور وخرد سے اُسے بیگانہ کردیا ہے، جب کہ اخوان نے اسلام کے نظام کو واپس لانے کے لئے جو کوششیں کیں اور جو قربانیاں دیں انھیں ہرگز بھلایا نہیں جاسکتا۔

شیخ حسن البناء شہید سے تو مولانا کی ملاقات نہ ہوسکی، ان کی شہادت ۱۹۴۹ء ہی میں ہوچکی تھی، ۱۹۵۱ء میں مولانا نے مصر کا دورہ کیا اس وقت شیخ حسن البناء کے تمام قدیم رفقاء

وشرکاء موجود تھے، مولانا کی شہرۂ آفاق تصنیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' اخوان کے حلقہ میں بہت معروف ومقبول ہوچکی تھی اور اخوان نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلاکسی تعصب کے اسے اپنے مخصوص تبلیغی لٹریچر میں شامل کرلیا تھا، یہ کتاب اسی سفر میں ہر جگہ مولانا کے لئے تعارف کا ذریعہ بنتی رہی، مولانا نے شیخ کے والد شیخ احمد عبدالرحمٰن البناء سے ملاقات کی اور شیخ حسن البناء کے بارے میں کافی معلومات حاصل کیں، اخوان کے ایک مشہور رہنما استاذ بہی خولی سے بھی ملاقات ہوئی، دیگر اخوانی پرجوش کارکنوں میں شیخ صالح عشماوی ''مدیر الدعوۃ'' استاذ عبدالحکیم عابدین، ڈاکٹر سعید رمضان وغیرہ سے بھی ملنا ہوا، خیالات وافکار کا تبادلہ بھی ہوا، اخوان کے عام اجتماعات پر اس وقت پابندی عائد تھی، مولانا ان کے مخصوص جلسوں میں شریک ہوتے، ایک بار مولانا کو تقریر کی شکل میں بھی اپنے خیالات وافکار پیش کرنے کا موقع ملا، یہ تقریر ''اريد أن أتحدث إلى الإخوان'' کے نام سے طبع ہوئی۔

اس دوران مولانا نے اخوانی لٹریچر کے سب سے بڑے مصنف شیخ محمد الغزالی کے ہمراہ مصر کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور ہر جگہ اخوان کے جوش وضیافت، محبت واخلاص اور اخلاق اور فراخ دلی سے متأثر ہوئے، اسی موقع پر شام کے سفر میں بھی مولانا اخوان کے دفتر گئے، شامی اخوان کے نگرانِ عام ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی سے مولانا کے بڑے گہرے روابط بھی رہے، انھیں کی دعوت پر ۱۹۵۶ء میں مولانا نے دمشق یونیورسٹی میں لکچرس دئے۔

اخوانیوں سے خطاب کا مولانا کو بارہا موقع ملا، جولائی ۱۹۵۶ء میں دمشق سے واپسی پر مولانا بغداد میں رکے تو اس مختصر سے قیام کے دوران اخوانیوں کے اصرار اور تعلق کے پیش نظر اخوان کے دفتر میں تشریف لے گئے، اور ''أزمة إيمان وأخلاق'' (اصل بحران صرف ایمان واخلاق کا ہے) کے عنوان سے خطاب کیا۔

اخوان کے جن پہلوؤں سے مولانا متأثر ہوئے ان میں اس تحریک کی قوت عمل،

جذبۂ سرفروشی، محبت وگرم جوشی، باہمی مستحکم روابط، زندگی سے قریبی تعلق، مسائل ومشاکل کا حل، دینی وعلمی اختلافات سے بچ کر کام کرنے کی لگن اور الحاد ولادینیت کے بہتے دھارے کو روکنے کا عزم سرفہرست ہیں، اخوان کے بارے میں مولانا کی رائے یہ تھی کہ اگر یہ عملی سیاست میں کچھ عرصہ اور نہ الجھتے اور اصلاحی ودعوتی سرگرمیوں میں ہمہ تن منہمک رہتے تو بلادِ عربیہ میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہوسکتا تھا، اس کا احساس شیخ حسن البناء کو بھی آخر میں ہوگیا تھا، مجموعی لحاظ سے یہ عصر حاضر کی سب سے پہلی عظیم اور منظّم اسلامی تحریک تھی جسے اپنے مقاصد میں کافی حدتک کامیابی بھی ملی۔

دیگر ادارے

دمشق کی مشہور اور مؤقر اکیڈمی ''المجمع العلمی'' نے ۱۹۵۷ء میں ہندوستان کی طرف سے اپنا مراسلاتی رکن مولانا کو منتخب کیا، اکیڈمی کے لئے مولانا نے پہلا مضمون ادبِ عربی کو تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کرنے اور عربی ادب وتاریخ ادب کا از سرنو جائزہ لینے کی ضرورت سے متعلق تحریر فرمایا، اس کے بعد مولانا کے متعدد مضامین طبع ہوتے رہے۔

۱۹۸۰ء میں مولانا ''مجمع اللغۃ العربیۃ'' اردن کے رکن بنائے گئے، مولانا ''رابطۃ الجامعات الاسلامیۃ'' رباط (Federation Islamic Universities) کے بھی رکن تھے، مئی ۱۹۷۶ء میں اس کے ایک جلسہ میں مولانا رباط تشریف لے گئے، مولانا نے شیخ سعدی کے اس شعر کو بنیاد بنا کر مؤثر تقریر کی اور علوم کی دنیا میں نبوتِ محمدی کے انقلابی کردار کو تفصیل سے بیان کیا:

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست
کتبہ خانۂ چند ملت بشست

اسی موقع پر وہاں کی وزارۃ الثقافۃ کی طرف سے مولانا کو خطاب کی دعوت دی گئی،

مولانا نے ''أزمة العالم الإسلامی الحقیقة'' (عالم اسلام کا حقیقی بحران) کے عنوان سے بڑا روح پرور خطاب فرمایا، رابطۃ الجامعات کے متعدد پروگراموں میں مولانا نے شرکت کی ہے۔

شرقِ اردن کے علمی وتحقیقی ادارہ ''مؤسسۃ آل البیت'' کے بھی مولانا ۱۹۸۳ء میں رکن منتخب ہوئے، اس ادارہ کے ایک اہم شعبہ ''مجمع بحوث الحضارۃ الإسلامیۃ'' (اسلامی تہذیب وتمدن اکیڈمی) کی کانفرنسوں میں مولانا بارہا اردن تشریف لے گئے، اپریل ۱۹۸۴ء میں اکیڈمی کی تیسری سالانہ کانفرنس کے موقع پر مولانا کو باصرار بلایا گیا، داعیوں میں سرفہرست اس وقت کے ولی عہد سلطنت امیر حسن بن طلال تھے، مولانا اس میں شریک ہوئے، اور امیر کی خواہش پر اپنے خطاب میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا مختصر خاکہ پیش کیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے تاریخی کردار کو واضح کیا۔ ان اداروں کے علاوہ مولانا متعدد عرب اداروں اور تحریکات کے رکن تھے، جن میں قاہرہ کی ''مجمع اللغة العربیة'' اور ''المجلس الأعلیٰ العالمی للدعوة الإسلامیة'' بی شامل ہیں۔

علماء اور ادباء

عالم عرب کے معاصر علماء وادباء میں سے تقریباً سبھی سے مولانا کا ربط رہا اور مولانا کے خلوص، فکر اسلامی، عالی دماغی، علمی وادبی صلاحیت اور فضل وتقویٰ سے وہ سب متأثر ومعترف بھی رہے اور گرویدہ ہوگئے، مولانا نے ۱۹۵۱ء میں اپنے شرقِ اوسط کے طویل سفر میں متعدد عرب علماء، ادباء، دانشور، داعیوں اور مفکرین سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کیا تھا، ڈاکٹر احمد امین سے بھی مولانا نے کئی بار ملاقات کی، گفتگو ہوئی، شریعت اسلامی اور تاریخ اسلام کے سلسلہ میں ان کے بعض خیالات کی مولانا نے مخالفت بھی کی۔

مصر کے مشہور ادیب وعالم اور مجاہد سید قطب شہید سے بھی مولانا کا گہرا تعلق تھا، سید

قطب سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی، ان کی مشہور کتاب ''العدالة الاجتماعية فی الاسلام'' (اسلام میں عدل اجتماعی کا نظام) اور اس کے اقدامی (غیر معذرت خواہانہ) اور جرأت مندانہ اسلوب سے مولانا بے حد متأثر ہوئے، سید قطب کے بعض خیالات سے مولانا کو اتفاق نہیں رہا جس کی کچھ تفصیل ''التفسير السياسی للإسلام'' میں ذکر کی ہے۔ ۱۹۵۱ء کے سفر مصر میں مولانا کی سید قطب سے کئی ملاقاتیں رہیں، سید قطب بھی ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين'' سے بے حد متأثر تھے، اس پر مولانا نے ان سے مقدمہ بھی لکھوایا جو مستقل قیمتی مقالہ ہے، سید قطب نے مولانا کو بہت سراہا ہے، قصص النبیین پر بھی ان کا بڑا وقیع مقدمہ ہے۔

علماء عرب میں مفتی امین الحسینی سے بھی مولانا کے بڑے گہرے روابط رہے، فلسطین کے مسئلہ میں مفتی صاحب کی کاوش وکوشش اور اخلاص سے مولانا بے حد متأثر رہے۔ ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کے خلاف مولانا نے ایک مضمون لکھا، مفتی صاحب نے اسے بڑی اہمیت دی اور الگ رسالہ میں شائع کیا، اسی طرح مولانا نے ایک رسالہ ''الفتح للعرب المسلمين'' تحریر کیا تھا، اس کو مفتی صاحب نے ''العاقبة للمتقين'' کے نام سے طبع کرا کر تقسیم کیا۔

عالم عرب کے ادباء میں شیخ علی طنطاوی سے بھی مولانا کو بڑا تعلق تھا، طنطاوی صاحب مولانا سے اور ندوۃ العلماء سے بے حد متأثر تھے، مولانا کی متعدد کتابوں پر ان کے مقدمے پڑھنے کی چیز ہیں، خود مولانا نے ان کی قوتِ تحریر، زورِ بیان اور اسلامیت کا بار بار اعتراف کیا ہے، مولانا کی معروف کتاب ''مختارات'' کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح ''ذکریات'' میں لکھا ہے کہ:

> ''مدارس کے لئے جن کتابوں سے میں واقف ہوں ان میں سب سے بہتر کتاب صدیق ادیب داعی مخلص شیخ ابوالحسن علی ندوی کی ''مختارات'' ہے، اس کی ضرورت ہے کہ

مصنفین اس کے اسلوب کو اختیار کریں''۔ (کاروانِ زندگی ۲۵۵/۷)

عالم عرب کے دیگر ممتاز علماء وادباء میں محمد الغزالی، محمد قطب، شیخ بہجۃ البیطار، محمد کرد علی، احمد شرباصی، محمد محمود صواف، انور الجندی، شیخ محمد بن عبداللہ سبیل امام حرم، سید محسن احمد باروم، عمر بہاء الامیری، محمد علی حومانی، محمد المجذوب، عبدالفتاح ابوغدہ، عبدالرحمٰن رافت پاشا، شیخ حسن حبنکہ، سعید رمضان، تیسیر ظبیان، سعید عامودی، عبدالقدوس انصاری، سید علی حسن فدعق، ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، یوسف قرضاوی، شیخ بن باز، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، شیخ بہجۃ الاثری، مصطفیٰ زرقاء اور ان جیسے پچاسوں فضلاء سے مولانا کا تعلق وربط تھا، جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے ان کو محبوبیت وکمال کا کیسا بلند مقام عطا فرمایا تھا، یہ مقام ہر کسی کو نہیں ملتا؛ بلکہ:

ع: یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

تصوف وسلوک کے سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاںؒ کا

معتدل اندازِ فکر

تصوف کیا ہے؟ ایک حلقہ تو اس کا نام سنتے ہی ایسی بیزاری ظاہر کرتا ہے جیسے اس سے بڑا گناہ اور جرم کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، جب کہ دوسری طرف ایک طبقہ اس کے بارے میں اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ تمام تر بے اعتدالیوں، خود ساختہ طریقوں اور بے اصل رسموں کو تصوف کا نام دے کر سندِ جواز فراہم کرتا ہے، یہ وہ افراط وتفریط ہے جو اسلام کے مزاج وامتیاز سے بالکل ہم آہنگ نہیں، اسلام ایک معتدل ومتوازن اور جامع دین ہے، امت مسلمہ کو امت وسط اور خیر امت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس افراط وتفریط کو ختم کر کے راہِ اعتدال بتانے اور دکھانے کا اہم فریضہ اپنی تقریروں اور تحریروں خصوصاً اپنی مایۂ ناز تالیف ''ربانیة لا رهبانية'' (تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک) میں بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

مولانا نے اصطلاحات اور وسائل میں الجھنے کے بجائے حقائق ومقاصد کی طرف قدم بڑھانے کی دعوت ہمیشہ اور ہر موڑ پر دی ہے، مولانا کا کہنا یہ ہے کہ تصوف اصلاً دوسری صدی کی اصطلاح ہے، اصلاً قرآنِ کریم میں تزکیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ اور رذائل سے پاک صاف کیا جائے، تزکیہ بھی مقاصدِ بعثتِ محمدی میں شامل ہے، جس کا اظہار آیت قرآنی: ﴿لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یتلو علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ، وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین﴾ (درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہیں میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے ان کی زندگیوں کو

سنوارتا ہے اور ان کو کتاب و دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے) سے ہوتا ہے۔

تزکیہ کی اعلیٰ قسم احسان ہے، جس سے مراد یقین واستحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لئے ہر صاحب ایمان کو کوشاں ہونا چاہئے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے''۔

شریعت اسلامی دو حصوں میں منقسم ہے، ایک کا تعلق افعال وحرکات اور امورِ محسوسہ سے ہے، مثلاً قیام وقعود، رکوع وسجود، تلاوت وتسبیح، اذکار وادعیہ، احکام ومناسک وغیرہ۔ دوسرے کا تعلق ان باطنی کیفیات سے ہے جو ان افعال وحرکات کے ساتھ لازم ملزوم ہیں، جن میں مثال کے طور پر اخلاص واحتساب، صبر وتوکل وغیرہ ہیں، اول کو فقہِ ظاہر اور دوسرے کو فقہِ باطن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، تزکیۂ نفوس واحسان بھی فقہ باطن کے دائرہ میں ہیں، زیادہ مناسب تو یہ تھا کہ اس علم کو جس کا کام تزکیۂ نفوس اور تہذیب اخلاق ہے، تزکیہ یا احسان یا فقہِ باطن کے نام سے یاد کیا جاتا، اگر ایسا ہوتا تو شاید اختلاف ونزاع کی توبت ہی نہ آتی اور سارا جھگڑا ختم ہوجاتا اور دونوں فریق جن کو محض اصطلاح نے ایک دوسرے سے الگ اور برسرنزاع کر رکھا ہے، مصالحت پر آمادہ ہوجاتے، احسان اور فقہ باطن سے علمی وشرعی حقائق اور دین کے مسلمہ اصول ہیں، جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں، اگر اہل تصوف اس مقصد کے حصول کے لئے (جن کو ہم تزکیہ واحسان سے تعبیر کرتے ہیں) کسی خاص اور متعین راستے یا شکل پر اصرار نہ کرتے (اس لئے کہ زمان ومکان اور نسلوں کے مزاج وماحول کے ساتھ اصلاح وتربیت کے طریقے اور نصاب بھی بدلتے رہتے ہیں) اور وسیلہ کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلہ میں آج سب یک زبان ہوتے اور اختلاف کا سررشتہ ہی باقی نہ رہتا،

سب دین کے اس شعبہ کو شریعت کی روح، دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت قرار دیتے اور سمجھتے، اس صورتِ حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح ''تصوف'' نے دین کی کتنی عظیم، روشن اور اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ دوسری طرف اُن پیشہ ور اور جاہ طلب، حقیقت فروش اور الحاد شعار، فاسد العقیدہ، نام نہاد صوفیوں نے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کر دیا جنھوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی و بے قیدی کی تبلیغ کرنے کے لئے تصوف کو آلۂ کار بنایا اور اس کے محافظ و علم بردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجۃً اہل غیرت وحمیت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بدظن ہوگئی، کچھ غیر محقق صوفیوں نے اس شعبہ کی روح وحقیقی مقاصد سے ناواقفیت کی وجہ سے مقصد اور وسیلہ میں فرق نہیں رکھا، مقاصد کو نظر انداز کر کے وسائل پر مصر رہے اور غیر متعلقہ چیزیں داخل کر کے انھیں کو مقصود و مطلوب قرار دیا، اس طرح مسئلہ اور پیچیدہ ہوتا چلا گیا اور نزاع بڑھتا گیا، انہوں نے اس شعبہ کو معمہ اور رہبانیت بنا کر پیش کیا، چناں چہ لوگ اس سے دور ہوتے گئے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ ہر دور مآں اور ہر ملک میں ایسے افراد پیدا کرتا رہا جو دین کو مبالغہ کرنے والوں کی تحریفات، باطل پرستوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک وصاف اور عجمیت وفلسفہ سے محفوظ کرتے رہے اور پورے اعتدال کے ساتھ تزکیہ کی دعوت دیتے رہے، جس کا نام احسان اور فقہ باطن ہے، ایسے افراد کی ہر زمانہ میں ضرورت رہی ہے۔

تزکیہ واحسان (جس کا نام بعد میں تصوف وسلوک پڑ گیا) ایک الہامی نظام ہے، قرنِ ثانی سے لے کر اب تک بلا انقطاع ایک کثیر تعداد نے اس طریقہ کو اختیار کیا، دعوت دی، فائدہ اٹھایا اور پہنچایا، اور لاکھوں کروڑوں انسان اس سے فیض یاب ہوئے، اتنی بڑی

تعداد کا علی سبیل التواتر صدیوں سے اس کام میں اشتغال اس کے حق ہونے کی دلیل ہے، ان پر اگر اعتماد نہ کیا جائے تو پھر کس پر اعتماد کیا جاسکے گا؟ ان کا غلطی پر ہونا خلافِ عقل وعادت ہے اور قرآن کے اس حکم کے بھی خلاف ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللّٰہ لمع المحسنین.

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں بڑے بڑے مجاہدے اور کوششیں کیں، ہم ان کو ضرور اپنے صحیح راستوں پر لگادیں گے، بے شک اللہ ہمت وصداقت کے ساتھ کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تزکیہ واصلاح کا یہ کام کرنے والوں میں شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، مولانا جلال الدین رومی وغیرہ کی خدمات بہت نمایاں ہیں، خود ہندوستان میں یہ کام بڑے وسیع پیمانہ پر ہوا ہے، اور صوفیائے کرام کا ہندوستانی معاشرہ پر بہت گہرا اثر رہا ہے، یہ سلسلہ ہندوستان میں اسلام کی آمد ہی سے چل رہا ہے، جس میں شیخ مجدد الف ثانی، خواجہ معصوم، شاہ غلام علی دہلوی، خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت سید آدم بنوری، مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہید، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مرزا جان جاناں دہلوی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، خواجہ نظام الدین اولیاء، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حافظ ضامن شہید، شیخ سیف الدین سرہندی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالقادر رائے پوری وغیرہ اور مصر میں شیخ حسن البناء شہید اور اخوانی علماء وغیرہ سرفہرست ہیں۔

تصوف کو تعطل وبے عملی، حالات سے شکست خوردگی اور میدانِ جدوجہد سے فرار کا مرادف سمجھنا بالکل بے اصل ہے، جن حضرات کے اسماء گرامی اوپر ہیں ان میں آں بہت سے

حضرات نے عملی جہاد میں حصہ لیا ہے، اور دعوتِ جہاد وشوقِ شہادت میں تو سبھی شریک نظر آتے ہیں، نفسیاتی لحاظ سے بھی تزکیۂ باطن اور یقین ومحبت ہی وہ شہپر ہیں جن سے جہاد وجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوباتِ نفسانی، عادات ومالوفات، مادی مصالح ومنافع، اغراض وخواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بلند ہوسکتا ہے جس میں کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کی تڑپ اور عشق نے پارہ کی تقدیر سیمابی اور بجلیوں کی بے تابی پیدا کردی ہو، تاریخ اسلامی میں ہر مجاہدانہ تحریک کے سرے پر ایک ایسی شخصیت ضرور ملتی ہے جس نے یقین ومحبت کی یہی روح پھونک کر پامردی اور شہادت کا جذبہ بیدار کیا اور اسی کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے:

ہے وہی تیرے زمانہ کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے۔
موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی اور بھی تیرے لئے دشوار کرے
دے کے احسان زیاں تیرا لہو گرمادے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں تصوف وجہاد کا یہ بے نظیر امتزاج واجتماع ملتا ہے، سید صاحب کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین، مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی انہیں دو حیثیتوں کے جامع تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ:

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

واقعہ یہ ہے کہ تصوف اگر اپنی اصلی روح اور راہِ نبوت کے مطابق ہو اور یقین ومحبت (جو اس کے اہم ترین مقاصد ونتائج ہیں) بیدار کرنے کا باعث ہو تو اس سے قوتِ عمل، جذبۂ جہاد، عالی ہمتی، جفاکشی اور شوقِ شہادت پیدا ہونا لازم ہے، جو اصحابِ بصیرت افراد یہ سمجھتے

ہیں کہ تصوف کی اصل اور روح شریعت کا عین مطلوب اور نبوت کی میراث ہے وہ بسہولت اصل اور زوائد میں فرق کر کے سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔

تصوف کے سلسلہ میں مولانا کی آراء اور موقف کا یہ بہت مختصر خلاصہ راقم نے اپنے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ (یہ تفصیلات ''تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک'' اور ''پرانے چراغ'' ۳۲۹ سے ماخوذ ہیں)

اس حقیقت میں کلام نہیں کہ تصوف کے سلسلہ میں بھی جو اعتدال وتوازن مولانا کو حاصل تھا وہ اس صدی کے معدودے چند علماء ہی کو میسر آیا ہے، تصوف سے الگ ہو کر جن حضرات نے کام شروع کیا ان کو بھی دیر سویر اسی تزکیہ باطن کی اہمیت واولیت اور اپنی جلد بازی اور نادانی کا احساس ہوا اور افسوس بھی رہا، ہم اس مضمون کا خاتمہ مولانا ہی کے الفاظ پر کرتے ہیں جن میں مولانا نے اپنا موقف صاف بیان کر دیا ہے:

''میں تزکیہ کی کسی خاص لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں دیتا جس کا رواج عام ہوا اور جس کا نام آخری دور میں تصوف پڑا، نہ ہی میں تصوف کے عاملین میں سے سب کو ہر طرح کی غلط روی وغلط فہمی سے بری سمجھتا ہوں اور نہ ان کو معصوم قرار دیتا ہوں؛ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس خلا کو جو ہماری زندگی اور ہمارے معاشرہ میں واقع ہو گیا ہے جلد پر کیا جائے، اور تزکیہ واحسان اور فقہِ باطن کو پھر سے تازہ کیا جائے، جس طرح ہمارے اسلاف نے اس کو اپنے اپنے زمانہ میں تازہ کیا تھا اور یہ سب منہاجِ نبوت اور کتاب وسنت کی روشنی میں ہو، اپنے اپنے دور میں اس ذمہ داری کو ادا کرنے والوں اور اس خدمت کے انجام دینے والوں پر تنقید کرنے والوں سے ایک عربی شاعر کی زبان میں کہنا چاہتا ہوں:

أقلوا عليهم لا أبا لأبيكم

من اللوم أو سدوا المكان الذى سدوا

ترجمہ: ان اللہ کے بندوں پر بہت ملامت ہو چکی، مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان کی جگہ لینے والا اور درد کا مداوا کرنے والا کوئی ہے۔

(تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک ۲۴-۲۵ مختصراً طبع دوم، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)

حضرت مولانا علی میاں ندوی:

اقبال کا مردِ مؤمن

برصغیر کے شعراء اور مفکرین میں علامہ اقبال کا نام اور کلام بے حد نمایاں اور سرفہرست ہے، حضرت مولانا علی میاںؒ کے نزدیک اقبال اور ان کا کلام اپنی معنویت اور تاثیر و اسلامیت کے لحاظ سے ممتاز ہے، مولانا بدوِ شعور کے بعد ہی سے اقبال کے پیغام وفکر سے متأثر ہوئے، اور زمانۂ طالب علمی میں مولانا نے اقبال کی نظم ''چاند'' کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، اپنے لاہور کے پہلے سفر جون ۱۹۲۹ء میں مولانا نے پندرہ سال کی عمر میں علامہ اقبال سے ملاقات کی، مولانا کا تعارف آپ کے والد ماجد مصنف ''گل رعنا'' کے حوالہ سے کرایا گیا، مولانا نے اپنا ترجمہ علامہ اقبال کی خدمت میں پیش کیا، علامہ نے اسے پسند کیا اور سراہا اور بعض عرب شعراء کے متعلق کچھ سوالات مولانا کی معلومات کا اندازہ کرنے کے لئے پوچھے، اس ملاقات میں مولانا اقبال کی تواضع، سادگی اور بے تکلفی کی خصوصیات سے متأثر ہو کر لوٹے۔

اقبال کے کلام کی بلندی اور تاثیر کا اصل جوہر مولانا کے سامنے اس وقت آیا جب انہوں نے ۱۹۳۵ء کے بعد سے اقبال کے شعری مجموعوں ''ضربِ کلیم، بالِ جبریل، اسرارِ خودی، رموز بے خودی، مثنوی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، پیام مشرق، جاوید نامہ ارو زبورِ عجم'' کا مطالعہ کیا، مولانا کے ذہن ودماغ نے ان کا وہ اثر قبول کیا جو ادب وشعر اور فکر کے میدان میں کسی اور کا نہ تھا، مولانا کے بقول اقبال سے متأثر ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاصر اہل قلم واہل علم کی علمی تحقیقات وفتوحات اور پیش رفت اور مواد ومعلومات کے مآخذ

انہیں معلوم تھے، اور کم وبیش اس پر نظر تھی، اور اندازہ تھا کہ محنت ومطالعہ اور کہنہ مشقی سے وہ منزل حاصل کی جاسکتی ہے؛ لیکن اقبال کے افکار وخیالات اور ان کے سوز وساز کا سرچشمہ ان کی دسترس سے باہر تھا۔ مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

''اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہوسکتے ہیں، اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کرسکتا ہے، انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے، انسان بہت خود بیں وخود پسند واقع ہوا ہے، اس کی محبت اور نفرت، تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز ومحور بڑی حد تک اس کی ذات ہی ہوتی ہے، اس لئے اسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے جو اس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اس کے احساسات سے ہم آہنگ ہوجائے، میں بھی اپنے کو اس کلیہ سے الگ نہیں کرتا، میں نے کلامِ اقبال کو عام طور پر اسی لئے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا اور میرے جذبات ومحسوسات کی ترجمانی کرتا ہے، وہ میرے فکر وعقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں؛ بلکہ اکثر میرے شعور واحساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے، سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے، جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر نفس وآفاق کے لئے ابھارتا ہے، جو مہر ووفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت وابدیت پر ایمان لاتا ہے، میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اس لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں، وہ اسلام کی عظمتِ رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت ووطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی ہیں''۔ (نقوشِ اقبال ۳۳-۳۴)

علامہ اقبال سے مولانا کی دوسری ملاقات نومبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اقبال اس وقت

اپنی طویل علت کی وجہ سے بے حد کمزور ہو گئے تھے، پھر بھی وہ بڑے نشاط سے ملے، دیر تک مجلس رہی اور مختلف علمی، فکری اور ادبی موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، ان کا خادم بار بار زیادہ بات کرنے سے منع کرتا رہا؛ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی، دورانِ گفتگو جاہلی اشعار کی سچائی اور جوش کا ذکر بھی علامہ نے کیا اور حماسہ کے کچھ اشعار سنائے، انہوں نے ہندوستان کی تجدیدی واصلاحی تاریخ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، اورنگ زیب عالمگیرؒ کی خدمات کو بہت سراہا اور یہ بھی ظاہر کیا کہ اگر یہ خدمات نہ ہوتیں تو ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ اسلام کو نگل جاتا، اقبال نے بعض صوفیہ کی فکری بے اعتدالی اور افراط پر نقد بھی کیا اور وجد وسماع سے اپنی بیزاری کا اظہار بھی کیا، اسی مجلس میں (جو آخری ثابت ہوئی) مولانا نے ان سے ان کے کلام کے عربی ترجمہ کی اجازت بھی چاہی جو انہوں نے بخوشی منظور کر لی، مولانا نے اس ملاقات کی تفصیلات وتأثرات کا ذکر ''عارفِ ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں کیا جو متعدد رسالوں میں طبع ہوا۔

مولانا اقبال کے کے فکر وفن کے گھرے عقیدت مند تھے، وہ اقبال کو تعلیم جدید کا اس صدی کا سب سے بہتر نمونہ اور جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا کرتے تھے، تہذیب مغرب کے کمزور پہلوؤں پر اقبال کی نگاہِ دوررس سے مولانا بہت متأثر تھے، مولانا کی کتابوں، مضامین اور خطبات میں شعر اقبال اور فکر اقبال کا حوالہ اور اقتباس ہر جگہ ضرور ملتا ہے، یہ اقبال کے پیغام ایمان ومحبت وعالی حوصلگی اور عشق رسول سے مولانا کی فکری ہم آہنگی اور توافق کی دلیل ہے، اقبال نے اسلامی قیادت وشرف کی بحالی کے لئے جو کوشش کی اور وطن پرستی اور قومیت کی جس طرح دھجیاں بکھیریں، مولانا اس میں اقبال کے پورے مؤید اور معاون نظر آتے ہیں، مولانا بجا طور پر اقبالیات کے ماہرین اور رمز شناسوں کی اگلی صف میں جگہ پانے کے اہل ہیں۔ اقبال کی اس عقیدت میں کہیں بھی مولانا سے دامن اعتدال نہیں چھوٹا ہے، وہ اقبال کو معصوم اور مقدس نہیں مانتے، نہ ہی ان کی مدح سرائی اور ان کے کلام

سے استناد میں حد افراط کو پہنچے نظر آتے ہیں، مولانا کے بقول اسلامی عقیدہ وفلسفہ کی بعض ایسی تعبیریں بھی اقبال کے یہاں ہیں جن سے اتفاق مشکل ہے، بہت سے ایسے خیالات وافکار بھی ہیں جن کی تاویل وتوجیہ اور اہل سنت کے اجماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے، مولانا اس کے قائل کبھی نہیں رہے کہ اسلام کو اقبال سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم وحقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں؛ بلکہ مولانا زندگی کے ہر دور میں اس کے قائل رہے کہ اقبال اسلامیات کے مخلص طالب علم تھے اور اپنے مقتدر معاصرین سے وہ برابر استفادہ کرتے رہے، ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم وفن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے اور جنہیں دور کرنے کا انہیں موقع نہیں ملا، مولانا اس حقیقت پر یقین رکھتے تھے کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مطابق بعض حکم وحقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر ومفکر کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ پیغامِ محمدی کے بقائے دوام، امت مسلمہ کے استحکام اور اس کی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات وفلسفہ کی بے مائیگی پر ان کے پختہ عقیدہ سے ان کی فکر میں وضاحت اور پختگی آئی ہے، اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے، اس معاملہ میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلاء سے بھی آگے ہیں جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انہیں اس کے حقیقی اغراض ومقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے، میں پھر کہتا ہوں کہ انہیں میں نے اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نواخواں شاعر پایا، اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھتا تو دل جوش سے امنڈنے لگا اور لطیف جذبات سے انگڑائیاں لینی شروع کیں، احساسات وکیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں اور رگوں میں شجاعت اسلامی کی رَو دوڑنے لگی، میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر وقیمت ہے''۔

(نقوشِ اقبال ۴۰-۴۱-۴۲ مختصراً)

عرب ممالک میں ٹیگور کی مقبولیت اور اقبال کی گم نامی مولانا کو بے حد کھٹکتی تھی، وہ

اس صورتِ حال کو اپنی کوتاہی کا نتیجہ سمجھتے تھے کہ وہ اقبال کو متعارف نہیں کرا سکے، عربی اخبارات ورسائل میں ٹیگور کے سلسلہ میں تعریفی مضامین دیکھ کر مولانا کے دل میں اقبال کے عربی ترجمہ کا عزم تازہ ہوجاتا اور اسے اپنے ذمہ قرض وامانت سمجھنے لگتے، ۱۹۵۰ء میں مولانا نے اپنے طویل سفر حجاز ومصر وشام میں اقبال اور ان کے فکر وفن سے متعلق چند مقالات لکھے اور انہیں مصر کے دارالعلوم اور قاہرہ یونیوسٹی میں پڑھا، ۱۹۵۶ء میں میں ایک اور مقالہ سفر شام میں دمشق میں ''محمد اقبال فی مدینة الرسول'' (اقبال در دولت پر) کے عنوان سے دمشق ریڈیو پر نشر ہوا، کلام اقبال کے ترجمہ پر مولانا کی طبیعت پوری طرح آمادہ نہیں ہورہی تھی، جن حضرات نے یہ کام کیا تھا ان کی ناکامی اور تاثیر کا فقدان سامنے آچکا تھا، اسی دوران دمشق کے رسالہ ''المسلمون'' میں وہاں کے مشہور ادیب شیخ علی طنطاوی کا ایک کھلا خط طبع ہوا جس میں انہوں نے مولانا کو شعر اقبال کے ترجمہ کی دعوت بڑے مؤثر انداز میں دی، اس پیشکش کا جواب مولانا نے بڑی گرم جوشی سے دیا اور اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کا ایک ہی نشست میں ترجمہ کر ڈالا، اس کے بعد مستقل کئی مقالات لکھے (جن میں شعر اقبال کے اہم مضامین کی ترجمانی آ گئی، لفظ بہ لفظ ترجمہ خود مولانا کو پسند نہ تھا) جن سب کا مجموعہ ''روائع اقبال'' کے نام سے منظر عام پر آیا اور بے حد مقبول ومعروف ہوا، اس کا اردو ترجمہ ''نقوشِ اقبال'' کے نام سے مشہور عالم وادیب مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں (جو خود دبستان اقبال کے ایک لائق طالب علم اور تربیت یافتہ ہیں) کے قلم گہربار سے سامنے آیا جو بے حد مؤثر اور مشہور ہوا۔ ''روائع اقبال'' مولانا کی اہم تصانیف میں ہے، یہ منظوم ترجمہ نہیں ہے؛ لیکن اس کی فصاحت وادبیت اتنی مسحور کن ہے کہ اسے شعر منثور کہا جاسکتا ہے، کتاب کا اردو ترجمہ بھی مترجم کی ادبیت اور قابلیت کا مظہر ہے، عربی کی ساری خوبیاں ترجمہ میں منتقل ہوگئی ہیں اور ترجمہ اپنی سلاست کی وجہ سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، اقبالیات کے ماہرین نے مولانا کو اس

کتاب پر بڑی داد دی، علامہ اقبال کے صاحبزادۂ گرامی ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے تأثرات یوں ظاہر کئے کہ:

''آپ نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جیسے اغلباً اقبال محسوس کرتے یا چاہتے تھے''۔ (نقوشِ اقبال ۱۰)

روزنامہ جنگ کراچی ۱۱؍دسمبر ۱۹۷۳ء کے شمارہ میں ایک تبصرہ میں یہ ذکر تھا کہ:

''اقبالیات پر مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی جیسی ثقہ علمی و دینی شخصیت کا قلم اٹھانا بجائے خود تاریخ ادب کا بڑا واقعہ ہے، مولانا نے اصل کتاب عربی زبان میں تصنیف کر کے عالم اسلامی کے اتحاد کے نقیب اقبال کو دنیائے عرب میں ایک نئے انداز سے متعارف کرانے کی سعی جمیل کی ہے''۔ (نقوشِ اقبال ۱۵ مختصراً)

مشہور ادیب و مصنف و شاعر مولانا ماہر القادری مرحوم نے اپنے ماہنامہ ''فاران'' میں مئی ۱۹۷۱ء میں جو تبصرہ فرمایا وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ لکھتے ہیں:

''مولانا علی ماں نے علامہ اقبال کی نظموں اور شعروں کے انتخاب میں بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے، انہوں نے اس خریطۂ جواہر سے سب سے زیادہ تابناک لعل و گہر چنے ہیں، فاضل مصنف نے جس حسن نزاکت اور دیدہ وری کے ساتھ اشعار اقبال کی تشریح و ترجمانی کی ہے، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص اس تصنیف میں کارفرما ہے۔ ترجمہ انتہائی سلیس اور شگفتہ ہے؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے..... اقبال پر بڑی اچھی کتابیں آئی ہیں، مگر یہ کتاب اس مجاہد عالم کی لکھی ہوئی جو اقبال کے ''مردِ مؤمن'' کا مصداق ہے، اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''نقوشِ اقبال'' میں خود اقبال کی فکر اور روح اس طرح گھل مل گئی ہیں جیسے پھول میں خوشبو اور ستاروں میں روشنی''۔ (نقوشِ اقبال ۱۴)

ایک مردِ مؤمن اور انسان کامل کے بارے میں شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کے جن شعری تأثرات و جذبات کی تفسیر و تشریح مولانا نے اپنی شہرۂ آفاق عربی تصنیف ''روائع

اقبال'' میں فرمائی ہے اور جس کا ترجمہ اردو میں ڈاکٹر شمس تبریز خاں نے ''نقوشِ اقبال'' کے نام سے بڑی شستہ اور سلیس زبان میں کیا ہے وہ سب سے کم وکاست مولانا کی قدآور شخصیت کے قامت پر راست آتے ہیں، ہم بلاتبصرہ انہیں جوں کا توں نقل کر دیتے ہیں:

''اقبال اس مسلم نوجوان کی تمنا کرتے ہیں جس کی جوانی بے داغ اور جس کی ضرب کاری ہو، جو جنگ میں شیر و پلنگ اور صلح میں حریر و پرنیاں ہو، جو رزم و بزم دونوں کا حق ادا کرے، جو ''مرم دم گفتگو، گرم دمِ جستجو'' کی مثال اور صلح و جنگ میں مثالی شخصیت کا مالک ہو، جس کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوں، جو فقر مآں غنی اور امیری میں فقیر ہو، بوقت تنگدستی خوددار و غیور اور بوقت فراغ کریم و حلیم ہو، جو عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتا ہو، جو حلقۂ یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور رزمِ حق و باطل میں فولاد کی طرح تند و گرم ہو، کبھی وہ شبنم ہو جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پہنچتی ہے، اور کبھی وہ طوفان جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں، اگر اس کی راہ میں کہستان و سنگستان آئیں تو سیل تند رو اور اگر محبت کا شبستان سامنے ہو تو ''جوئے نغمہ خواں'' بن جائے، جو صدیقؓ کا ایمانی جلال، علی مرتضیٰؓ کی قوف وفتوت، ابوذرؓ کا فقر و استغناء، اور سلمانؓ کا صدق و صفا رکھتا ہو، جس کا یقین بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی ہو، جو مؤمنانہ حکمت و فراست کا آئینہ دار اور ہمت مردانہ کا علم بردار ہو، جو شہادت کو اپنا کر حکومتوں کو ٹھکرا سکتا ہو، جو ستاروں پر کمند ڈال سکتا اور نوامیس فطرت کو نخچیر بنا سکتا ہو، جو اپنی رفعت و عظمت میں فرشتوں کے لئے بھی باعث رشک ہو، جس کا وجود دنیا میں کفر و باطل کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہو، جس کی قیمت پوری کائنات نہ بن سکے اور جسے اس کے خالق و مالک کے سوا کوئی نہ خرید سکے، جس کے مقاصد جلیلہ اسے زندگی کی سطحیت اور زیب و زینت سے بلند تر کر چکے ہوں، جو چنگ و رنگ اور نغمہ و آہنگ کے فریب سے نکل چکا ہو اور تہذیب جدید کے بلبل و طاؤس کی تقلید سے یہ کہہ کر انکار کر چکا ہو کہ:

ع: بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

(نقوشِ اقبال ۱۰۱-۱۰۲)

ایک مردِ مؤمن مختلف اور متضاد اخلاق و صفات کا حامل ہوتا ہے، جو اس کی طبعی

رنگارنگی اور تنوع پسندی کی آئینہ دار ہوتی ہے، اور وہ مختلف ومتضاد صفات دراصل اللہ تعالیٰ کے صفات واحوال کے مظاہر ہیں، اور ایک مسلم اللہ کی ان صفات کا مظہر ہوتا ہے، مثلاً کشادہ قلبی، عفو ودرگذر اور حلم وبردباری میں وہ خدا کی صفت ''غفار'' کا پرتو ہے، اور اسی طرح دین حق کے بارے میں شدت، کفر وباطل پر غصہ وغضب میں اس کی صفت ''قہار'' کا مظہر ہے، اور پاکی وپاک دامنی پاک نفسی صفت ''قدوس'' کی آئینہ دار ہے، ایک مسلمان اپنے دین کا ہو بہو نمونہ اور اسلام کی سچی تصویر اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ ان تمام اخلاق وصفات کا اپنے آپ کو پرتو نہ بنالے:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عنصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان۔ (نقوشِ اقبال ۱۲۷)

اقبال کے اس مردِ مؤمن اور مسلم مثالی کو اس کے ایمان کی قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت دنیا کے ان سارے انسانوں سے جو شک وریب میں مبتلا ہیں، ممتاز کردیتی ہے، اور اسی طرح وہ بزدل انسانوں کے مقابلہ میں اپنی شجاعت ومردانگی، اور روحانی قوت سے ممتاز ہے، ایک مسلم کی توحید خالص اسے بندۂ انسان اور بندۂ مال وزر سے علیحدہ کردیتی ہے، اس کی آفاقیت وانسانیت، وطن پرستی اور رنگ ونسل کے امتیاز کی جڑ کاٹ دیتی ہے، وہ مسلم مثالی زندگی کا ایک پیام رکھتا ہے، جس کے ماتحت وہ زندگی گذارتا ہے، زندگی کی قدریں خواہ بدل جائیں اور انسانی زندگی میں کتنا بڑا ہی انقلاب کیوں نہ آجائے؛ لیکن اس کے اندر نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے، اور نہ وہ خود اپنے آپ کو بدلتا ہے، اس مسلم کی مثال قرآن نے اپنے سادہ اور بلیغ لفظوں میں اس طرح بیان کی ہے:

كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها فى السماء.

یعنی اس کی مثال ایسے پاک درخت کی ہے جس کی جریں جمی ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔

اقبال کہتا ہے:

نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

(نقوشِ اقبال ۱۱۸-۱۱۹)

اقبال کا مردِ مؤمن زندۂ جاوید ہے، اس لئے کہ وہ اپنے پاس ایک زندۂ جاوید پیام رکھتا ہے، اس کے سینے میں ایک زندۂ جاوید امانت ہے، اور اس کی زندگی ایک زندۂ جاوید مقصد کے لئے گذرتی ہے۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل

(نقوشِ اقبال ۱۲۰-۱۲۱)

اقبال کی نگاہِ بلند ابھی یہاں پر رکتی نہیں؛ بلکہ اس کی نگاہ کہیں اور پہنچتی ہے، وہ کہتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد وجود ہی صرف مردِ مؤمن ہے، عالم کا وجود اس کے لئے ہے اور وہ صرف اللہ کے لئے، یہ کائنات اور اس کے سارے لوازمات صرف ایک سچے مسلمان کے لئے وجود میں آئے ہیں، وہ اللہ کا اس سرزمین پر نائب اور خلیفہ ہے، اس کائنات کے تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے:

عالم ہے فقط مؤمن جانباز کی میراث
مؤمن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

(نقوشِ اقبال ۱۲۱)

اقبال کا خیال ہے کہ ایک مؤمن زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا؛ بلکہ وہ زندگی کی فاسد قدروں سے نبرد آزمائی کرتا ہے، وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے ہوئے دھارے کا رخ پھیر دے، عالم کو اپنی راہ پر چلائے، تہذیب و تمدن اور معاشرہ اور سماج

کا رخ موڑ دے اور ساری انسانیت اس کے عمل اور ارادہ کے تابع ہو جائے؛ اس لئے کہ وہ اپنے پاس اس دکھی انسانیت کے لئے ایک زندہ پیام رکھتا ہے جو اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہے، اس کے پاس ایمان ویقین کی جیتی جاگتی طاقت ہے، اس عالم کی رہنمائی کا وہی ذمہ دار ہے، دنیا کی امامت وقیادت اسی کو زیب دیتی ہے، اس عالم میں وہ صاحب امر ونہی کی حیثیت رکھتا ہے، اگر زمانہ اسے قبول نہ کرے، سماج اس کا مخالف ہو اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو تو پھر اس کے لئے کسی طرح یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانہ کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنے آپ کو غلط سماج کے سپرد کردے؛ بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور معاشرہ اور سماج سے جنگ کرے، یہاں تک کہ کامیابی وکامرانی اس کے قدموں میں آ لگے، اقبال کے نزدیک ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کا نظریۂ زندگی ایک مردِ مؤمن کے لئے کسی طرح صحیح نہیں، وہ کہتا ہے:

حدیث کم نظراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

(نقوشِ اقبال ۱۲۲)

اقبال کو اس بات پر یقین تھا کہ ایک مسلم ربانی کا کوئی محدود وطن نہیں ہے؛ بلکہ سارا عالم اس کا ملک ووطن ہے، اس میں مشرق ومغرب کی کوئی تقسیم نہیں:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

(نقوشِ اقبال ۱۲۶)

ایک بندۂ مؤمن اور انسانِ کامل کے لئے علامہ اقبال کے یہ جذبات ہیں، ہم یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے کہ اگر اقبال زندہ ہوتے تو یقیناً انہیں مولانا کی شخصیت وکردار میں وہ بندۂ مؤمن مل جاتا جس کی انہیں تڑپ اور جستجو تھی، بلاشبہ مولانا اقبال کے ''بندۂ

مؤمن'' کے معیار پر کھرے اترتے ہیں۔ **ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔**

ان کمالات اور خوبیوں پر اس کے سوا کچھ اور تبصرہ نہیں ہوسکتا جو ایک عرب شاعر نے شعر میں کیا ہے:

ولولا بدائع صنع اللّٰہ ما نبتت

تلک الفضائل فی لحم و لا عصب

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں ''کاروانِ زندگی اول، نقوش اقبال، اسلامیت ومغربیت کی کشمکش سے استفادہ کیا گیا ہے۔

❐❖❐

حضرت مولانا علی میاںؒ

چند امتیازات وخصوصیات

حضرت مولانا علی میاںؒ پیدائشی عظیم تھے پھران کے جہد مسلسل اور سعی پیہم نے ان کی عظمت میں چار چاند لگادئے تھے، عرب شعراء انسان کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں:

إن الفتیٰ من یقول ھا أنذا

لیس الفتیٰ من یقول کان أبی

جوان وبہادر تو وہ ہے جو اپنے آپ پر اعتماد رکھتا ہو، بہادر وجوان وہ نہیں ہوسکتا جو اپنے آباء واجداد کے مکارم سناتا رہے اور انہیں پر اتراتا رہے اور خود کچھ نہ کرے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ میں حسب ونسب کی شرافت کے ساتھ علم وادب کا کمال بھی جمع ہوگیا تھا، یہ ایسا امتیاز ہے کہ اس کے سامنے سارے امتیازات ہیچ ہوجاتے ہیں۔

مولانا کا ایک قابل قدر اور قابل ذکر امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے جدید وقدیم دونوں کو نہایت اعتدال اور توازن کے ساتھ اپنے اندر سمولیا تھا، دونوں جگہ سے لعل وجواہر منتخب کرلئے تھے اور ذرّات وفضلات چھوڑ دئے تھے، ان کا اعلان تھا کہ:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

قدیم صالح اور جدید نافع کا یہ حسین ترین امتزاج (جس کو اخذ کرنے کی ہر حلقہ وطبقہ

میں ضرورت بڑھتی جارہی ہے) مولانا کا امتیازی وصف تھا جسے اپنانے کی کوشش مولانا کے سارے متعلقین ومنتسبین کررہے ہیں اور انشاءاللہ کرتے رہیں گے۔

حضرت مولانا کی شہرۂ آفاق تصنیف ''مختارات'' کا دوسرا حصہ پڑھئے تو اس میں ایک مضمون ''صفة رسول اللّٰه ﷺ'' ہے، میں بلامبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ان اوصاف کی تجسیم مولانا کی شخصیت میں بھی نمایاں دکھائی دیتی تھی۔

زہد واستغناء مولانا کی زندگی کا ایک بہت ہی روشن باب ہے، اعزازات، مناصب، انعامات اور ایوارڈ جتنے مولانا کے حصہ میں آئے شاید اس صدی کے کسی اور عالم کے حصہ میں نہ آئے ہوں، حجاز، سوڈان ومصر، شام وعراق، ایران وافغانستان، پاکستان وبنگلہ دیش، لبنان وترکی، کویت وامارات، اردن ومراکش، امریکہ وبرطانیہ، سرلنکا وافریقہ، سمرقند وتاشقند، اندلس وبخاریٰ، یمن وقطر، ملیشیا انڈونیشیا، برما اور جاپان اور نہ جانے کتنے ملکوں اور شہروں میں مولانا بلائے گئے، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں مدعو ہوئے، عہدے دیئے گئے، مال ودولت کی پیش کش ہوئی؛ لیکن ہر جگہ مولانا نے اپنا پیام پہنچایا، اپنی فکر دی، اور کچھ لیا نہیں۔

۱۹۸۰ء میں شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا، مولانا نے اس کی رقم جہاد افغانستان اور بعض دینی اداروں کے سپرد کردی، جنرل ضیاء الحق شہید نے علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی جلد ہفتم پر مولانا کا مقدمہ دیکھا اور قدردانی کرتے ہوئے مولانا کو حکومت پاکستان کی طرف سے ایک لاکھ کا عطیہ دینے کا اعلان کیا، مولانا نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں اس عطیہ کا کسی طرح مستحق نہیں، براہِ کرم اس کا نصف حصہ دارالمبلغین اعظم گڈھ کو پیش کردیا جائے جس نے یہ کتاب دریافت کی اور اس کی اشاعت کا انتظام کیا، بقیہ حصہ حضرت سید صاحبؒ کے پسماندگان کی خدمت میں پیش کردیا جائے، جو کراچی میں مقیم ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں دبئ وامارات کے سربراہوں نے مولانا کو عالمی شخصیت کا ایوارڈ دیا اور ایک خطیر رقم پیش کی؛ لیکن

مولانا نے وہ رقم بھی دینی مدارس اور اداروں کے لئے وقف کردی، دمشق یونیورسٹی، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور عالم عرب کے متعدد اداروں اور جامعات کی طرف سے تدریس اور اعلیٰ درجہ کی سہولیات اور تنخواہوں کی بار بار پیش کش مولانا سے کی گئی، مگر ہر موقع پر مولانا نے صاف صاف معذرت کردی، شاہانِ ممالک جن میں سعودیہ عربیہ کے سربراہان شاہ فیصل شہید، شاہ خالد اور شاہ فہد، والی اردن وقدس شاہ عبداللہ، حاکم شارقہ سلطان محمد القاسمی، پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق وغیرہ سے خصوصاً مولانا کی ملاقاتیں اور مراسلت رہی، مولانا نے ہر موقع پر بغیر کسی غرض کے مخلصانہ طور پر انہیں خطرات سے باخبر کیا اور ذمہ داریاں یاد دلاتے رہے۔

۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی لندن میں اسلامک سینٹر قائم ہوا تو اس کی صدارت کے لئے بھی مولانا ہی کا انتخاب ہوا، خود ہندوستان کے بہت سے اداروں سے بار بار مولانا کو پیش کش کی گئی، حکومت نے کئی بار پدم بھوشن کا اعزاز دینا چاہا؛ لیکن مولانا کا زہد اور متاعِ دنیا سے ان کی بیزاری کا رویہ تا آخر قائم رہا، مال ودولت کے ڈھیر وانبار ان کے قدموں میں پڑے تھے، دنیا بہت جھک کر ان کے پاس آئی تھی، مگر مولانا کا قلندرانہ انداز اور مؤمنانہ کردار کبھی سرمو بھی نہیں بدلا۔ قرآنی اصول:

قل متاع الدنیا قلیل والآخرة خیر لمن اتقی ولا تظلمون فتیلا.

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے زیادہ بہتر ہے اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہیں کیا جائے گا۔

اور

لا تغرنکم الحیاة الدنیا ولا یغرنکم باللّٰہ الغرور.

ترجمہ: دنیا کی زندگی تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے اور نہ وہ بڑا دھوکے باز

تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دینے پائے۔

ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے، جہاں بینی ہمیشہ اُن کی فطرت رہی؛ لیکن وہ کسی جمشید کا ساغر کبھی نہیں بنے، گویا بزبانِ حال انہوں نے یہ پیغام دیا:

یخبرک من شهد الوقیعة أننی

أغشی الوغی وأعف عند المغنم

ترجمہ : جنگ میں شریک ہر آدمی تم کو خبر دے گا کہ میں معرکہ میں سربکف ہوکر لڑتا ہوں؛ لیکن مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر کنارہ کش ہوجاتا ہوں۔

اسی لئے جہاں جہاں انہوں نے نے اپنی بات رکھی وہ تلخ نوائی کے باوجود سنی گئی اور اثر انداز ہوئی؛ اس لئے کہ وہ کتاب وسنت سے ماخوذ اور مولانا کے دل کی آواز اور اندرون کی صدا ہوتی تھی، جس کی تاثیر اور کشش ہر شبہ سے بالاتر ہے، مولانا زہد وتقویٰ کے اعلیٰ ترین مقام پر تھے، پَر ان کا زہد حقیقی تھا، دنیا سے بالکل ناآشنا اور اپنی ذات کے حصار میں چکر لگا کر رہ جانے والوں کا زہد نہیں تھا، مولانا نے مشرق ومغرب کا چپہ چپہ چھان ڈالا تھا، اکابر واصاغر سے ملے تھے، وہ دنیا سے بخوبی آشنا تھے، ان کا زہد محرومی کا ردعمل نہیں تھا، دل کی پاکیزگی اور قلب ونظر کی شفافیت کا نتیجہ تھا۔

معاصر علماء، ادباء، داعیان، مفکرین ومصنفین میں مولانا کو اس لحاظ سے بھی برتری حاصل تھی کہ مولانا کی پوری زندگی علم وعمل، تقویٰ ودیانت اور قول وفعل کی جامعیت کی بے مثال اور قابل رشک زندگی تھی، وہ سلف صالح کا جیتا جاگتا نمونہ اور تصویر تھے، ان کے ظاہر وباطن، گفتار وکردار، سیرت وصورت اور حرکات وسکنات ہر چیز سے اعتدال ٹپکتا تھا، باجماعت نماز کی پابندی اور اس کے لئے تڑپ، حمیت وحمایت دین اور اعلاء کلمۃ الحق میں بھی ان کو امتیاز حاصل تھا۔

مولانا کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے اساتذہ اور محسنوں کے کرم واحسان کا اعتراف واظہار کرتے رہے، اپنی محسن کتابوں (جن میں قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کی رحمۃ للعالمین سرفہرست ہے) اور محسنِ افراد (جن میں ان کے برادر بزرگ اور اصل مربی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ وغیرہ سرفہرست ہیں) کا ہمیشہ برملا ذکرِ خیر کرتے رہے، جن کتابوں اور شخصیات سے وہ متأثر رہے ان کا بھی ذکر کیا، ان کتابوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی ''اظہار الحق'' مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی ''حیاۃ الصحابہ'' اور شخصیات میں مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت رائے پوریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، علامہ اقبالؒ، مفتی امین الحسینی، شیخ حسن البناءؒ اور سید قطب شہیدؒ وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا کی آفاقیت، ہمہ گیری، جامعیت اور عالمیت ان کا بہت بڑا امتیازی وصف ہے جو بہت کم کسی کے حصہ میں آپاتا ہے، مولانا کی علمی ودعوتی وفکری سرگرمیوں، خدمات اور تصانیف کی کثرت اور تنوع ان کے وقت کی برکت کا ثبوت ہے، ورنہ خدمات کی وسعت کا وقت سے کوئی جوڑ ہی نہیں ہے؛ لیکن مولانا ان اولیاء صالحین میں تھے جن کے ہمراہ برکت ورحمت ہوتی ہے اور لمبا کام تھوڑے سے وقت میں وہ کر لیتے ہیں، آیات قرآنی اور احادیث ہر موقع پر مولانا کے لئے توجہ کا مرکز بنی رہیں، بہت سی ایسی حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی جو عرصہ سے پردہ میں پڑی ہوئی تھیں، مولانا کی دعوتی سرگرمیوں خصوصاً خطبات میں قرآن کی آیت:

یایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ.

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ۔

حضرت ربعی بن عامر کا رستم کے دربار میں تاریخی جملہ:

اللّٰہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد إلی عبادۃ اللّٰہ

ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام ومن ضيق الدنيا إلى سعة الدنيا والآخرة.

ترجمہ: اللہ نے ہم کو بھیجا ہے؛ تاکہ ہم انسانوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کردیں، دیگر مذاہب کے ظلم وبربریت سے اسلام کے دامان عدل میں پناہ دیں اور دنیا کی تنگیوں اور کشاکشوں سے نکال کر دنیا وآخرت کی وسعتیں اور فراخیاں عطا کریں)

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تاریخی فقرہ:

أينقص الدين وأنا حي.

ترجمہ: کیا میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہوسکتی ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور جملہ:

كلموا الناس على قدر عقولهم.

ترجمہ: لوگوں سے ان کے عقلی مدارج کا لحاظ کرتے ہوئے گفتگو کرو۔

سے خوب خوب استدلال واقتباس ملتا ہے۔

مذہبی، فکری اور فروعی اختلافات سے مکمل گریز، اتحاد بین المسلمین کی ہر طرح سے جدوجہد میں بھی مولانا کا ثانی ملنا مشکل ہے، مولانا نے بڑی سادہ اور متواضعانہ زندگی گذاری ہے، اپنے تو اپنے، غیروں سے بھی ان کا اچھا برتاؤ اور حسن سلوک ان کی عالی ظرفی کی واضح دلیل تھی، مولانا اس پر ایمان رکھتے تھے کہ:

آسائش دوگیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

انہوں نے ہمیشہ یہ فکر رکھی کہ سب کا بھلا ہوجائے، کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے، بڑی احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ گویا:

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

مولانا کا توسع، رواداری اور اعتدال ضرب المثل ہے۔ ان کا مسلک فقہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہی کی پیروی تھا، جس پر وہ ہمیشہ عامل رہے، اور کبھی انحراف نہیں کیا؛ لیکن بے جا تعصب اور تشدد سے کوسوں دور رہے۔ مولانا کی زندگی کے آخری دہے میں خاص طور سے ایک غیر معتدل فرقہ نے مسلک حنفی کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے شدومد سے مولانا کو اپنا نشانہ بنایا، انہیں ضال وکافر تک کہنے سے گریز نہیں کیا گیا، انہیں قبر پرست بھی ثابت کیا گیا، تصوف کی مخالفت میں انہیں صوفی کہہ کر سب وشتم کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا، کتابیں بھی آئیں، بعض نے تو انہیں منافق ثابت کرنا چاہا اور ''موحد فی العرب ومشرک فی الھند'' (عرب کا موحد اور ہندوستان کا مشرک) تک کہہ ڈالا جس سے مولانا کو قلبی اذیت بھی پہنچی، جب کہ مولانا کا تعلق ایسے خاندان عالی مقام سے تھا جو صدیوں سے توحید کے عقیدۂ خالص، کامل اتباع سنت اور ائمہ سلف سے پوری عقیدت اور ان کے اعتراف واحترام کا خوگر چلا آرہا ہے، خود مولانا نے اپنے استاذ خلیل عرب صاحب سے بے انتہا فائدہ اٹھایا اور بہت کچھ استفادہ کیا جو مسالک اربعہ میں سے کسی مسلک پر عامل نہیں تھے، اسی طرح اہل حدیث کے معاصر علماء وشیوخ سے احترام ومحبت کا معاملہ بھی مولانا نے کیا، خصوصاً محدثِ کبیر علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری کی شرح ترمذی ''تحفۃ الاحوذی'' سے بھی مولانا نے فائدہ اٹھایا اور ان سے سند حدیث بھی مولانا کو حاصل ہوئی۔

لیکن جب مذاہب اربعہ اور تقلید ائمہ کے خلاف (جن میں اپنی شہرت اور اشاعت کی وجہ سے مذہب حنفی ہی خاص نشانہ بنا) ایک خاص مہم شروع ہوئی اور تقلید کو بدعت، تعلیماتِ اسلام کی مخالفت اور ضلالت قرار دئے جانے کی سرگرمیاں تیز ہوئیں تو مولانا نے یہ مناسب

سمجھا کہ اس مہم کے خلاف کوئی مخالفانہ اور مقابلانہ مہم شروع کرنے کے بجائے (جس میں مسلمانوں میں مزید انتشار پیدا ہونے کا خوف ہو) حضرات علماء حدیث کو ایک داعیانہ ومخلصانہ خط لکھیں، جس میں ان کو "جهاد فی غیر جهاد ونضال فی غیر عدو" (بے موقع جہاد اور دشمن کے بغیر لڑائی) سے بچانے کی کوشش ہو، مولانا نے یہ مکتوب عربی میں مرتب کیا اور دس ممتاز ونامور عرب سلفی علماء کے پاس بھیجا، اس میں مولانا نے وقت کی نزاکت اور معنوی نسل کشی کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے اصل توجہ وتوانائی حقیقی دشمن اور سنگین خطرہ کے مقابلہ پر صرف کرنے کی دعوت دی، اس میں یہ بھی لکھا کہ:

''احناف کے خلاف جدوجہد اور جنگ شروع کرنے کے بجائے اس کی شدید ضرورت ہے کہ مشرکانہ عقائد واعمال کے خلاف پوری توجہ اور پوری طاقت لگادی جائے''۔ (کاروانِ زندگی ۱۸/۸)

اس مراسلہ کا جواب شیخ بن باز نے بھی دیا جس میں ائمہ اربعہ کی واضح الفاظ میں تعریف واعتراف اور تقلید کے بے کم وکاست جواز وصحت کا ذکر کیا ہے۔

لیکن مولانا نے اپنے اوپر کئے گئے ان حملوں سے تکلیف کا برملا اظہار کبھی نہیں کیا جو ان کے صبر وتحمل اور حلم ودرگذر کا ثبوت ہے، اس تفصیل کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ابھی حال ہی میں ایک نئی کتاب ''مولانا علی میاں اور علم حدیث'' آئی ہے، جس کے مصنف مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ہیں، موصوف کا تعلق بھی اسی فرقہ سے ہے جس کا ذکر چل رہا ہے، انہوں نے اپنی کتاب میں ایک نیا انکشاف کیا ہے اور مولانا علی میاںؒ کو غیر مقلد ثابت کرنا چاہا ہے، اور اس کے لئے ''عامل بالحدیث'' کا لفظ استعمال کیا ہے، مولانا ابوسحبان ندوی نے اس کی ایک دلیل یہ بھی بیان کی ہے کہ ''شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ کے درس نے مولانا علی میاںؒ کے فکر وخیال میں وسعت پیدا کی اور عمل بالحدیث کی راہ آسان کردی''۔ (مولانا علی میاںؒ اور علم حدیث، از: مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی ۳۶)

ہم بڑے ادب سے اُن سے عرض کریں گے کہ مولانا حیدر علی خاںؒ کے بارے میں خود مولانا علی میاںؒ نے یہ لکھا ہے کہ وہ متصلّب حنفی تھے، مذہب حنفی سے ان کی عقیدت عقیدہ کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، اور اس کے نتیجہ میں بسا اوقات مذہب حنفی کے ناقدین کے حق میں ذرا سخت اور تنقید وشکوہ واحتجاج کے الفاظ بھی ان یک زبان سے نکل جایا کرتے تھے، ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ حدیث اور اتباع حدیث پر بھی کم زور نہ دیتے تھے۔ (پرانے چراغ ۱/۱۹۳-۱۹۴ مختصراً)

یہ جذبہ مولانا کے اندر بھی منتقل ہوا تھا، (متعدد واقعات اس کی دلیل کے طور پر ناچیز کے علم میں ہیں جو اس مختصر مضمون میں طوالت کا موجب ہوں گے) عمل بالحدیث کے ہم بھی داعی اور قائل ہیں اور کونسا مسلمان ایسا ہے جو حدیث پر عمل سے گریزاں اور مخالف ہو؛ لیکن مذہب حنفی کی بنیادیں بھی تو احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر استوار ہوئی ہیں۔ مولانا اس لحاظ سے واقعی عاملین بالحدیث کی صف میں شامل رہے؛ لیکن عمل بالحدیث کی وہ مفروضہ اور مخترعہ شکل جو فی زمانہ ایک خاص حلقہ میں معیارِ حق وباطل اور میزان وکسوٹی بنادی گئی ہیں اور جن سے سرمو انحراف بھی کفر سے کسی طرح کم نہیں مانا جاتا (اور مولانا علی میاں اسی لئے نشانۂ تنقید وتشنیع بنے رہے) مولانا ان سے کوسوں دور اور بیزار تھے، اور کوئی ایک مثال بھی اس کی تائید میں پیش نہیں کی جاسکتی، ہاں یہ ضرور ہے کہ مولانا نے وحدتِ امت کا خیال رکھتے ہوئے ہمیشہ اس طبقہ سے بھی اپنے کو مربوط رکھا، مولانا کی ذات والا صفات سے اس طبقہ کو بڑے فوائد بھی پہنچے جن کی تفصیل ہم کرنا نہیں چاہتے۔

یہ مولانا کا ظرف تھا جس میں سمندر کی سی وسعتیں اور گہرائیاں تھیں، مگر جانب ثانی کا ظرف بھی ملاحظہ ہو کہ پھر بھی تکفیر وتضلیل سے کم پر قناعت نہیں، کیا یہی عمل بالحدیث ہے؟ کیا یہ ”من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ“ (جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کیا وہ اللہ کا شکر گذار بھی نہ ہوا) پر عمل ہے؟ کیا یہ ان احادیث پر عمل ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

من دعا رجلاً بالكفر أو قال عدو الله وليس كذلك إلا حار عليه.

ترجمہ: جس نے کسی انسان کو کافر یا دشمن خدا کہہ کر بلایا، اور واقع میں وہ نہ کافر ہے اور نہ دشمن خدا، تو یہ کہنا کہنے والے پر لوٹ جائے گا۔

إياكم والظن فإن الظن أكذب الحديث.

ترجمہ: بدگمانی سے بچو؛ کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔

محترم مولانا ابوسحبان صاحب لکھتے ہیں کہ:

''غالباً مولانا علی میاںؒ اپنے اسی توسع کی وجہ سے ابویحییٰ امام خاں نوشہروی (متوفی ۱۳۸۶ھ) کی مشہور کتاب ''تراجم علماء اہل حدیث ہند'' میں جگہ پانے کے مستحق ہوئے''۔

(مولانا علی میاں اور علم حدیث ۳۷)

ہم مولانا سے پوچھتے ہیں کہ پھر اس کی کیا توجیہ کی جائے گی جو طوفان بدتمیزی آپ کے حلقہ سے مولانا کے خلاف برپا کیا گیا اور مجروح کرنے میں سارا زور لگا دیا گیا، آپ اگر مولانا کو واقعی عامل بالحدیث سمجھتے ہیں تو اس نازک موقع پر آپ کو آگے بڑھ کر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ انجام دینا چاہئے تھا کہ یہ بھی تو قرآنِ کریم اور ان صحیح احادیث سے ثابت ہے جن پر تن تنہا عمل کرنے کا دعویٰ آپ کی جماعت کو ہے، آپ کو میدان میں آ کر اس تکفیری مہم کو یہ کہہ کر روکنا چاہئے تھا کہ مولانا عامل بالحدث ہیں؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ کے دل میں عمل بالحدیث کا جو مفہوم عدم تقلید کے نام پر بیٹھا ہوا ہے، آپ خود سمجھتے تھے کہ یہ مولانا کا کبھی وصف نہیں رہا؛ بلکہ مولانا حنفی رہے، اسی لئے آپ نے سکوت کا التزام کیا۔

حقیقت یہی ہے کہ شہادتِ حق بہت پرخطر وادی ہے جہاں قدم رکھنے کے لئے ثبات واستقامت اور توفیق ربانی کی ضرورت پڑتی ہے اور اس راہ میں اکثر لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔

ہمیں حیرت واستعجاب ہے کہ مولانا ابوسحبان ندوی کی یہ کتاب ندوۃ العلماء کے مؤثر ادارہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے طبع ہوئی ہے جس کو حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس ذہنی وفکری ارتداد کے مقابلہ اور روک تھام کے لئے قائم کیا تھا، جس کے اثراتِ بد سے ایک عالم متأثر ہورہا تھا، اس ادارہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ باہمی نزاع کو ہوا دی جائے، نہ ہی اس لئے تھا کہ حق وصداقت سے دور کا واسطہ نہ رکھنے والے خیالات کی اشاعت کی جائے، مولانا ابوسحبان ندوی کی یہ کتاب مولانا علی میاںؒ کا غلط تعارف پیش کرتی ہے، ہم بڑے ادب سے ذمہ دارانِ مجلس سے اس مسئلہ پر نظر ثانی کی درخواست کرتے ہیں اور مولانا ابوسحبان ندوی کو وہ دن یاد دلاتے ہیں جو بہت جلد آنے والا ہے، جب ہر شخص اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوگا اور اس وقت خوبصورت الفاظ اور حسین توجیہات کی دیواریں گر جائیں گی اور حقیقت بے نقاب ہوجائے گی۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی تصنیفات وخطبات میں ایمانی صلابت اور روحانی بلندی کے ساتھ اعتدال وتوازن کا امتزاج ان کی ایک انفرادی خصوصیت ہے، اپنی زبان وقلم سے انہوں نے کبھی کسی کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائی، ان کی خلوت وجلوت میں کسی کی غیبت اُن سے نہیں سنی گئی۔ ہاں! مگر حق کا برملا اعلان وہ پوری قوت وصراحت کے ساتھ ہر جگہ اور ہر موقع پر کرتے رہے، اور اس میں کسی مداہنت کا شائبہ تک ان کے دل میں نہ آیا، یہی دراصل ایک بندۂ مؤمن کا امتیاز ہے اور یہی اس کے کمال کی دلیل ہے۔

بدوِ شعور کے بعد سے زندگی کے آخری لمحہ تک دعوتی سرگرمیوں میں اشتغال وانہماک، عربی زبان میں بے مثال مہارت وقدرت اور اس صلاحیت کا صرف دعوت کے لئے استعمال، اظہار حق میں بے باکی اور لومۃ لائم سے بالکل بے خوفی، صحیح عقیدہ وفکر، توحید خالص، ایمان راسخ اور قرآن وسنت پر مکمل اعتماد، تمام مشاہیر اہل کمال اور معاصرین کے

نزدیک محبوبیت، اعتماد اور مقبولیت، پاکیزگیٔ باطن، عفت ضمیر وزبان، جود وزہد، استقامت واستغناء، اسلام اور مسلمانوں کے تمام مسائل پر قلق وکرب اور ان کے حل کی تڑپ وتمنا، فکر وعمل میں راستی، پوری انسانیت کو محبت واتحاد کا پیغام اور خیر خواہانہ جذبات، آزادانہ اعترافِ حق، تزکیہ نفس اور اصلاحِ باطن کی کوشش، اخلاص وفنائیت، اصول ومقاصد میں تصلب اور فروع ووسائل میں توسع، حقیقت پسندی ودور اندیشی، بصارت وبصیرت، حکمت وفراست، ایمان کامل، یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم اور ان جیسے نہ جانے کتنے بلند پایہ اوصاف وامتیازات مولانا کی زندگی، سیرت وکردار اور سرگرمیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولانا کی غیرتِ ایمانی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ عقیدہ ومذہب میں کسی قسم کی توہین اور حرمت کی پامالی ان سے کبھی برداشت نہیں ہوتی تھی، اسی لئے قادیانیوں اور شیعوں کے خلاف بھی مولانا نے لکھا۔ (اس کے لئے ''صورتان متضادتان'' اور ''القادیانی والقادیانیة'' دیکھی جاسکتی ہے) فکر کو صحیح رخ دینے کے لئے ''أضواء'' (بصائر) اور ''التفسیر السیاسی للإسلام'' (عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح) لکھی، اور عرب قومیت، ذہنی ارتداد، لسانی وتہذیبی تعصب اور تمام خطرناک چیزوں کے خلاف آواز اٹھائی، مگر اسلوبِ بیان اور طرز کلام ہر جگہ مثبت اور تعمیری رہا، ایران تشریف لے گئے تو وہاں اپنے ایک خطاب میں فرمایا:

> ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی، بنی آدم میں سے جس کو بھی سعادت وخیر کا کوئی ذرہ ملا وہ خواہ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہی کے مرتبہ کا کوئی شخص کیوں نہ ہو، سیدنا محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ ہی سے نصیب ہوا''۔

عجب کیا گر مہ و پرویں میرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے

غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

(کارروانِ زندگی ۲/۱۵۶)

انسانیت کے احترام کی صدا بھی مولانا نے بڑے زور وشور سے لگائی اور:

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً.

ترجمہ: یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں، اوران کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

کو ہمیشہ مطمح نظر بنائے رکھا۔

محبین ومعتقدین کے ہجوم بے پناہ اور ذاتی مقبولیت نے کبھی اُن کے دل میں عجب وتکبر پیدا نہ ہونے دیا، یہ اُن کے اکابر خصوصاً اُن کی مشفق ماں کی آہِ سحر گاہی اور حکیمانہ تربیت کا نتیجہ تھا، تواضع وبے نفسی اور حلم وکرم سے ان کی محبوبیت ومقبولیت روز افزوں ہوتی رہی۔

ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہندوستان کی اسلامی درخشاں تاریخ پوری تفصیل سے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ عرب کے سامنے رکھی اور انہیں واقف کرایا، اس سے پہلے عربی میں یہ کام اس انداز میں نہیں ہوسکا تھا۔

مولانا عالم اسلام میں تعلیمی وتربیتی نظام کو ترقی وفروغ دینے نیز جدید وسائل سے استفادہ کی صدا ہمیشہ لگاتے رہے، انہوں نے نظام اسلامی کے قیام ونفاذ کی یہ دانش مندانہ تجویز رکھی کہ اس کا بہترین ذریعہ اور راستہ یہ ہے کہ ایمان اہل حکومت تک پہنچادیا جائے، انہیں دین سے قریب کیا جائے، ذہن ودماغ اسلامی بنائے جائیں، یہ راستہ اس کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب اور مؤثر ہے کہ خود اہل ایمان کرسی تک پہنچیں اور حکومت کی ذمہ داریاں براہِ راست سنبھال کر ایمان سے دور حکمرانوں کو بے دخل اور برطرف کردیں، کامیابی اسی میں

ہے کہ غیر اسلامی حکام تک اسلام کی صدا اتنے مؤثر انداز میں پہنچائی جائے کہ وہ اسے سننے اور اس کے مطابق چلنے پر مجبور؛ بلکہ راضی ہو جائیں۔

جدید علم کلام کو آگے بڑھانے میں اس صدی میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جو گراں قدر خدمات اپنی تالیفات، دعوتی سرگرمیوں اور خطبات کے ذریعہ انجام دی ہیں، شاید ان میں ان کا کوئی ثانی نہ مل سکے۔ حضرت مولانا کا کام اس سلسلہ میں بہت وسیع، ہمہ گیر اور جامع نظر آتا ہے، ان کی سیکڑوں تالیفات، عرب وعجم کو یکساں دعوت وتبلیغ، ملکی وبیرونی تبلیغی ودعوتی اسفار، کانفرنسوں وسیمیناروں میں شرکت، متعدد ومختلف النوع تحریکات کی قیادت ورکنیت اور خطبات ومواعظ یہ سب مولانا کی جامعیت اور ہمہ گیری کی شاہد عدل ہیں۔

ہندوستان ومختلف ممالک کے سربراہان، وزراء واعیان بارہا مولانا کے دربار میں حاضر ہوئے، ان کی مقناطیسی شخصیت بارہا ملک کے ہر با اثر سیات داں کو ان کی چوکھٹ پر کھینچ لائی، اور ہر بار عربی کے اس طاقت ور شعر کی تصدیق سامنے آئی:

إن الملوک لیحکمون علی الوریٰ

وعلی الملوک لتحکم العلماء

ترجمہ: بادشاہوں کی حکومت خلق خدا پر ہوتی ہے، اور بادشاہوں پر حکومت علماء ربانیین کی ہوتی ہے۔

حضرت مولانا کے فکر وعمل کی اتنی جہتیں ہیں کہ الفاظ میں یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا، اور ہر جہت ایسی حسین ودل ربا ہے کہ:

ع: کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

عرب شاعر نے بھی اسی حقیقت کو بیان کیا ہے:

من کثرۃ الأخبار من مکرماتہ

یمر بہ صنف ویأتی بہ صنف

یعنی اس کے مکارم گوناگوں اور اس قدر کثیر ہیں کہ ایک کا ذکر چھڑتا ہے تو دوسرا چلا آتا ہے۔

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان کمالات ونقائص دونوں کے مشترکہ خمیر سے گندھا ہوا ہے، اس میں بشری خامیاں بہرحال موجود ہوتی ہیں؛ لیکن ہم بلاتکلف کہہ سکتے ہیں کہ ایک بندۂ مؤمن کو جو اوصاف وکمالات فرشتوں کے مشابہ اور قریب کردیتے ہیں وہ سب حضرت مولانا علی میاںؒ میں بدرجۂ اتم موجود تھے؛ بلکہ:

فرشتوں سے مشکل ہے انسان بننا
کہ پڑتی ہے اس میں محنت زیادہ

مولانا ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ کے میرکارواں تھے، اور ایک میرکارواں کے لئے جو خصوصیات درکار ہوتی ہیں وہ مولانا میں بڑی خوش اسلوبی سے جمع ہوگئی تھیں۔ بقول اقبال:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

حضرت مولانا علی میاںؒ کے بارے میں مشائخ، اہل کمال اور معاصرین کی کچھ آراء کا ذکر پیچھے کئی جگہ آ چکا ہے، اس سے حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ اللہ نے ان کو مقامِ محبوبیت سے نوازا تھا، اور اسی کا ذکر اس حدیث میں ہے جس میں فرمایا گیا:

إن اللّٰه إذا أحب عبداً دعا جبرئيل فقال: إني أحب فلاناً فأحبه، قال: فيحبه جبرئيل ثم ينادي في السماء، فيقول: إن اللّٰه يحب فلاناً فأحبوه، فيحبه أهل السماء ثم يوضع له القبول في الأرض. (مشكوٰة المصابيح، باب الحب في اللّٰه ومن اللّٰه)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں بندہ سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو، پھر جبرئیل اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ اپنے فلاں بندہ سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو تو آسمان کے فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر پوری روئے زمین میں اس کو مقبول بنا دیا جاتا ہے۔

یہاں ہم مزید کچھ آراء اور تأثرات نقل کر رہے ہیں:

میرا اپنے بارے میں اعتماد متزلزل ہو گیا تھا؛ لیکن برادرم ابوالحسن! جب میں نے آپ کی کتاب ''الطریق الی المدینۃ'' کو پڑھا تو مآں نے محسوس کیا کہ شوق میرے اندر پھر انگڑائی لینے لگا ہے، اور میرے سینہ میں پھر وہی تپش ہے، اس طرح پھر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا دل جوہر محبت سے بالکل خالی نہیں ہوا ہے؛ لیکن افکارِ زمانہ اور وقت نے اس جوہر کو گرد

آلود کر دیا تھا، آپ کی کتاب نے اس گرد کو ایک بار پھر صاف کر دیا، ادب کی طرف سے بھی میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا، چوں کہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آیا جس کی لَے میں شریف رضی کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے، جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا، یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو کہ حقیقۃً شاعری ہے؛ لیکن بے ردی اور قافیہ کی شاعری، برادرم ابوالحسن! آپ کا بصد ہزار شکر یہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا''۔ (کاروانِ مدینہ ۱۱)

(علی طنطاوی)

''اصحابِ فضل وکمال کی ایک جماعت کے سامنے میں نے ایک بار شہر لکھنؤ کا نام لیا؛ لیکن اسے کوئی پہچان نہ سکا، پھر جب میں نے کہا کہ یہ مولانا علی میاںؒ کا شہر ہے، تب اسے لوگوں نے پہچانا، کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس مقدمہ میں قارئین کے سامنے ایسے بلند پایہ شخص کا تعارف کراؤں جو اپنے شہر اور وطن سے زیادہ معروف ہے اور جس کے نام سے اس کا شہر جانا پہچانا جاتا ہے''۔ (مقدمات علی الطنطاوی ۱۰۶)

(علی طنطاوی)

''کسی محل کا معمار یا کسی لشکر کا کمانڈر جب عظیم لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے تو مولانا علی میاںؒ نے تو اپنے تلامذہ کے دل ودماغ میں پتھر کے قلعوں سے کہیں زیادہ پائیدار اسلامی قلعے تعمیر کئے ہیں اور صالح علماء اور مخلص داعیوں کی ایک امت تیار کر دی ہے''۔ (مقدماتِ علی الطنطاوی ۱۰۹)

(علی طنطاوی)

''یہ کوئی نئی اطلاع نہیں ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جامعہ اسلامیہ مدینہ کی مجلس شوریٰ کے جلسوں میں آتے رہے ہیں اور جب بھی انہیں اس رکنیت کے ناتے سے بیش از بیش وظائف اور رقمیں پیش کی گئیں انہوں نے کبھی قبول نہیں کیا، جامعہ کے مصارف پر کبھی کسی ہوٹل میں قیام تک نہیں کیا، میرے علم میں معاصر علماء اسلام میں ایسے زہد واستغناء کی کوئی نظیر نہیں ہے''۔ (علماء ومفکرون عرفتهم ۱۴۳/۱)

(شیخ محمد المجذوبؒ)

''قصص النبیین کے مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت اور قلم سے میں

واقف ہوں، میں نے ان کو دل دردمند اور دماغ ہوشمند کا حامل اور اسلام کے ساتھ اسلام ہی کے لئے اور اسلام کی پوری بصیرت کے ساتھ زندگی گذارنے والا مؤمن کامل پایا، یہ حق کی شہادت ہے جو میں ادا کر رہا ہوں''۔ (مقدمہ قصص النبیین)

(سید قطب شہید)

''مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تذکرہ ایک ایسے عظیم صاحب قلم مصنف ومفکر کا ذکر جمیل ہے جو موضوع کا علمی دقیق جائزہ، وسیع موازنہ، مناسب ترین حل، نہایت پختہ مؤثر ادبی اسلوب میں متقدمین کی بلاغت اور متأخرین کی سہولت کی جامعیت کے ساتھ پیش کرتا ہو''۔ (الاستاذ ابوالحسن علی الحسنی الندوی کاتباً ومفکراً ۱۶)

(استاذ احمد محمد طحان)

''مولانا علی میاںؒ اسلامی ہیں، اسلام ان کی رگ وپے میں پیوست ہے، ان کے تانے بانے اسلام سے بنے ہوئے ہیں، اسلام ہی ان کی ابتداء وانتہاء ہے، وہی محور ومرکز ہے، وہی منزل وساحل ہے، وہی اس کی سعی وعمل کی جولان گاہ اور پناہ گاہ ہے، محبت ونفرت کے سارے جذبے اسی کی خاطر ہیں، ساری دوڑ دھوپ اور کدوکاوش اسی کے لئے ہے، اسلام ان کے دل کی صدا اور اندر کی پکار ہے، ان کے دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز ہے، ان کا زادِ سفر وتوشۂ راہ ہے، ہم پیالہ وہم نوالہ ہے، ہمدم ودم ساز ہے؛ بلکہ سب کچھ وہی ہے اسی سے ہے، اس کے لئے ہے، اسی کے راستہ میں ہے''۔ (البعث الاسلامی، عدد خاص ذوالحجہ ۱۴۲۰ھ محرم وصفر ۱۴۲۱ھ ص:۲۶)

(یوسف قرضاوی)

''اللہ نے ان کو دلِ زندہ عطا کیا ہے، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعشق سے لبریز جذبات بخشے ہیں، ان کے پہلوؤں میں ایک چشمۂ جاری رواں ہے جس کو کبھی خشکی چھو کر نہیں گذرتی، ایک شعلۂ جوالہ ہے جو کبھی سرد نہیں پڑتا، ایک انگارہ ہے جو کبھی راکھ میں تبدیل نہیں ہوتا؛ بلکہ اس میں ہمیشہ روانی، جوانی، حرارت وجوش وخروش باقی رہتا ہے، گویا ایک بحر ناپید کنار ہے جو پورے زور وشور سے بہہ رہا ہے اور کوئی طاقت اس کے جوش وروانی پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو پاتی''۔ (البعث الاسلامی)

(یوسف قرضاوی)

''مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی موفق من اللہ ہیں''۔

(مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

''مولانا ابوالحسن علی مجموعۂ حسنات ہیں''۔

(شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

''مولانا آیۃ من آیات اللہ ہیں''۔

(علامہ یوسف بنوریؒ)

''مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی تحریروں کے ذریعہ نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری انسانیت کے مربی ومحسن بن گئے ہیں''۔

(ڈاکٹر عبدالمنعم احمد یونس عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ ازہر)

''آپ کا قلم شہد خالص کی طرح شفا کا کام دیتا ہے اور زخم کا مرہم ثابت ہوکر دین کی لگن پیدا کردیتا ہے''۔

(شیخ عبدالفتاح ابوغدہ مرحوم)

''کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مولانا اس وقت برصغیر پاک وہند میں نہیں؛ بلکہ پوری دنیائے اسلام میں کئی پہلوؤں سے اپنا ثانی نہیں رکھتے، وہ تحریر وانشاء اور علم وادب ہی کے میدان کے شہسوار نہیں، عمل وتقویٰ میں بھی سلف صالحین کا نمونہ ہیں''۔

(مولانا کوثر نیازی سابق وزیر مذہبی امور پاکستان)

''مولانا علی میاں کا خمیر محبت ونرمی سے عبارت ہے، علم وتقویٰ نے ان سے فروغ پایا ہے، اور جامعیت علوم کی مسند ان سے مزین ہے، مشرق ومغرب کے دینی تقاضوں اور جدید طبقہ کے نبض آشنا ہیں، ان کی تحریر دلوں کے اندر اتر جاتی ہے، اور بیک وقت دل ودماغ دونوں کی تسلی کا سامان مہیا کردیتی ہے''۔

(مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ سابق صدر شعبۂ عربی اسلامیہ کالج پشاور)

''میرے نزدیک اس کتاب ''ماذا خسر العالم'' کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اس وقت کسی بھی ناحیہ سے اسلام کی سربلندی کے لئے کوشاں ہے''۔

(ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، مصر)

''مولانا نے اس کتاب (تاریخ دعوت وعزیمت) میں تاریخ کے خاکستر میں دبے

ہوئے انگاروں کو کرید کرید کر نکالا ہے اور پھونک پھونک کر روشن کیا، اس طرح کہ زمین کے یہ ستارے اپنی چمک سے آسمان کے تاروں سے کہیں زیادہ منور نظر آتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر ایک بیتاب خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے کہ اے کاش! ماضی کے دور دراز سائے مستقبل کا آئینہ ہو جائیں''۔

(پروفیسر: وصی احمد صدیقی)

''مصنف (سیرتِ سید احمد شہیدؒ) نے مسلمانوں کے ہاتھوں رشد و ہدایت اور عزم و ہمت کا ایک صحیفہ دیا ہے، اس کام کے لئے اسی خانوادہ کے اس نوجوان کی توفیق بخشی گئی ہے جس کو علم و عمل اور فکر و ذوق کی دولت سے وافر حصہ ملا ہے، مصنف نے یہ کتاب بڑی دقت سے لکھی ہے، انہوں نے اس کتاب کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ یہ تاریخ داستان کے بجائے نوجوان مسلمانوں کے لئے علمی روح کا سامان بن گئی ہے''۔ (مقدمہ سیرت سید احمد شہید مختصراً)

(علامہ سید سلیمان ندویؒ)

''اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور توفیق سے وہ (مولانا علی میاںؒ) صاحب نظر و فکر بھی ہیں اور صاحب قلب بھی، وہ اپنے علم و معلومات کے لحاظ سے جدید بھی ہیں اور ایمان و یقین اور رسوخ فی الدین کے لحاظ قدیم بھی، ان کی ذات مدسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی''۔

(مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

''احقر کو اپنے تمام اکابر سے الحمد للہ ہمیشہ عقیدت رہی ہے اور ہے، اس وقت حضرت والا کی عقیدت اور عظمت جو اس ناکارہ کے دل میں ہے اس کو سب پر فوقیت اور اہمیت حاصل ہے، اور یہی زندگی کا سرمایہ ہے، اللہ پاک آخر وقت تک اس کو باقی رکھے''۔

(حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ)

''کاش کہ پاکستان کو اس نازک مرحلہ پر آنجناب جیسی کوئی شخصیت میسر آتی تو بہت سی مشکلات کا حل نکلتا، اور ہم جیسوں کو صحیح رہنمائی بھی میسر ہوتی''۔

(مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ پاکستان)

''مولانا اپنی زندگی کے اس مرحلہ سے جہاں شعور آگہی بڑھ کر کسی شخصیت سے بغل گیر ہوتی ہے، تلاش حق میں مضطرب و بے چین نظر آتے ہیں، ان کی مثال اس جرعہ نوش کی ہے جس نے ہر مے خانہ میں قدم رکھا اور ہر دکان معرفت پر دستک دی، حالاں کہ خاکم

بدہن۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان شخصیتوں میں سے بہت سوں کے مقابل علی میاں کا علم وفن بدرجہا فائق تھا''۔

(مولانا انظر شاہ کشمیریؒ)

''میں جب بیسوی صدی کی اسلامی فکر کی قوس قزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اُن کا فکر واسلوب ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے، ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز وگداز، مولانا مودودیؒ کی عقلیت اور تصویر دین کی جامعیت، علامہ شبلیؒ اور مولانا سلیمان ندویؒ کا ذوقِ تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے، علی میاں کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں ہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں، اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم وفن نے نظر انداز کر دیا ہے، مولانا علی میاں کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لئے اسلاف کے نمونے کا احیاء ہے، ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں، مولانا علی میاں انسان کے دل کے راستے فکر ونظر کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور روح کی تازگی فراہم کرتے ہیں''۔

(پروفیسر: خورشید احمد نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان ومدیر ''ترجمان القرآن'' لاہور)

''حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات پوری دنیائے انسانیت کے لئے ایک خسارۂ عظیم ہے، اس دور قحط الرجال میں کوئی بڑا آدمی اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا نعم البدل تو کیا اس جیسا آدمی بھی پیدا نہیں ہوتا، عالم اسلام کو اس وقت مولانا جیسے اصحابِ فکر وعمل کی ضرورت ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ان جیسے افراد پیدا ہوں اور میدانِ عمل میں آئیں؛ لیکن بظاہر حالات اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی کہ کوئی دوسرا فرد ان کی جگہ لے سکے اور خلا پر کر سکے:

دورہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
یا یزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن''

(حضرت مولانا محمد باقر حسین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ،
صدر و بانی دار العلوم السلامیہ بستی و مہتمم مدرسہ عربیہ امدادیہ مراد آباد یوپی)

نوٹ: مزید تأثرات مختلف جرائد اور مکاتیب سے اخذ شدہ ہیں، عربی عبارتوں کا ترجمہ مضمون نگار کے قلم سے ہے۔

چند گذارشات

حضرت مولانا علی میاںؒ جیسے اصحابِ فضل وکمال صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، جتنی جامعیت اور ہمہ جہتی اللہ نے انہیں عطا فرمائی تھی وہ بہت کم افراد کے حصہ میں آتی ہے، مولانا کی تصنیفات، افکار، طریقۂ کار، اسلوب اور انداز سے جس قدر استفادہ کیا جانا چاہئے تھا، میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہوسکا:

تو نظیری ز فلک آمدہ بوری چوں مسیح
باز پس رفتی وکس قدر تو نشناخت دریغ

چند گذارشات پیش ہیں، جن پر عمل مولانا سے استفادہ کو عام اور تام بنا سکتا ہے:

(۱) عام لائبریریوں میں مولانا کی تصنیفات وخطبات کا مستقل گوشہ (Chair) قائم کیا جائے؛ تاکہ بآسانی فائدہ اٹھایا جاسکے، ہندوپاک کی بعض لائبریریوں میں اس طرح کے گوشے بنائے گئے ہیں، ضرورت اس کام کو زیادہ وسیع اور منظّم کرنے کی ہے۔

(۲) مدراس اور جامعات میں مولانا کی اہم تصنیفات یا ان کے منتخب حصوں کو باضابطہ داخل درس کیا جائے؛ تاکہ نئی نسل اپنے مذہب سے پوری طرح واقف اور اپنی ذمہ داریوں سے مکمل آگاہ اور باشعور ہوجائے۔

(۳) نئی نسل کو خاص طور سے حضرت مولانا کی دعوت، فکر وعمل، اصلاحی کارناموں، عظیم خدمات، دینی حمیت وغیرت، اسلام کی تڑپ اور لگن اور زہد واستغناء سے واقف اور باخبر کیا جائے اور انہیں خطوط ونقوش کو حرزِ جاں بنانے کی تلقین کی جائے۔

(۴) قدیم صالح اور جدید نافع کے جس امتزاج کا مولانا حسین شاہکار تھے اور جس

کے لئے مولانا نے بے حد کوششیں کیں اس کی ضرورت ہر لمحہ بڑھتی جارہی ہے، اسے عام کیا جائے اور کوئی کسل مندی اور سست روی اس میں حائل نہ ہونے دی جائے۔

(۵) اصول ومقاصد میں تصلب اور ان پر توجہ تام اور اہتمام اور فروغ ووسائل میں توسع اور ماحول کی پورے اعتدال کے ساتھ رعایت کا پہلو بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہئے کہ یہی مولانا کا بہت بڑا امتیاز رہا ہے۔

(۶) مغربی تہذیب کے طوفانِ بد کا مقابلہ اسی اعتدال سے ہونا چاہئے جو مولانا کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور اس میں کسی قسم کے افراط وتفریط کو جگہ نہیں دی جانی چاہئے۔

ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہوکر ان کاموں میں انہماک ہی مولانا کو سب سے بڑا خراج عقیدت پیش کرنا ہے، مولانا کے بے شمار صدقات جاریہ، علوم ومعارف اور تلامذہ ومنتسبین کا وسیع ترین حلقہ ہمیشہ ان کے پیغام وفکر کا حامل وامین ثابت ہوتا رہے گا، خدائے بدیع وفیاض نے جو غیر معمولی صلاحیتیں ان کی تنہا شخصیت میں جمع کردی تھیں وہ اجتماعی طور پر سیکڑوں افراد میں بھی پائی نہیں جاتیں، اس لئے ان کا نام اور کام ہمیشہ انشاء اللہ زندہ رہے گا:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

❐❖❐

حرفِ آخر

حضرت مولانا علی میاںؒ پورے عالم اسلام میں متفق علیہ اور مرکزی شخصیت کے حامل تھے، ان کی وجہ سے امت کے افلاس کا احساس ختم ہوتا تھا، ان کا نفس وجود ہی نہ جانے کتنے فتنوں کے لئے آڑ بنا ہوا تھا، علمی رسوخ وصلابت، سوعت مطالعہ گہرائی وگیرائی، فکری اعتدال وتوازن، اجتماعی وملی بے لوث خدمات اور جرأت وبے باکی کے ساتھ باطل کا مقابلہ واستیصال کی کوشش وکاوش میں حضرت مولانا نادرۂ روزگار، فخر زمانہ اور قابل صد رشک تھے، وہ اپنی خصوصیات وصفات میں منفرد تھے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء (۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ) جمعہ کا دن عالم اسلام کے لئے بڑا المناک ثابت ہوا، جب اس صدی کا یہ قابل فخر انسان اس دنیا سے رخصت ہوا، اقبال نے مردِ مؤمن کی شناخت بتائی ہے:

نشان مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

حضرت مولانا علی میاںؒ کی موت بھی ایسی ہوئی کہ دنیا رشک کرتی رہ گئی، قرآنِ کریم کی سورۂ یٰس (جسے قلب القرآن کہا گیا ہے) کی تلاوت کرتے ہوئے وہ اپنے مالک کے حضور حاضر ہوئے، گویا:

من نیز حاضرمی شوم، تصویر جاناں در بغل

اور رمضان المبارک کی بابرکت رات میں آسودۂ خواب ہوئے:

شدیم خاک ولیکن ببوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مرد خیزد

مولانا نے بیسویں صدی کے آغاز میں جب اپنی آنکھیں کھولی تھیں، اس وقت خلافت عثمانیہ کا سقوط اور زوال اسلام دشمن طاقتوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور وقرار بنا ہوا تھا، اب ان کے انتقال کے حادثۂ فاجعہ کے بعد بھی عالمی پیمانہ پر اسلام دشمن طاقتیں ہر طرح سے اسلام کو کچلنے اور دبانے کے درپے ہیں اور اسی مقصد کے لئے آئے دن نئے نئے مسائل پیدا کر رہی ہیں اور مشکلات کھڑی کر رہی ہیں، ایسے میں مولانا کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے، مگر.....

یک حرف کا شکیست کہ صد جا نوشتہ ایم۔ دل سے حسرت بن کر یہ آواز نکلتی ہے:

هيهات لا يأتى الزمان بمثله
إن الزمان بمثله لبخيل

اصحابِ دعوت وعزیمت کی جب بھی فہرست تیار ہوگی، مولانا اس میں ہمیشہ نمایاں مقام پر نظر آئیں گے، دیگر ادباء علماء اور مفکرین کے برعکس مولانا کے گراں قدر افکار سے استفادہ کرنے والے بے شمار تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ ہے جو مولانا کے افکار کی ترویج واشاعت میں ہمہ تن منہمک ہے، تلامذہ و متعلقین کا یہ حلقہ اور خود مولانا کی بلند پایہ تالیفات ہمیشہ ان کے لئے صدقۂ جاریہ ثابت ہوتی رہیں گی، الن کا پیام فکر وعمل ہمیشہ حیات بخش، مشعل راہ اور منارۂ نور ثابت ہوتا رہے گا، ان کی زندگی کے عملی، دعوتی اور تربیتی تینوں گوشے ہمیشہ رہنمائی کا کام کرتے رہیں گے۔

مولانا جیسے اصحاب دعوت وعزیمت کے پیغامِ فکر وعمل کی ترجمانی اور عکاسی علامہ اقبالؒ کے اس قطعہ سے بڑھ کر کسی اور لفظ میں نہیں کی جاسکتی:

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے ❖ جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل ❖ یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا ❖ یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا ❖ جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے

مراجع ومصادر

اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	
(ترشيد الصحوة الاسلامية)		
الاسلام والحضارة الاسلامية	//	//
(مذہب وتمدن)		
اكبر خطر على العالم العربى	//	//
أضواء (بصائر)		
أريد أن أتحدث إلى الإخوان	//	//
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	//	//
(ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين)	//	//
واقع العالم الإسلامى	//	//
حديث مع العزب	//	//
العرب والاسلام	//	//
العرب يكتشفون أنفسهم	//	//
کاروانِ زندگی مکمل (فى مسيرة الحياة)	//	//
پرانے چراغ مکمل	//	//
مذكرات سائح فى الشرق العربى	//	//
(شرقِ اوسط کی ڈائری)	//	//

نحو بعث اسلامی جدید	//	//
الدعوة فی العصر الحاضر	//	//
سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ	//	//
حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ	//	//
حضرت مولانا محمد الیاسؒ اوران کی دینی دعوت	//	//
مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش (الصراع بین الفکرة.....)	//	//
نقوشِ اقبال (روائع اقبال)	//	//
کاروانِ مدینہ (الطریق الی المدینة)	//	//
قصص النبیین	//	//
مختارات من أدب العربی	//	//
تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک (ربانیة لا رهبانیة)	//	//
تاریخ دعوت وعزیمت (رجال الفکر والدعوة)	//	//
منهج أفضل فی الإصلاح للدعاة والعلماء	//	//
زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو	//	//
کارثة العالم العربی وأسبابها الحقیقیة	//	//
پاجا سراغ زندگی	//	//
دستورِ حیات (العقیدة والعبادة والسلوک)	//	//
سیرۃ سید احمد شہیدؒ	//	//
عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح	//	//

(التفسير السياسى للإسلام)		
دنیامیں آنے والے انسان چمن کے کانٹے ہیں یا پھول	//	//
ملک ومعاشرہ کا سب سے خطرناک مرض ظلم وسفا کی	//	//
دین وعلم کی خدمت اورایمانی تقاضے کی اہمیت	//	//
لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اوراس سے سبق	//	//
محمد الرسول الأعظم وصاحب المنة الكبرىٰ	//	//
كيف دخل العرب التاريخ	//	//
نفحات الإيمان	//	//
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک	//	//
(من نهر كابل إلى نهر اليرموك)		
النبوة والأنبياء فى ضوء القرآن	//	//
(منصب نبوت اوراس کے عالی مقام حاملین)		
حیات عبدالحیؒ	//	//
شخصیات وکتب اثرت فی حیاتی	//	//
پندرہویں صدی ہجری، ماضی وحال کے آئینہ میں	//	//
المعهد العالى للدعوة والفكر الإسلامى	//	//
(ضرورت، تخیل، نظام ونصاب)		
المأساة الأخيرة فى العالم العربى	//	//
(عالم عربی کا تازہ المیہ)		
القرأة الراشدة	//	//
الشيخ ابوالحسن الندوى وقضايا الأمة العربية	الاستاذ الدکتور عبدالحليم عويس	

الأدب الإسلامی فکرته ومنهاجه	(ادب اسلامی کی عالمی کانفرنس کی رپورٹ)
العلامة أبو الحسن الندوی	الاستاذ انور الجندی
فی مرآة کتاباته ومحاضراته	
أعلام القرن الرابع عشر الهجری	// //
الاستاذ ابوالحسن علی الحسنی الندوی	مولانا نذرالحفیظ ندوی ازہری
کاتباً ومفکراً	
میرکارواں	مولانا عبداللہ عباس ندوی
ذکریات	علی طنطاوی
مقدمات الشیخ علی الطنطاوی	مرتبہ مجد مکی
جهود الشیخ ابی الحسن الندوی	سید ریاض عاشور
فی مجال الدعوة الاسلامیة	
فقه الدعوة ملامح وآفاق (کتاب الامة)	// //
علماء ومفکرون عرفتهم	الاستاذ محمد المجذوبؒ
تاریخ ندوۃ العلماء دوم	ڈاکٹر شمس تبریز خاں
جہانِ دیدہ	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی
رودادِ چمن	مولانا محمد الحسنی مرحوم
مولانا علی میاںؒ اور علم حدیث	مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی
مکاتیب مولانا محمد الیاسؒ	
نحو مذهب إسلامی فی الأدب والنقد	ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا
وصایا أساطین الدین والأدب	مرتب: شیخ عبداللہ المزروع
والسیاسة للشبان	

دعوت وعزیمت کے روشن ستارے	آباد شاہ پوری
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	مولانا ممشاد علی قاسمی
اکابر ومشاہیر امت کی نظر میں	
معاصرین	مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ
ہندوستان میں عربی علوم وفنون کے ممتاز علماء	ڈاکٹر محمد یونس نگرامی
اوران کی علمی خدمات	
مشاہیر کے خطوط بنام حضرت العلامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ	مرتبہ: محمد یٰسین کوپرگانوی
رسائل الأعلام بين الشيخ الندوى ودعاة الإسلام	مولانا محمد رابع حسنی ندوی
مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں	مولانا محمد عمران خاں ندویؒ
تحفۂ انسانیت	مولانا اسحٰق جلیس ندوی

مجلّات وجرائد

۱	البعث الإسلامی	لکھنؤ	مدیر	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
۲	الصحوۃ الاسلامیۃ	حیدرآباد	//	مولانا محمد نعمان الدین ندوی
۳	الرائد	لکھنؤ	//	مولانا واضح رشید ندوی
۴	الداعی	دیوبند	//	مولانا نور عالم خلیل الامینی
۵	المجتمع	کویت		
۶	کاروانِ ادب	لکھنؤ	//	مولانا محمد رابع حسنی ندوی
۷	ندائے ملت	//	//	ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی
۸	تعمیر ملت	//	//	مولانا شمس الحق ندوی
۹	الفرقان	//	//	مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی

۱۰	نیادور	//	//	شاہ نواز قریشی
۱۱	بانگ دار	//	//	امین الدین شجاع الدین
۱۲	راشٹریہ سہارا اردو	//	//	عظیم خاں
۱۳	ترجمان الاسلام	بنارس	//	اسیر ادروی
۱۴	فکر اسلامی	بستی	//	مولانا محمد اسعد قاسمی
۱۵	معارف	اعظم گڈھ	//	مولانا ضیاء الدین اصلاحی
۱۶	الرشاد	//	//	مولانا مجیب اللہ ندوی
۱۷	تذکیر	غازی پور	//	مولانا عزیز الحسن صدیقی
۱۸	افکارِ ملی	دہلی	//	ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس
۱۹	بحث ونظر	//	//	مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
۲۰	ملی اتحاد	//	//	مولانا اسرار الحق قاسمی
۲۱	نئی دنیا	//	//	شاہد صدیقی
۲۲	سہ روزہ دعوت	//	//	پرواز رحمانی
۲۳	صفا	حیدر آباد	//	مولانا محمد رضوان القاسمی
۲۴	البلاغ	کراچی	//	مولانا محمد تقی عثمانی
۲۵	الفاروق	//	//	مولانا محمد عادل خاں
۲۶	ترجمان القرآن	لاہور	//	پروفیسر خورشید احمد